شاداب

Price Rs. 5-00

ماہنامہ حیدرآباد جلد [۱۱] شمارہ [۱]

شاداب

جنوری ۱۹۹۴ء

قیمت: 6/= روپے

زرِ تعاون

ہندوستان سالانہ:	65 روپے	2 سال 120 روپے ـ	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک "	200 "	" 360 "	" 3700 "
امریکہ "	40 ڈالر	" 70 ڈالر	" 700 ڈالر
انگلستان "	25 پاؤنڈ	" 45 پاؤنڈ	" 400 پاؤنڈ
پاکستان "	175 پاکستانی روپے،	300/ پاکستانی روپے	" 3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 11-5-147، ریڈہلز ـ حیدرآباد۔

• ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سید قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 11-5-147، ریڈ ہلز، حیدرآباد ۴ سے شائع کیا۔

فہرست

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
ریڈر اردو، جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد۔

خانقاہ، ایک روحانی تربیت گاہ

اسلام میں علم کے ساتھ عمل کی بڑی اہمیت ہے۔ دین میں قرآن و سنت دونوں حجت ہیں دونوں قطعی اور یقینی بھی، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو علم اور دوسرے کو عمل کی صورت میں چھوڑا ہے۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین نے ان دونوں کی حفاظت اور نشر و اشاعت کو اپنا فریضۂ عین سمجھا۔ سنت نبوی کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اس کا تاریخی نام حدیث ہے اس ضمن میں محدثین حضرات کی اہمیت و مرتبت مسلّمہ ہے۔ حامل قرآن ہو یا سنت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے۔ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اعجاز بھی رکھتا ہے اور سنت الہام وحی خفی ہونے کی وصف سے متصف ہے تاہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے قرآن کا اہتمام فرمایا برخلاف اس کے سنت چونکہ معجزہ نہ تھی اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطالب آپ پر نازل ہوتے تھے۔ لہٰذا اس کو آپ اپنے لفظوں میں ادا فرماتے تھے اور یہ الفاظ بھی حسب ضرورت و موقع مختلف ہوتے تھے۔ کیونکہ آپ کو مختلف طبائع اور مختلف سطح و مکتبِ خیال کے

معلومات

لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے اس کے الفاظ کی تلاوت کا حکم نہیں
گویا قرآن کو اگر نام سے تعبیر کریں تو یہ اپنے الفاظ و معانی کے اعتبار سے
معجزہ ہے اور سنت معجزہ نہیں قرآن کے الفاظ میں ایک حرف بلکہ اس کا ایک
نقطہ کا بھی تغیر و تبدل جائز نہیں اور نہ ایسا ممکن ہے اور سنت کو چاہیں کہیں
تو یہ روایت بالمعنی ہے یعنی اصل مقصود رسول تعالیٰ کا ہے اور الفاظ
جامہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ہے اس لیے اس نوعیت یا تمہید کی چنداں
ضرورت نہ تھی۔ مگر معاملہ شریعت میں تصوف کے باہمی ربط و تعلق کا ہے شریعت
کی حفاظت اس کی ترویج کی خاطر خواہ ہوا اور یہ سب خانقاہی نظام اور روحانی
تربیت گاہ سے متعلق ہے اس لیے یہ وضاحت ضروری خیال کی گئی کہ خود
نبی آخر الزماں نے اس گروہ جماعت کی تعریف کی ہے جو دین اور اس کے
مسائل کے بارے میں غور و خوض کرتے ہیں۔ افہام و تفہیم کی ابتدا دین اسلام
کے آغاز ہی سے ہوئی۔ داعیٔ اسلام مخبرِ صادق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
غزوۂ بدر کے بعد بعض اصحاب کو اس امر پر پابند کیا تھا کہ وہ دیگر صحابہ
کو تعلیم دیں اور پھر اصحابِ صفہ کے بارے میں کئی ایک روایتیں ملتی ہیں تعلیم
و تعلم کا اہتمام دورِ نبوت اور اس کے بعد شیخین رضوان اللہ تعالیٰ عنہما
زمانہ میں بھی رہا۔ حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حفاظتِ قرآن و حدیث
خاطر سرکاری خزانے سے معلمین کی تنخواہیں اور متعلمین کے وظائف مقرر
نیز شام کے مسلمانوں کے لئے ایک تعلیمی مشن روانہ کیا جن میں حضرت ابوالدرداءؓ
حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عبادہ بن الصامتؓ وغیرہم شامل
حافظ ذہبی نے طبقات القراء میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ کا وش

میں حضور نبی کریم ؐ کی وفات کے بعد جب عجمی قوموں کا [illegible] دیئے تھے
کنز العمال میں درج ہے کہ حضرت عمرؓ کے استفسار پر حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا
کہ ان کی تعداد تین (۳۰۰) سو ہے زمانہ حفاظ [illegible]
خلفائے راشدینؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے عہد میں درس و تدریس کا سلسلہ
جاری رہا ائمہ کرام نے قرآن اور حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ اور اجتہاد کی طرف بھی ان کی
جانب سے بھی توجہ کی ان تمام باتوں کا دار و مدار علم اور [illegible] اہل
حضرات مجلس کا دائرہ اختیار حلقۂ درس میں ہر طبقہ ہر مزاج و مذاق کے لوگ ہوتے
ان کی اصلاح ظاہری و باطنی کی ذمہ داری انہی حضرات کے تفویض تھی یہاں تک وہ
شریعت اور طریقت کی تعلیم سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

قرآن مجید اور سنت نبویہ (حدیث) کی تعلیم کا چرچا جب عرب
سے نکل کر عجم پہنچا تو وہاں اسلامی نظام حیات کی تشریح و تفہیم کی ضرورت
محسوس کی گئی اور پھر ائمہ ثلاثہ اسلامی شعار طریقہ سے عوام الناس کے بے شعور طبقوں
کو متاثر کرتے رہے اسلام اور اس کی تعلیمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا
گیا نیز تعلیم کا منصب [illegible]
[illegible] اہل اللہ [illegible]
[illegible] کی تربیت [illegible]
کے ذریعہ زہد و تقویٰ تسبیح و تہلیل اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

رواج نہ تھا۔ مگر درس و تدریس کے لئے مدرسہ کے ساتھ ساتھ تکیہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلم درویش ابتداء میں خانقاہ اور مساجد میں دائروں کی شکل میں بیٹھ کر اساتذہ سے استفادہ کرتے تھے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اصحاب کرام رسول اکرمؐ کو اس طرح گھیرے رہتے۔ جیسے چاند کے اطراف ستاروں کا جھرمٹ رفتہ رفتہ یہ دائروں والی بات یا اصطلاح حلقہ سے بدل اور جب پہلی پہلی بار لفظ حلقہ کی جگہ زاویہ نے لی اور جب عراق اور شام کے حضرات نے دائرہ کو اپنے لئے مختص کر دیا۔ تو مصر کے حلقوں نے زاویہ کو اپنا لیا۔ اور پھر برسوں بعد شاید تاتاریوں کے عہد حکومت میں تکیہ نے اس اصطلاح کو رواج دیا۔ ہر خانقاہوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خانگاہ سے معرب ہے کتاب "اقرب الموارد" کے بموجب خان کا معنی باب، در، یا سرا کے ہیں۔ اور گاہ کے معنی اقامت۔ جہاں مسلمان اکٹھے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ اب اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ دونوں لفظ مرکب کب استعمال کئے گئے تو قرین قیاس ہے کہ اس لفظ کو اولاً تاتاریوں نے ہی استعمال کیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں تاتاریوں کا داخلہ بڑا تاریخی ہے۔ قبول اسلام کے واقعات سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے افراد کا قبول اسلام خاندانوں قبیلوں اور شہروں کا قبول اسلام لیکن قوموں کے من حیث القوم قبول اسلام کی مثالوں تاریخی اعتبار سے تین چار سے زیادہ نہیں۔ عرب بالخصوص افغانوں نے اور پھر ترکوں کے بعد تاتاریوں نے قومی سطح پر اسلام قبول کیا۔ مگر حیرت تو اس پر ہے کہ تاریخ میں ہمیں ان لوگوں کے علم و دانش کا بھی پتہ نہیں ملتا جن حضرات کے سر جاتا ہے۔ تاتاریوں کے قبول اسلام

ے

شاداب

کا سہرا ہے۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے حصار سے نکلے تھے۔ جس کی تفصیل سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اس کی آڑ میں انہوں نے ترکستان ایران اور عراق کا تختہ الٹ دیا اور ان ملکوں کی حکومت تہذیب و تمدن کا چراغ گل کر دیا۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ اس وحشی قوم کو اللہ کے نیک و برگزیدہ بندوں نے اپنی روحانی طاقت کردار اور خدا پر اعتماد ایمان و عقیدہ کی بناء پر اسلام کا پیرو و مطیع بنا دیا۔ البدایہ والنہایہ کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بغداد میں ایک درویش صفت وزیر امیر توزون کا نام ملتا ہے جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کا بادشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ صوفی منش عابد و زاہد تھے وہ موقع بے موقع بادشاہ وقت کے کان میں اسلام کی بات ڈالتے رہے حتیٰ کہ اچانک ایسا کہ اہل بغداد نے دیکھا کہ سلطان غازان اور اس کے رفقا ہاتھوں میں تسبیحیں لیے مسجد کو جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے جسے پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں نقل کیا ہے اس تبلیغی واقعہ کا اجمال یہ ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین کی سچی توجہ و خاصیت خلوص سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ جو بلادِ متوسط جس کا مرکز کاشغر تھا اسلام پھیلا اور پوری قوم مسلمان ہوئی ہوا یوں کہ تاتاریوں کی نظر میں ایرانی بے وقعت اور نحس سمجھے جاتے تھے کسی موقع پر شہزادہ تغلق تیمور شکار کے ارادے سے نکلا کہ حضرت شیخ جمال الدین" کا وہاں گذر ہوا چونکہ حضرت بھی ایرانی تھے اس لئے شہزادہ کو ان کا یوں سامنے آنا نحس اور برا معلوم ہوا تو برہم ہو کر

کے عادی تاتاری شہزادہ نے شیخ کو گرفتار کر لیا اور نہایت درشت لہجہ میں سرزنش کی اور اسی تمکنت و غصے کے عالم میں اس نے شیخ سے سوال کیا بتاؤ تم اچھے ہو یا میرا یہ کتا۔ حضرت شیخ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ شہزادہ نے کہا کہ کیا مطلب ...؟ یہ کونسی مشکل بات ہے آپ نے جواب دیا۔ اس کا انحصار کسی اور چیز پر ہے اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہو جاتا ہے تو میں اچھا ہوں ورنہ یہ کتا اچھا ہے تغلق تیمور کے پتھر دل پر چوٹ لگی شاید اس کے لئے یہ وقت سعید تھا ہدایت کی گھڑی تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں اس دنیا سے کلمۂ حق پڑھتا ہوا رخصت ہو جاؤں۔ تو یقیناً اشرف المخلوقات اور افضل ہوں ورنہ یہ کتا مجھ سے ہزار درجہ بہتر رہے گا۔ تغلق تیمور نے کہا ٹھیک ہے میں اس وقت شہزادہ اور ولی عہد ہوں میری تاج پوشی کے بعد مجھ سے ملنا۔ شومئ قسمت حضرت شیخ کی عمر نے وفا نہ کی آپ اس کے بادشاہ بنائے جانے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہوئے مگر مرض الموت میں انہوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدینؒ کو وصیت کی کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی کے بعد اس سے ملیں اور بعد سلام کے کہیں کسی وقت آپ نے میرے والد سے دریافت کیا تھا تم اچھے ہو یا میرا کتا اچھا ہے اب اس کا فیصلہ ہو گیا الحمدللہ شیخ محترم ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے چنانچہ شیخ جمال الدینؒ کی رحلت کے بعد شیخ رشید الدینؒ بادشاہ تک بڑی دقت پہنچے اور اپنے والد کا پیغام سنایا۔ بادشاہ تغلق تیمور نے جب سنا تو اپنے وزیر کو بلوایا اور کہا ایک عرصہ سے میرے سینے میں ایک ولولہ اٹھا ہے اس کا اثر کسی وقت بھی زائل نہیں ہوا لہٰذا اب میں نے فیصلہ [illegible]

میں مسلمان ہو جاؤں تمہاری کیا رائے ہے وزیر نے کہا حضور والا میں تو جب
دلوں سے مسلمان ہوں اپنا اسلام کو چھپاتا رہا غرض بادشاہ کا منشاء اسلام
ہونے پر سب کے سب مسلمان ہوگئے اس واقعہ کو گوش گذار کرنے کا ایک مقصد
یہ ہے کہ انہی تاتاریوں نے اسلامی شعار و سلیقہ سیکھنے قرآن و حدیث کے
حصول کے لئے مساجد سے متصل خانقاہیں بنوائیں جہاں وہ سیکھیں یہ بات
سمجھ میں آتی ہے کہ ان بیچارے تاتاریوں کے پاس نہ علم و ادب تھا نہ کوئی
تہذیب نہ آسمانی کتاب جس کو حق تسلیم کرے اسی طرح مشاورت کا آغاز
بھی انہوں نے مسلمانوں ہی سے لیا۔ غرض اسلام میں خانقاہ سے مراد
وہ مقام یا جگہ جہاں اللہ اور اللہ کے حبیب سے ربط و نسبت کو استوار
کیا جاتا ہے یا خانقاہی نظام تعلیم کے معنیٰ یہ ہونگے کہ جہاں اہل اللہ قرآن
اور سنت کی تعلیم کو اپنا مطمح نظر رکھتے ہوں ان حضرات قدس کے سامنے
ارشاد ربانی ہوتا ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا
(یعنی جو لوگ ہماری راہ میں محنت اٹھاتے ہیں اور جد و جہد کرتے ہیں۔ ان کو
ہم ضرور اپنا راستہ دکھاتے) ہیں بلکہ اسی طرح ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی شفقت و
مہربانی بھی ان کے پیش نظر رہتی ہے وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَهْدِ قَلْبَهٗ (یعنی
شخص اللہ پر ایمان لے آئے وہ (اللہ) اس کے دل کو راہ راست دکھاتا ہے
خانقاہ کو ہم روحانی تربیت گاہ اس لئے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی جگہ
پر وہ تمام حجابات دور ہوتے ہیں۔ جو انسانی قلب و ذہن میں حائل ہوتے
ہیں۔ خدا کی راہ طلب میں یوں تو کتنی ایک حجابات اور منزلیں ہیں لیکن
جن منازل کی [illegible] کسی کے بس کا کام نہیں انہی حجابات [illegible] کو تصوف

ثنا دات

میں دو حصوں یا دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور بطور اصطلاح ان میں سے ایک کو رَین اور دوسرے کو غین کہا جاتا ہے صوفیا کرام کا کہنا ہے کہ رین حجاب ایک مستقل رکاوٹ ہے یہ کبھی نہیں ہٹے گی یا یہ حجاب کبھی دور نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے لاحق ہوجانے کے بعد آدمی کے دل پر مہر ہوجاتی ہے اور اس پر ٹھپہ لگ جاتا ہے رین (زنگ چڑھ جانا) ختم (مہر لگ جانا) اور طبع (ٹھپہ لگ جانا) سے مراد ہے قرآن مجید میں ان تینوں لفظوں کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ارشاد حق تعالیٰ ہے اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝ (یعنی جب اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں۔ تو وہ کہتا ہے چھوڑ دو وہی پرانے قصے کہانیاں ہیں۔ ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی بدکرداریاں زنگ بن کر ان کے دلوں پر جم گئی ہیں)۔۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (یعنی جن لوگوں نے ان بنیادی حقوق کو ماننے سے انکار کردیا تو ان کے لئے یکساں ہے کہ نہیں ڈراؤ وہ ماننے والے نہیں ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر کردی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے ان کے لئے (تو اب) عذاب عظیم ہی ہے) اسی بات کو تیسری جگہ یوں فرمایا۔ فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِّیْثَاقَھُمْ وَکُفْرِھِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَقَتْلِھِمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِھِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ (یعنی ان کی عہد شکنی کی وجہ

سے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا (حق کھول کر سامنے آجانے پر اسے قبول کرنے کی بجائے الٹا) یہ کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں بلکہ ان کی باطل پرستی کے سبب اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اس لئے ان میں سے شاذونادر ہی ایمان لاتا ہے) رینی حجاب سے متعلق حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے اور اگر وہ اس گناہ سے باز نہ آئے تو یہ سیاہی بڑھتے بڑھتے سارے قلب کو تاریک کر دیتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اور بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ کے الفاظ بیان فرمائے ہیں۔ ایسے قلوب کے لئے بھی توبہ ناگزیر و لازمی ہے البتہ رینی حجاب کے برعکس غینی حجاب ایک عارضی ہنگامی وقتی رکاوٹ ہے یہ ایسا پردہ ہے جو خلوص محنت اور مجاہدے سے دور کیا جا سکتا ہے بالفاظ دیگر یہ ایک ایسا آئینہ ہے جو زنگ آلود ہو گیا ہے اس کو صیقل کی ضرورت ہے اور شاید یہ انہی لوگوں کے لئے بشارت خداوندی ہے کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یعنی جو لوگ ہماری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف و رنج کا موقع نہیں ہوگا) بہرحال حضور اکرمؐ کی اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے اس کے حبیب کی امت میں ایک گروہ یا ایسی جماعت رہی جو عامتہ الناس کو حق اور ایمان ، اصلاح و ہدایت سے بہرہ ور کرتی رہی۔ اس طبقہ نے حضور اکرمؐ کے بتلائے

ہوئے طریق و منہاج کے حصول کے لئے خود کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ حضورؐ نے اس امر کی خوشخبری دی کہ میری امت میں سے ایک گروہ حق اور بھلائی نیکی و سچائی کی راہ پر قائم رہیگا۔ یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے چنانچہ بندگانِ دین صاحبِ نظر، اہلِ دل حضرات نے طلبِ صادق، اخلاص اور اشتیاق سے بڑھنے والے ہر اہل شخص کے لئے کچھ ایسے امور وضع کئے جس کی مشق و مزاولت سے ان کے نفوس میں پاکیزگی طہارت اور ایمانی فراست کا آ ہی جانا یقینی تھا۔ شاید اسی نظامِ تعلیم کو خانقاہی تعلیم کہا گیا جہاں وہ تربیت گاہ ہوئی جہاں علمِ صحیح اور عملِ صالح کی بنیادوں قربِ خداوندی اور محبتِ رسولِ انامؐ کا درس دیا جاتا ہے تاکہ انسانی قلوب دنیاوی غل و غش سے پاک بغض کینہ، کدورت، حسد، جھوٹی شان و شوکت اور ایسی ہی لاتعداد برائیوں سے پاک ہو للّٰہیت اور مخلوقِ خدا کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو اور اس کے نتیجہ میں حق تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا محبتِ رسول اللہؐ کے احسانات سے اس کی روح اعلیٰ علیین پہنچ جائے۔ ہندوستان میں ان تربیت گاہوں کی شروعات خواجہ اعظم ہند الولی حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے قدوم میمنت سے شروع ہوئی آپ اور آپ کے پاک طینت خلفاء، شاگردوں و مریدوں نے اپنے اپنے گوشوں میں بیشتر کمن سعید روحوں کو روحانیت و انسانیت کا درس دیا۔ مساوات، اجتماعی عدل (Social Justic) کا سبق پڑھایا یہی نہیں بلکہ حکومت و امارت سے بالاتر رہ کر دینی اور اخلاقی زندگیوں کی نگرانی کی حکومت اور معاشرہ کی صلاح قوی اور امانت داری کی جانب راغب کیا تاکہ اخلاقی

اور للّٰہیت پیدا ہو۔ اس انداز کی تحریک چلائی کہ جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ کا مصداق ہو، ورنہ اس تعلیم سے دُور انسانی نفوس کا جو عالم تھا اس کے بارے میں یہاں صاحب کشفُ المحجوب کے الفاظ کی نقل کئے جاتے ہیں۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اور خصوصاً ہمارے ملک میں علم کی کسی کو پرواہ نہیں تمام مخلوقات نفسانی خواہشات میں مبتلا اور خداوند تعالیٰ کی رضا و خوشنودی سے روگرداں ہیں زمانے کے علماء اور وقت کے مدعی ٹھیک راہ راست کے خلاف چل رہے ہیں۔ اس زمانہ میں لوگوں نے اپنی خواہشاتِ نفس کا نام شریعت رکھ لیا ہے حُبِّ جاہ کا نام عزت تکبّر کا نام علم دکھاوے کی عبادت کا نام تقویٰ، کینہ کو ظاہر کرنے کے بجائے اس کو دل میں پوشیدہ رکھنے کا نام حلمؔ مجادلہ و مناظرہ اور نہایت کمینگی کے ساتھ مجادلہ کرنے کا نام عظمت نفاق کا نام زہد جو منہ میں آئے اسے بک دینے کو معرفت نفسانیت کا نام محبت الحاد کا نام مسئلہ وجود (انکارِ حق) کا نام صفوتِ زندیقی ہوجانے کو فنا اور جناب رسول کریمؐ کی شریعت کو ترک کر دینے کا نام طریقت رکھ لیا ہے یہاں تک کہ اربابِ معانی (اصل اہل حق) ان جہلا سے اسی طرح مغلوب ہو گئے ہیں۔ جس طرح خلافت

راشدہ کے سقوط کے بعد بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر آلِ مروان نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

اِن ارشادات کی روشنی میں خانقاہ میں جس علم و عمل کی تعلیم دی جاتی ہے اس پر غور کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے خود شناسی کا مرحلہ ہے اور یہ ضروری دینی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ عاجزی، فروتنی پر محمول ہوگا خانقاہ انسانی قلب و ذہن اور روح کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک کیفیت محسوس کرے۔ اِس حقیقت کی روشناسی یعنی بندہ کو مولا کا قرب اس کی معیت کا کشف ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر شر نفس سے اس قدر واقفیت کرائی جائے کہ بندے کو حق کی معرفت میں لطف اور انبساط حاصل ہو اور یہ کیفیت بصورتِ فریاد و استغاثہ دوامی ہو جائے اس منزل پر عشق اور اس کے بندے جانے جاتے ہیں تاکہ عاشق کے لئے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے معنی واضح ہو جائیں اسے اپنی شناخت میں حق تعالیٰ کی شناخت ہو اور اس کے آگے رَبِّیْ رَبِّیْ گویا رَبّ نے رَبّ کو پہچانا والی بات ظاہر ہو جائے خانقاہی نظامِ تعلیم کا طور طریقہ اور اس میں کئی منازل آئیں گی کئی دشواریوں سے ہوتا ہوا سالک راہِ حق اپنی اپنی مُراد پائیں۔ لیکن عرصہ پہلے ہی یہ خانقاہیں اپنی چند کوتاہیوں یا پھر بندے کے اصولوں اور پھر ان کے معتقدین کی اندھی پیروی سے تقدس سے دور ہو گئیں اور پھر آج کے اس موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں اس طرز فکر اور ربوبیت عمل کا شعور کس قدر راز کار رفتہ دکھائی دیتا ہے کیا اب بھی ایسی کوئی خانقاہ ملیگی جو انسانی قلوب کو مادیت سے ہٹا دے اور کیا آج بھی حضرت داتا گنج بخشؒ کے ارشادات

سچ ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔ اور کیا ہمارے درمیان اِن میں اصلاح اور پاکیزگی پیدا کرنے والے اہلِ نظر صاحب دِل موجود ہیں۔ اب نہ مجاہدے ہیں اور نہ ضبطِ نفس کی تعلیمات نہ ریاضتیں ہیں نہ ذوق و شوق۔ اب نہ لطافتِ روح اور قربِ خدا اور محبتِ رسولؐ کا چلن دکھائی دیتا ہے قرآن اور حدیث یا سنّت کی پابندی کہاں کہ فائز المرامی حاصل ہو نہ مکاشفے ہیں۔ اور نہ مراقبے نہ اوارد ہیں اور نہ وظائف نہ چلّہ کشی میں تواتر ہے اور نہ روحانی اقدار کی جلا غرض نہ تعرفات ہیں۔ نہ کرامتیں اب تو خانقاہ' محض ایک ایسی اصطلاح ہو گئی ہے جہاں عہدِ رفتہ کے قصّوں اور کہانیوں میں بزرگی و عبادات اور واقعات کا اعادہ بطور تبرک و عقیدت کیا جاتا ہے مگر یہیں اس میں ہمارے معاشرہ اور نوجوان نسل کی تعلیم کا معاملہ بھی ہے بقول اقبال

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ہوا یہ کہ آج کی نسل پر کہیں رسل Russell حکمراں تو کہیں ڈراون Darwin. کا جادو کام کر رہا ہے کوئی فرائڈ Freud کا شیدائی ہے کوئی یونگ Jung یا اڈلر Adler کا ثنا خواں کسی پر ہیگل Hegel چھایا ہوا ہے تو کوئی مارکس Marx کا دیوانہ اور نہیں ہے کسی بات پر آمادہ تو وہ خدا اور آخرت وحی و رسالت پر۔ ایمان و یقین سے کوسوں دور اب تلقین ہو ہدایت کی جائے تو کیسے شعائرِ دین کی اشاعت اس کے نفاذ کے لیے ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہو گا کہ قوم کے جوہر قابل کو متاثر کیا جائے اِن کے قلب و ذہن کو نورِ ایمان سے منوّر کریں۔

شاداب

سید محمد عبدالستار
بحرکت شاہد سفروعی ریٹائرڈ

ادائی متروکہ میں لڑکیوں سے ناانصافیاں

موجودہ رسم و رواج اور چند واقعات

روزنامہ "سیاست" میں طلاق، مہر، نفقہ، خواتین سے دیگر مسائل جیسے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی موضوعات پر اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن متروکہ جائیداد میں لڑکیوں کے شرعی حصہ کی ادائی میں جو ناانصافیاں اور حق تلفیاں روا رکھی جا رہی ہیں۔ اس پر شائع [illegible] اظہار خیال کیا ہے میں اپنے اس مضمون میں اس موضوع پر [illegible] کوشش کی ہے کہ اِن ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے کیا وجوہ اور اسباب ہیں اور اس تعلق سے صحیح اسلامی قانون کیا ہے۔

ہندوستان کے اکثر مسلم خاندانوں نے غیر مسلم افراد سے باہمی میل ملاپ اور اثر و نفوذ کے تحت اِن کے رسم و رواج کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ اسلامی تمدن اور معاشرت کے اکثر اِن معاملات اور اِن کی شکل ہی بالکل بدل کر رکھ دی ہے۔ اِن میں سے ایک اہم مسئلہ لڑکیوں کا اپنے ماں باپ کے متروکہ جائیداد میں شرعی حق و حصہ پانے سے محرومی کا ہے جس کو قرآن کریم نے مقرر اور عطا کیا ہے میں اِن ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے وجوہ جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ عوام کے معلومات کے لئے درج ذیل کر رہا ہوں۔

(۱) ہندوستان کے اکثر مسلم خاندانوں بالخصوص جنوبی ہند اور دکن کے بہت سے گھرانوں میں لڑکیوں کو رواجاً ماں باپ کے متروکہ میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔

(۲) بعض مسلم خاندانوں میں یہ رواج ہے کہ شادی شدہ لڑکیوں کو ماں باپ کی زندگی میں ایک بھینس یا گائے کا دے دینا اور سال میں لڑکیوں کو ایک دو ہفتہ میکہ میں مہمان رکھ کر ایک جوڑا کپڑے بنا کر شوہر کے گھر واپس کر دینا ہی متروکہ قرار دیا جاتا ہے اور بوقت تقسیم متروکہ ایسی لڑکیوں کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔

(۳) بعض گھرانوں میں باپ، باوجود کافی مالدار اور صاحب جائیداد ہونے کے شادی شدہ لڑکیوں کو اپنی زندگی ہی میں دو چار ایکڑ اراضی یا کوئی ایک مکان کا دے دینا ہی فرض سمجھا جاتا ہے اور باپ کے انتقال پر ایسی لڑکیوں کو بوقت تقسیم متروکہ محروم رکھا جاتا ہے کہ ان کا حصہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔

(۴) بعض صاحب ثروت خاندانوں میں تحدید اراضی یا قانون انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے باپ اپنے بیٹوں کے نام رجسٹری شدہ دستاویزات یا کسی اور طریقہ پر جائیداد کی تقسیم فرضی طور پر کر دیتا ہے۔ بیٹے باپ کے انتقال پر ان دستاویزات کے اساس پر اپنے نام فرضی طور پر منتقل شدہ جائیداد پر اپنے حق کا ادعا کرتے ہوئے لڑکیوں کو ایسی جائیداد میں حصہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح لڑکیاں اپنے باپ کے متروکہ میں شرعی حصہ پانے سے محروم ہو جاتی ہیں۔

(۵) بعض مسلم خاندانوں میں باپ اپنے فاضل سرمایہ کو مشغول لڑکے کا کاروبار شروع کراتا ہے، انکم ٹیکس اور دیگر [illegible] کے پیش نظر لڑکیوں کو شامل کر کے [illegible] کی صورت میں [illegible] کر دیتا ہے۔ لڑکے باپ کے انتقال پر لڑکیوں کو [illegible]

کاروبار میں حصہ دینے سے اس لئے انکار کرتے ہیں کہ لڑکیوں کو شراکتی کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ ایسے کاروبار میں پورا سرمایہ باپ ہی کا ہوتا ہے حتیٰ کہ باپ کا حصہ شراکت میں بھی لڑکیوں کا حصہ دینے سے انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے لڑکیاں اپنے باپ کے متروکہ میں حصہ پانے سے محروم ہو جاتی ہیں۔"

(۶) بعض خاندانوں میں باپ کے انتقال پر ماں کی موجودگی بھی لڑکیوں کے باپ کے متروکہ میں شرعی حصہ پانے سے محرومی کا باعث بنتی ہے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ماں، باپ کے انتقال کے بعد بھی خاندانی روایات یا وضعداری کے پیش نظر باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد جو متروکہ بنتی ہے اس کو اولادوں کی توں حالت میں برقرار رکھنے پر مصر ہوتی ہے اور متروکہ کو خاندانی وقار کا مسئلہ بنا کر تقسیم سے روک دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک جائیداد تقسیم نہیں کی جاتی۔ جب ماں کے انتقال پر تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بعض قانونی دقتوں جیسے قبضہ مخالفانہ وغیرہ کے عدالت پر لڑکیاں اپنے شرعی حصہ پانے سے محروم ہو جاتی ہیں۔

(۷) ۔ بعض خاندانوں کے مرد افراد بہ سلسلہ ملازمت یا تلاش روزگار میں گھر سے دور دراز مقامات یا بیرونی ممالک جیسے سعودی عربیہ، امریکہ وغیرہ میں رہتے یا مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ دو چار سال میں ایک مرتبہ اپنے آبائی گھر آتے ہیں۔ ایسے افراد باپ کے زمانے کی طرح خاندانی وقار اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے خیال سے تقسیم متروکہ کی مخالفت کرتے اور پوری متروکہ جائیداد کو مشترکہ رہنے پر اصرار کرتے ہیں، جب کہ تقسیم متروکہ کا وقت آتا ہے تو بہت سی قانونی پیچیدگیاں اور رکاوٹوں کی وجہ سے لڑکیاں اپنے باپ کی متروکہ جائیداد

میں حصہ پانے کے موقف میں نہیں رہتیں اور محروم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

(۸) ۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ اپنی لڑکیوں کی شادی کے فرائض کی تکمیل یا انجام دہی کے لئے اپنی جائیداد کا بیشتر حصہ مجبور ہو کر فروخت کر دیتا ہے۔ باپ کے انتقال پر جو تھوڑی بہت جائیداد بچ رہتی ہے لڑکے مختلف عذرات اور بہانوں سے جو بچی ہوئی جائیداد متروکہ کہلاتی ہے اس میں لڑکیوں کو شرعی حصہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ کہ اب کیا جائیداد باقی رہ گئی ہے جس میں لڑکیوں کو بھی حصہ دیا جائے۔

(۹) ۔ بعض صورتیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں کہ باپ کے انتقال پر لڑکے لڑکیوں سے مختلف بہانوں اور حکمت عملی سے لڑکیوں سے لا دعویٰ لکھوا لیتے ہیں اور بھائیوں کی مروت میں لڑکیاں ایسا کرنے پر بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔ بعد میں لڑکیوں کے انتقال پر ان کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے والا پانے حصہ شرعی کے لئے جب عدالت میں رجوع ہوتی ہیں تو ایسے دعوے خارج المیعاد کے عذر پر خارج ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مالک تو ماموں کی مروت میں ماری جاتی ہیں۔ اور بھانجے، بھانجیاں ماں کے قانونی حق کو پانے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

متذکرہ بالا وجوہات خیالی و فرضی نہیں ہیں۔ بلکہ سچی اور تلخ حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ ملک کی مختلف عدالتوں میں متروکہ کے مقدمات زیر دوران ہیں جہاں ایسے مسائل مابہ النزاع ہیں۔ جن کے متعلق تنقیحات قائم ہو کر تصفیہ طلب ہیں۔ اس سلسلے سے ایک یا دو مقدمات کا ذکر کرنا غیر متعلق یا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس کا مجھے ذاتی علم ہے وہ یہ کہ تعلقہ ... ضلع ... کے ایک ... نے کثیر جائیداد منقولہ و غیر منقولہ چھوڑ کر وفات پائی جو چار ... پر مشتمل تھی۔

پسماندگان میں ایک لڑکا اور چار لڑکیاں تھیں۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں پھر لڑکی کے نام پر ۸ یا ۱۰ ایکڑ ترکہ کے نام سے دے دیا تھا۔ اور باقی جائداد پر لڑکا قابض اور متصرف تھا۔ بعد انتقال سوداگر لڑکیوں نے باپ کی ترکہ کے نام سے دی ہوئی جائیداد کو ہی متروکہ سمجھ کر سکوت اختیار کیا تھا۔ ان لڑکیوں کے انتقال کے بعد نواسوں نے اپنے ماموں کے خلاف اس غیر شرعی تقسیم متروکہ کے خلاف سب کورٹ محبوب نگر میں دعویٰ پیش کیا جو خارج المیعاد ہونے کے عذر پر خارج کردیا گیا۔ جس کے خلاف ہائیکورٹ میں مرافعہ دائر کیا گیا جو زیر دوران ہے جس سے ظاہر ہے کہ معاشرے کے رسم و رواج پر عمل آوری کے نتیجہ میں لڑکیاں اپنے شرعی حقوق سے محروم ہوگئیں جن کو قرآن کریم نے عطا کیا تھا۔

اس تعلق سے ایک دوسرا واقعہ جو میرے علم میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ورنگل کے سب آرڈینیٹ کورٹ میں ایک مقدمہ زیر دوران ہے جس میں باپ نے اپنے حین حیات ترکہ کے نام سے کچھ جائیداد لڑکیوں کو دی تھی اسی حصہ جائیداد کو متروکہ سمجھ کر باپ کے انتقال کے بعد جو متروکہ جائیداد بچ رہی ہے اس میں حصہ دینے سے انکار کردیا گیا ہے باپ نے ایک رجسٹری دستاویز وصیت میں لڑکیوں کو متروکہ میں حصہ نہ دینے کا ذکر کیا ہے کہ لڑکیوں کو اس نے اپنی زندگی ہی میں حصہ دے دیا ہے اس دستاویز میں بربناء عاق ایک لڑکے کو متروکہ میں حصہ پانے سے محروم کر دینے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ عاق کے عدم جواز سے متعلق قبل ازیں ایک تفصیلی مضمون اخبار "روزنامہ سیاست" کچھ عرصے پہلے

شائع ہو چکا ہے اس بارے میں مزید اظہار خیال کا مناسب اور احتیاط کے خلاف ہے اس لئے کہ عدالت میں یہ مقدمہ زیر دوران اور تصفیہ طلب ہے۔

میں عوام کی معلومات کے لئے اس بارے میں اسلامی قانون کے صحیح موقف کو واضح کر دینا از بس ضروری سمجھتا ہوں قرآن کریم میں متروکہ سے متعلق صاف و صریح احکام موجود ہیں۔ ان قرآنی احکام کی روشنی میں خاندانی روایات یا دستاویزات یا مقامی رسم و رواج کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ قطعی کالعدم اور نا قابل عمل ہیں سورہ نساء کی آیات ۱۱ - ۱۲ میں تمام ورثاء کے حصص معین اور واضح کر دیئے گئے ہیں جو متروکہ جائیداد میں حصہ پانے کے مستحق ہیں۔ اس میں کسی کو رتی برابر بھی کمی و بیشی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ کسی مسلمان مرد یا عورت نے اپنے انتقال پر جو جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ چھوڑی ہے وہ متروکہ کہلاتی ہے اگر متوفی نے کوئی جائیداد اپنی زندگی میں کسی وارث کے حق میں قانون ملک کے طریقہ پر منتقل کی ہے تو وہ وارث ایسی منتقل شدہ جائیداد کا قطعی مالک ہو جائے گا۔ ایسی دی ہوئی یا منتقل شدہ جائیداد نہ متروکہ بن سکتی ہے اور نہ متروکہ میں محسوب کی جا سکتی ہے اسلامی اصول قانون کی رو سے (ISLAMIC JURIS PRUDENCE) مورث کے انتقال پر اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد متروکہ جبن تک ہے ایک لمحہ کے لئے بھی معلق یا غیر مالک کے نہیں رہ سکتی۔ اور وہ خود بخود کاشترکہ حق فوری ورثاء میں مرکوز اور منتقل ہو جاتا ہے VEST, وغیرہ مورث کے انتقال

نشاناب
پر اپنے اپنے حصہ کی حد تک قطعی مالک ہو جاتے ہیں۔ انتقال ملکیت
کے لئے کسی رجسٹری شدہ دستاویز کی ضرورت نہیں ہے حصص کی ملکیت کی
منتقلی وارث کے حق میں عمل قانون کے ذریعہ OPERATION OF LAW BY
از خود ہو جاتی ہے۔ اور ہر وارث اپنے حصہ جائیداد سے مورث کے
تاریخ انتقال سے استفادہ کا حق رکھتا ہے کوئی وارث دوسرے وارث
کے حق کو بالجبر یا اس کی مرضی کے خلاف استفادہ کرے وہ غاصب کہلائے
گا اسلامی قانون میں غاصب کے لئے کوئی تحفظ میعاد نہیں ہے ہو سکتا ہے
کہ ایک وارث دوسرے وارث کے حصہ کو قانونی نزاکت یا پیچیدگی کی
بنا، پر دنیوی قانون کے اعتبار سے اس کا مالک ہو جائے یا ایسی جائداد
سے اس کا استفادہ کرے۔ لیکن آخرت میں اس کی جوابدہی سے
نہیں بچ سکتا۔

متقی، خدا ترس اور دیندار لوگ حقدار وارث کو اس کا حق
دینے میں یا پہونچانے میں کوئی کوتاہی یا ناانصافی نہیں کرتے۔ مگر اندیشہ
ان لوگوں سے ہے جو اپنی جہالت سے رسم و رواج ہی کو احکام قرآنی
سمجھتے ہوئے حقدار کو حق دینے سے نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ اس
کے جائز حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ
خود حقدار اپنی جہالت اور قانونی ناواقفیت کی وجہ سے اپنے جائز حق
کے حاصل کرنے میں محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی بدبختی ہے لیکن
قابل مذمت وہ لوگ ہیں جو اس بارے میں قانون کو اچھی طرح جانتے ہوئے
بھی بالعمد بدنیتی اور مفاد پرستی کے تحت حقدار وارث کو اس کے جائز حق
محروم کر دیتے ہیں۔

شاداب
ڈاکٹر محمد نورالدین
ریڈر شعبہ اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی اور علمی خدمات

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ علامہ اقبال کے مردِ مومن تھے۔ ان کے یہاں ایک مفکر کی فکر، ایک معلم کی شفقت ایک عاشق کا سوز و گداز ایک مدبر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان اور ایک مہاتما کی سی معصومیت سب کا جلوہ نظر آتا ہے علوم میں ان کی نظر ہمہ گیر اور ان کی معلومات ہمہ رنگ تھیں۔ فلسفہ اقتصادیات، ادب سائنس تعلیم، تصوف، مذہبیات وغیرہ پر اُن کا مطالعہ گہرا اور عمیق تھا۔ ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ اُسے انسانیت کے اعلیٰ اقدار کی خدمت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ذاکر صاحب اگر صرف مصنف یا معلم ہوتے تو بھی اُن کا درجہ بہت بلند ہوتا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کو قدرت نے تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتیں عطا کی تھیں اُن کا علمی و ادبی ذوق بہت بلند معیار کا تھا۔ مگر قومی فرائض کی ادائیگی میں انہیں وہ سکون اور اطمینان میسر نہ آسکا جو تصنیف و تالیف کے لئے ضروری ہے۔ انتہائی مصروفیات کے باوجود انہوں نے جو کتابیں لکھیں یا ترجمہ کی ہیں۔ وہ علمی و ادبی دنیا میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں کتابوں کے علاوہ انہوں نے بے شمار علمی و ادبی مضامین بھی لکھے ہیں جو ماہنامہ جامعہ

اور دوسرے رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے سنہ ۱۹۲۲ء میں پروفیسر ایڈون کینن (Edven Kenin) کی کتاب "ایلی منٹری پولیٹیکل اکانمی" کا اردو زبان میں "مبادی معاشیات" کے نام سے ترجمہ کیا ذاکر صاحب نے یہ اردو ترجمہ اس خوبی سے کیا تھا کہ یہ کتاب ترجمہ نہیں بلکہ اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے اردو زبان میں اصطلاحات کی کمی کے باوجود ذاکر صاحب نے کتاب کے نفس مضمون کو نہایت صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے افلاطون کی مشہور کتاب "ریاست" کا اردو زبان میں ترجمہ کیا اس ترجمے کے تعلق سے اکثر ادیبوں نے لکھا ہے کہ اگر خود افلاطون بھی اس کتاب کو اردو میں لکھتا تو اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت شستہ، رواں، سادہ اور سلیس اردو نثر میں کیا گیا ہے خصوصاً اس کتاب کا مقدمہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ایک نادر نمونہ ہے اس مقدمے میں افلاطون کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ایک اور تصنیف "معاشیات۔ مقصد اور منہاج" کے نام سے ہے یہ ذاکر صاحب کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے آبادی ہندوستانی اکیڈمی کی درخواست پر پڑھے گئے تھے اس کتاب میں تمہید کے علاوہ تین باب ہیں۔ پہلا باب معاشیات سوالات کے عنوان سے دوسرا باب معاشیات ترتیب کے عنوان سے اور تیسرا باب معاشیات

الہامی کے عنوان سے ہے۔

ان ابواب میں سرمایہ داری کا علمی جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن حالات میں اس کے مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو انسانوں کی ان گنت خواہشات اور ضروریات ہیں دوسری طرف ان کی تشفی کے وسائل محدود ہیں۔ اس وجہ سے اس اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے جسے ہم سائنسی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے اصول و قوانین کا باہر سے مطالعہ ممکن نہیں انہیں صرف سمجھا جا سکتا ہے اس لئے معاشیات کو الہامی علم کہا گیا ہے ان لکچروں میں اسی نقطۂ نظر سے مسائل کو پیش کیا گیا ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی چوتھی تصنیف، تعلیمی خطبات کے نام سے مارچ ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آئی یہ کتاب ذاکر حسین صاحب کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مختلف کانفرنسوں میں تعلیمی مسائل پر اور ان تقریروں کا جو آل انڈیا ریڈیو سے تعلیم و تربیت کے موضوع پر نشر ہوئی تھیں۔ ان کے خطبات میں جا بجا ایسے بلیغ اور فکر انگیز اشارے ہیں۔ جو مستقل تصانیف پر بھی بھاری ہیں۔ ان خطبات کا ہر موضوع، تعلیم کا بنیادی مسئلہ ہے جیسے قومی تعلیم، بنیادی تعلیم۔ اچھے استاد۔ بچوں کی تربیت، سیرت کی تربیت ثانوی تعلیم وغیرہ ان عنوانات پر ذاکر صاحب نے جس انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس سے ان کی بالغ نظری۔ حب الوطنی، سماجی شعور ژرف بینی کا حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے اس کتاب میں ذاکر حسین صاحب کی انشاء اور خطابت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہے اب تک

اِس کتاب کے چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپریل ۱۹۲۶ء میں جرمن ماہر معاشیات فریڈرش لسٹ کی کتاب "قومی معاشیات" کا اُردو میں ترجمہ کیا یہ ترجمہ بھی سادہ سلیس، شُستہ اور رواں اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ کتاب معاشیات کی بلند پایہ تصانیف میں شمار کی جاتی ہے اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ ہر ملک کی معاشی حالت، وہاں کے مخصوص حالات کا نتیجہ ہوتی ہے اگر کسی ملک کے لیے آزاد تجارت کا اُصول ٹھیک ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب ملکوں پر اس کا اطلاق ہونا چاہیے اکثر ناقدین نے اس کتاب کے تعلق سے کہا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے فکر و عمل کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں مشہور قومی رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل کی یادگار کے طور پر مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کی طرف سے لکچرس کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو جو اس وقت بہار کے گورنر تھے مدعو کیا گیا تھا۔ جہاں انھوں نے ۱۲، ۱۳، اور ۱۴، دسمبر کو جو لکچر دیے وہ ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم" کے نام سے مئی ۱۹۶۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اس کتاب میں ہندوستان کے نظامِ تعلیم کا سائنٹفک تجزیہ کیا گیا ہے اور تعلیم عامہ کے سربراہوں کو نئے طرز کے تعلیمی منصوبے بنانے اور ان پر عمل کرنے کے بارے میں بصیرت افروز ہدایتیں دی گئی ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آج سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے بچوں کے لئے کہانیاں لکھنا شروع کیں تھیں۔ بچوں کے لئے سبق آموز اور

اخلاقی کہانیاں لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے کیونکہ بچوں کے ادبی مذاق کا انحصار اس پر بھی ہوتا ہے کہ انہیں کیسا تعلیمی مواد فراہم کیا جائے بچپن کا درس ہی آئندہ کے ذوق مطالعہ کی بنیاد بنتا ہے مگر اس نازک اور کٹھن راہ پر بھی ذاکر حسین صاحب کا قلم بچوں کی تعلیمی اور نفسیاتی ضرورتوں کے احساس و ادراک کے ساتھ اٹھا ہے انھوں نے اپنے خیالات کو آسان زبان اور دل چسپ پیرایے میں پیش کیا ہے اُن کی کہانیاں اخلاقی قدروں کو موزوں اور موثر انداز میں ابھارتی ہیں۔ اور ننھے منے ذہنوں میں ان تمام محاسن کا شعور پیدا کرتی ہیں۔ جس کی تعلیم ایک معلم اپنا ذمہ داری خیال کرتا ہے۔

ذاکر حسین صاحب کی یہ اخلاقی کہانیاں معلمانہ بصیرت کے ساتھ اچھے اخلاق اور نیک اطوار کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کہانیوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلقین نہیں کی جاتی بس کہانی بیان کردی جاتی ہے ذاکر حسین صاحب ایک معلم کی حیثیت سے بچے کو اُس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں سے وہ خود سب کچھ سمجھ سکتا ہے مثلاً صفائی کا احساس دلانے کے لئے اُس کی اہمیت جتانے کے بجائے یوں کہتے ہیں کہ "ہم غلیظ آدمی کو اندر آنے نہیں دیتے۔ یا اُن کا گھر بہت صاف تھا مختصر یہ کہ ان کہانیوں میں انھوں نے بچوں کو انسانیت کے آداب سکھائے ہیں۔ ذاکر حسین صاحب کی مختلف کہانیوں کا مجموعہ "ابو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے

اس کے علاوہ ذاکر حسین صاحب نے جامعہ میں اُردو اکیڈیمی

کی بنیاد ڈالی۔ انھیں کی رہنمائی میں جامعہ نے اردو میں دیوان غالب، رباعیات عمر خیام اور دیوان شیدا کے خوبصورت ایڈیشن شائع کئے اور انھیں کی رہنمائی میں ماہنامہ "جامعہ" نے برسوں اردو ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمت کی۔

ذاکر حسین صاحب نے علی گڑھ میں علمی ماحول پیدا کرکے علمی دنیا میں علی گڑھ کے وقار کو بلند کیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے صدر کی حیثیت سے جدید ہندوستان میں اردو کے منصب اور مقام کو واضح کیا۔ اور علی گڑھ پر اردو کا جو حق ہے وہ علی گڑھ والوں کو دلایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی تحریر و تقریر سے سچی ہندوستانیت اور سچی انسانیت کا گہرا تعلق واضح کیا۔ انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی۔ ادب کی تعلیم کے معنی اور مقصد پر روشنی ڈالی اور ادب کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کو عبادت کا درجہ دیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے علم و ادب کو وسعت بھی عطا کی اور گہرائی بھی۔ اور زندگی کی چمک دمک بھی۔

علمی دنیا میں علم و ادب کی ایسی پیاس، اور علمی شغف میں اتنی علمی کاوشیں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں گی۔

اس مسلم، مفکر، مہاتما، صوفی اور علم و عمل کے پیکر کی علمی و ادبی خدمات کو آنے والا دور یقیناً آب زر سے لکھے گا۔

شاداب
محمد اسحاق
ریٹائرڈ پرنسپل کالج آف ایجوکیشن
جاوید منزل مکان نمبر ۴/۱۸ ۶۱-۷-۱۱
بازار گارڈ۔ حیدرآباد۔

تعلیم کا کام — عائشہ بیگم کے نام

محترمہ عائشہ بیگم، صدر محفلِ علم و فن؛ سابق جوائنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن مہاراشٹر کے نام اور کام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے اِن کا لائف مشن تعلیم ہی تعلیم ہے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تعلیم سے سروکار رکھنا ہوتا ہے۔ روزانہ صبح سے شام تک اپنی کار میں غریب ذہین بچوں کی تلاش میں گھر گھر اسکول اسکول پھرتی رہتی ہیں۔ تاکہ اُن کی مدد کی جائے۔ اِن کے عزم لگن کو دیکھ کر خیال آیا کہ محترمہ کے کام کے متعلق کچھ معلومات کرنی چاہیے۔ تاکہ اس گمنام نیک نام خاتون کے کام سے عجب نہیں بہت سے خاندانوں کو روشنی ملے گی ممکن ہے کچھ لوگ کچھ دیر کے لیے اپنی فکریں کم ہو جائیں گے۔ اس مضمون کا اصل مقصد بھی یہی ہے ورنہ محترمہ کی تعریف و توصیف میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں ہے۔

دوسروں کی باتیں بعد میں ہوں گی۔ یہ پتہ لگائیے آپ کے بچے کچھ پڑھ لکھے ہیں۔

کہنے لگیں۔ میرے سات بچے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اس میں چھ ڈاکٹر ہوئے۔ اور ایک لڑکا انجینئر۔ دو بہو ڈاکٹر ہیں۔ اور تینوں داماد ڈاکٹر۔ یہ سب کے سب امریکہ انگلینڈ میں ہیں ایک صاحبزادی ڈاکٹر شمیم حیدرآباد ہی میں وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل کی سپرنٹنڈنٹ ہیں اور گائناکالوجی کی پروفیسر ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے دوران میرے بچوں نے گیارہ گولڈ میڈل اور ایک لڑکی نے میڈیسن میں چار گولڈ میڈل لئے یہ سب میرے یہاں آج بھی محفوظ ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک ہی خاندان میں گیارہ ڈاکٹر اور گیارہ گولڈ میڈل۔ احد عشر کوکبا کی مثال۔ گیارہ کے گیارہ آسمان کے ستارے۔ پھر ان سب کے بچے میڈیسن انجینئرنگ اور کالج کی اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے سب بچے جب اتنے قابل نکلے تو ظاہر ہے کچھ اپنے آبائی خاندان کے ماحول اور روایت کا ضرور اثر ہوگا۔ ہاں یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ میری آٹھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہمارے خاندان میں بزرگ عالم فاضل اور جید علمائے دین گزرے ہیں۔ میری والدہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ان کا ارادہ تھا کہ میں سب بچوں کو کالج تک اعلیٰ تعلیم دلوا کر رہوں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری سب آٹھ بہنیں محکمۂ تعلیمات میں کلاس ون گزیٹیڈ آفیسرس کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوگئیں اور میرے ایک بھائی ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے ——— ساٹھ ستر برس پہلے لڑکیوں کے لئے نہ تو اسکول زیادہ تھے اور نہ کالج۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ لڑکیوں کی تعلیم کو گناہ اور خاندان کے لئے عیب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں آپ کی والدہ کی دور اندیشی اور روشن خیالی کچھ عجوبہ سے کم

سے کم نہیں۔

تعجب ہے کہ آپ کے سب بچے اتنے ذہین اور فطین کیسے نکلے۔؟

آپ تو میرے سب راز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اور میرے شوہر روزانہ شام میں اپنے بچوں کے ساتھ دو تا چار گھنٹے ان کے اسباق اور ہوم ورک دیکھنے بیٹھ جاتے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ہونے کے باوجود میں صرف ایک دن کلب گئی۔ عام طور پر ہم لوگ کسی تقریب میں شریک نہ ہوتے سوائے ایسی تقریب کے جو بہت ضروری اور اہم ہوتی۔ بچوں کی تعلیم میں ایک دن کا بھی حرج ہوتا تو میں بے چین ہو جاتی۔ ان کی عام معلومات کے لئے برہمن کے پبلک لائبریری سے روزانہ ایک کتاب ایک آنے میں منگواتی۔ جو چوبیس گھنٹوں بعد واپس کرنی پڑتی۔ وہ ایک کتاب ایک دن میں تین چار بچے باری باری پڑھ لیتے۔ اس طرح لائبریری کی ساری کتابیں میرے سب بچے دیمک کی طرح چاٹ گئے۔

میری ایک لڑکی ہوسٹن (امریکہ) میں گیا ئنا کالوجسٹ ہے جو انگلینڈ اور امریکہ کے ۱۲ امتحانات پاس کر چکی ہے۔ ایک داماد ڈاکٹر عبدالعلی شہرہ آفاق کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر شکول کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت اور عظمت کے لئے ۸ رسالہ ڈاکٹر کول کا نام کافی ہے۔

ان سب بچوں کی تعلیم پر خرچ بھی بہت آتا ہوگا۔ کس طرح آپ ان سب بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے رہے

میں اور میرے شوہر سادہ لباس استعمال کرتے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھڑکیلے دار اور قیمتی ساڑی نہیں خریدی۔ جو بچے ڈاکٹر اور انجینئر

مجھ سے عید میں ملنے آتیں۔ میری سادہ لباسی پر حیرت کرتیں۔ کیوں کہ وہ بھڑک دار لباس اور زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتیں۔ کبھی وہ پوچھ لیتیں کہ آپ ڈسٹرکٹ کی عہدہ دار ہوتے ہوئے بھی کیوں اتنے سادہ لباس میں رہتی ہیں۔ میں کہتی اچھے لباس اور زیور کی تمنا میرے دل میں ہمیشہ۔ اگر میں اس آرائش و زیبائش پر خرچ کروں تو میں بچوں کو پڑھا نہیں سکوں۔ جب یہ بچے بڑے ہو کر کچھ نام پیدا کریں گے تو اس وقت جو خوشی ہو گی اس کا اندازہ تو آپ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کبھی زندگی میں کسی سے کوئی قرض نہیں لیا۔ آج میرے سب خواب پورے ہو گئے۔ ان بچوں کو دیکھ کر ماں کو جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ کو کیسے بتاؤں۔ مجھے اپنی سادہ زندگی پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی۔ بلکہ ہمیشہ فخر ہی رہا۔ نہ معلوم کتنی خواتین نے میری زندگی سے سبق لیا ہوگا۔

میں نے گفتگو کو ذرا بدلتے ہوئے سوال کیا کہ اپنے بچوں کے لئے کون کیا کچھ نہیں کرتا۔ اگر آپ نے بھی یہ سب کیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر آپ نے کچھ غریب ذہین بچوں کے لئے بھی کیا ہوتا تو پھر ہم کو آپ کے کام سے کچھ دلچسپی ہو سکتی تھی۔ یہ سوال کچھ ان کی رگِ حمیت کو بھڑکانے والا تھا۔ ذرا جوش میں آکر کہنے لگیں۔

میں بچپن ہی سے اور پھر اسکول کی ٹیچر اور بڑے عہدوں تک پہنچنے تک ہر منزل پر بحیثیت عہدہ دار نہیں۔ بلکہ خانگی طور پر دو سروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے مقدور بھر کوشش کرتی رہی۔

محترمہ نے کوئی دس بارہ قصے ایک گھنٹے میں سنا ڈالے

سب کہاں کچھ آپ سن لیجیے کہنے لگیں۔

میں اورنگ آباد میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھی۔ ایک دن ایک غریب لڑکا آیا۔ کہنے لگا مجھے کہیں نوکر رکھوا دیجئے۔ پوچھا کچھ پڑھا بھی ہے۔ کہنے لگا میٹرک اس سال کامیاب ہوا ہوں۔ کہ نمبر لایا ہے ۹۸ فی صد تین مضامین میں پورے سو فیصد۔ یہ حیرت میں پڑ گئیں۔ اس لڑکے کو سمجھایا کر بیٹا تو ڈاکٹر بنے گا غریب باپ نے کوشش کی اور کسی طرح اس کے اخراجات تعلیم برداشت کئے لگا وہ سیڈیسن کے کورس کے دوسرے سال میں تھا۔ کہ باپ کا انتقال ہو گیا یہ اس وقت جالنہ میں تھیں۔ انہیں خط ملا کہ آپ کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو اچھا ہوتا۔ میرے خاندان کو سہارا دینے والا کوئی نہیں میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے دوسرے سال میں ہوں۔ اگر مجھے کم از کم ۲۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ کسی طرح نہ ملے تو میں تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوں۔ محترمہ عائشہ بیگم نے فوراً ٹیلی گرام کے ذریعہ ۲۵ روپے منی آرڈر بھیج دیا اور خط لکھ دیا کہ تعلیم ختم کرنے تک ۲۵ روپیہ ماہانہ تمہیں ملتے رہیں گے۔ یاد رہے کہ یہ روپیہ آج کے نہیں کوئی چالیس پینتالیس برس پہلے کے تھے۔ اس لڑکے کو یہ رقم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کوئی تین برس تک ملتی رہی۔ ایک روز وہ گھر آیا اور اپنی پہلی تنخواہ محترمہ کے ہاتھ میں رکھ دی۔ محترمہ نے کہا۔ اس کی حقدار تو تمہاری والدہ ہیں اور رقم واپس کر دی لیکن اس شریف ڈاکٹر نے تعلیم کے زمانے کے پورے روپیے واپس کر دیئے تاکہ اس قسم کی امداد دوسرے لڑکوں کے لئے جاری رہے۔ اس ڈاکٹر کی شادی اونچے خاندان کی خوبصورت لڑکی سے

ہوئی۔ ان کے بچے کالجوں میں اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں۔ اور وہ آج کل سول سرجن ہے اگر وقت پر عائشہ بیگم صاحبہ نے اس لڑکے کی تعلیم میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو نہ معلوم یہ ہیرا کہاں کوڑے کرکٹ میں گم ہوجاتا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

ضلع پربھنی میں ایک صاحب امریکہ میں پی ایچ ڈی کرکے آئے اور کسی بڑی ملازمت پر کام شروع کیا۔ لیکن یہ تھے کٹر مذہبی آدمی ۔ لڑکیوں کی تعلیم کے دشمن اور لڑکیوں کو پردہ کرانے کے سخت پابند ۔ ان کی ایک بارہ سالہ لڑکی چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ جو برقعہ اور رکشا کو پردہ لگا کر اسکول جاتی تھی۔ ایک روز یہ لڑکی پردے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باپ کی نظر پڑی۔ شام میں لڑکی اسکول سے واپس آئی۔ ابا جان غصے میں آپے سے باہر ہوگئے لڑکی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ لڑکی کے دانت ٹوٹ کر گر گئے اور اسکول سے نام خارج کروایا۔ محترمہ کے بہت سمجھانے بجھانے پر اس لڑکی کو وہ دوبارہ اسکول بھیجانے پر آمادہ ہوگئے۔ اس حادثے کے ایک دو سال کے اندر ہی ان صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ۲۵ سالہ بیوہ اور ۵ بچے بے سہارا اس دنیا میں رہ گئے عائشہ بیگم صاحبہ نے اس سارے خاندان کو اپنے گھر بلا کر رکھ لیا۔ یہ پردہ نشین بیوہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھیں۔ انہیں پڑھانا شروع کیا۔ انھوں نے میٹرک پاس کرلیا۔ اور ٹرینڈ ہوکر اسکول میں ٹیچر ہوگئیں باپ کا مرنا کیا تھا۔ سب کے لئے تعلیم کا دروازہ کھل گیا یہ خاتون ہاتھوں میں کپڑے سیتیں اور اس پیسے سے گھر کا خرچ چلانے لگیں۔ ان کے پانچوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ اور لڑکیاں بڑے

...نوں میں بیاہی گئیں۔ ان صاحبہ کے چھ بھائی چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کا کام ...تے تھے۔ ان سب کے بچوں کو اس خاتون نے پڑھایا۔ اس روشن دماغ خاتون ...ی وجہ سے اس خاندان کے پچاس سے زائد افراد میں آپ کو ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر ...ایچ۔ ڈی، پرنسپل مل جائیں گے۔

میں نے کہا مولانا سلیمان ندوی" نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "اگر غریب خاندان کا کوئی لڑکا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاتا ہے تو اس کی تیسری چوتھی پشت ...میں کوئی غریب باقی نہیں رہے گا۔ اس پر محترمہ نے کہا کہ:

دیکھیے صرف ایک ہی پشت میں تعلیم نے سارے خاندان میں انقلاب برپا کردیا اور کہا میں نے کسی پردہ نشین خاتون کو ایسی ذہین، دور اندیش دانش مند اور حوصلہ مند عورت کو اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

ایک دن ایک لڑکی اپنے خاندان سے ناراض ہو کر محترمہ کے گھر آگئی تاکہ وہ کالج میں شریک ہو سکے۔ اس لڑکی کے بھائی کالج کی اعلیٰ تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ بڑی مشکل سے محترمہ نے انہیں سمجھایا اس لڑکی کے ساتھ اور آٹھ لڑکیوں کو کالج میں شریک کروایا اسی لڑکی نے ڈیرہ دون سے ایگریکلچر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ آج کل زرعی کالج میں ایک شعبہ کی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہے اور پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

اچھا آج کل آپ کی معروفیت کیا ہے۔ دبیر پورہ میں یٰسین صاحب کے بنگلہ میں "امام بخش میموریل اسکول" چلا رہی ہوں جس میں ۱۳۶ طلباء اور دس ٹیچرس کام کرتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک حصہ میرے داماد ڈاکٹر عبدالجلیل نے اسکول کھولنے کے لئے دے دیا ہے اس محلہ کے عام طور پر غریب خاندانوں

کے لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ میں اسی اسکول میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک خاتون اپنے دو بچوں کو لے کر آئیں اور اپنی افتاد سنانے لگیں۔ یہ دونوں بچے رات میں سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ آدھی رات ہوگئی تو کہیں دکان کے سامنے سو جاتے ہیں۔ باپ پینے کا عادی ہے کبھی کبھی گھر کی صورت دیکھ لیتا ہے۔ میں ان بچوں کو آپ کے حوالے کرتی ہوں محترمہ نے کہا بیٹا تم بڑے ہوکر رکشا چلاؤ گے یا میری طرح موٹر کار میں اڑتے پھروگے اس کے لئے تعلیم ضروری ہے۔ بچوں نے کہا ہمیں رکشا نہیں چلانا ہے موٹر کار چلانا ہے۔

بس انہیں اپنے اسکول میں جہاں پہلے ہی سے ۱۸ بچوں کے قیام وطعام کا مفت انتظام ہے۔ ان دو بچوں کے رہنے، کھانے، پینے، کتابیں کاپیاں سب مفت انتظام کر دیا۔ یہ دونوں لڑکے کوئی دو ماہ سے پڑھ رہے ہیں ذہین ہیں۔ خود محترمہ روزانہ ان کا ہوم ورک دیکھتی ہیں۔ چند برسوں بعد عجب نہیں کہ یہ سماج میں کسی اچھے درجے تک پہنچ جائیں۔

میں نے کہا کہ کسی کو ایک وقت مدد دے کر نجات حاصل کر لینا آسان ہے لیکن آپ تو ان بچوں ہی کی ہی نہیں ان کے خاندان کی دیکھ بھال کی بھی ذمہ داری لیتی ہیں۔ یہ تو جان کا جنجھٹ ہے کون یہ پریشانی اپنے سر لیتا ہے کہنے لگیں۔ دیکھئے میرا لائف مشن ہے اگر میں یہ کام نہ کروں تو میری زندگی کے دس سال کم ہو جائیں گے میں نے مسلمان ہی نہیں تین ہندو بچوں کی خاموش مدد کی ہے ان کے نام لینا نہیں چاہتی۔ ان میں ایک ڈاکٹر ایک انجینئر ایک کالج کے پرنسپل ہیں۔

اب چلئے آخری سوال رہ گیا۔ آخر یہ ماہانہ ہزاروں کا خرچ آپ

کیسے برداشت کرتی ہیں. میرے بچے میرے کام سے واقف ہیں۔ وہ میری مدد کرتے ہیں. میں نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ کبھی اخبار میں کوئی اپیل کی۔ میری پنشن کی ساری رقم غریب' ذہین بچوں کی تعلیم پر خرچ ہو جاتی ہے میں نے آج تک اپنی پنشن کی رقم کا ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا ۔

اگر کسی ایک خاتون میں خدمتِ خلق کا ایسا جذبہ ہو تو وہ تعلیم کے ذریعے کئی ایک خاندان ہی نہیں بلکہ اِن کی آنے والی نسلوں کو نامعلوم وقت کے دھارے تک اپنے اس احسان کی بارش سے ہرا بھرا رکھ سکتی ہے شاید اس کا اندازہ خود عائشہ بیگم کو بھی نہ ہوگا۔

میں نے کہا کوئی پیام ؟ ۔

چلیے آپ کی خاطر اقبال کا ایک شعر پڑھ دیتی ہوں ۔

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں۔ شاید انہیں جگا دے

میں نے یہ شعر پڑھا۔ سه

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ "ایسے" ہیں جہاں میں

سلطان زاہد محی الدین ۔
حیدرآباد

تحریکِ خلافت

عالم اسلام کا نشاۃ ثانیہ تحریکِ خلافت کے آغاز ہی سے ممکن تھا، لہٰذا برصغیر کی تاریخ میں ۱۹۱۹ء کو اس لحاظ سے دوگنی اہمیت حاصل رہی ہے کہ اس سال ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے لئے مہمیز ثابت ہونے والا واقعہ "جلیان والا باغ" پیش آیا تھا اور اسی سال تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا تھا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا لیکن تحریکِ خلافت کا وہی انجام ہوا۔ جو پہلی جنگِ آزادی کا ہوا تھا۔ جسے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا تھا۔

یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے اسباب کیا تھے ..؟ یہ ایک عظیم عالمی تحریک تھی۔ اس کی ناکامی کے بدترین اثرات خود ہندوستان پر بہت دور رس ثابت ہوئے اور عالم اسلام جو بھگت چکا ہے وہ ایک تلخ حقیقت ہے اب اہلِ فکر و نظر کے لئے یہ بات نہایت اہم ہے اور اس پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے زندہ قوموں کے لئے ناکامیوں میں ایک درس بصیرت موجود ہوتا ہے بالآخر ناکامی کامیابی کا زینہ بن جاتا ہے۔

تحریکِ خلافت محض ہندوستانی تحریک نہ تھی لیکن یہ تحریک عمل حرکت و حیات کا ایک پیام تھا جس کا تعلق ہندوستان اور مسلمانوں تک

ے رہا ہے ہندوستان کو اتحاد اور آزادی کی ضرورت تھی، آزادی مل گئی۔ لیکن وہ اتحاد نصیب نہ ہوسکا جو علی برادران اور مہاتما گاندھی کو مطلوب تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خوف پورا ہوا جس کا خدشہ تھا ترکی میں خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس طرح یہ تحریک اپنے مقصد میں ناکام ثابت ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے روح پرور نظارے یہاں فرقہ پرستوں کے لئے روح فرسا تھے۔ اور عالمی سامراجی طاقتوں کیلئے ناقابل برداشت تھے۔

بساطِ سیاست پر مغربی طاقتوں نے مکاری و عیاری کے وہ جوہر دکھلائے کہ مورخ کا قلم عش عش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عربوں میں قوم پرستی اور بغاوت کی آگ بھڑکا دی گئی۔ عالم عرب کا متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں جو آسانی سے ہڑپ کی جا سکیں عالم اسلام کی مرکزی قوت کا محاصرہ کر لیا گیا ترکی کے خلاف یورپ کی متحدہ کارروائیوں سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا اور آخر کار مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان ملتِ اسلامیہ کے لئے بے پناہ مصیبتوں اور مسلسل ناکامیوں کا اعلان تھا، اس ہولناک حادثہ کے بعد ملتِ اسلامیہ کے دانشمندوں نے اتحاد ملی کی کوشش کی "موتمر عالم اسلامی" کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ سیاستدانوں کی ذاتی اغراض ملت کے مفاد پر غالب آگئیں تو دوسری طرف سامراجی طاقتوں کا گٹھ جوڑ سیاسی اور معاشی میدان میں مغرب کی بالادستی اور غلبہ عالم اسلام کیلئے اور تیسری دنیا کے ممالک کیلئے ایک آزمائشی دور ثابت ہوا۔ مسلم ممالک کو دو اہم مسائل درپیش تھے۔ ایک آزادی اور دوسرے وسائل کی کمی یعنی نصف صدی میں

نہ گذری تھی کہ دستِ قدرت سے یہ دونوں مسائل حل کر دیئے گئے بہ شکل آزادی اور بصورت "پیٹرو ڈالر" اب مسئلہ آزادی کی حفاظت و صیانت کا تھا مشرقی ممالک کو مغرب کی اسلحہ سازی اور صنعتی ترقی پر انحصار کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ ترقی ہونے لگی تو یہ بات انہیں اس قدر ناگوار گذری کہ ان ممالک پر پے در پے جنگیں مسلط کر دی گئیں اسلحہ بکتے رہے اور تیل کے خزانے خالی ہوتے رہے اسقدر بدترین صورتحال پیدا ہوتی۔ اگر عالم اسلام کی مرکزی قوت محفوظ ہوتی اس قدر نقصان اٹھانے اور سب کچھ گنوانے کے باوجود ہوش آجانے۔ تو ہوش و خرد کا تقاضا ہے کہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کے لیے خلافت کا قیام عمل میں لایا جائے امت مسلمہ کا ضمیر ہر فرد سے سوال کرتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ کہ وہ باطل کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں پہلے ہم اپنے گھر میں اپنے محلے میں اپنے شہر میں اور پھر اپنے ملک میں ایک امیر مقرر کریں۔ پھر مرکزی خلافت اسلامیہ کے لئے سرگرم ہو جائیں۔

(سلسلہ ۴۶)

اور لحد میں آنے والی نسل کے لئے ایک مشعلِ راہ کا کام انجام دیا۔

مہاتما گاندھی جی کے بارے میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا ہے کہ مہاتما گاندھی جی نہ صرف ایک معمولی روشنی کی طرح تھے بلکہ ہزاروں سال تک اِن کی روشنی اس ملک میں دکھائی دیتی رہیگی اور ساری دنیا کے عوام بھی اس کا نظارہ کرتے رہیں گے کیونکہ وہ ایک ایسی روشنی چھوڑ گئے ہیں۔ جس کی بدولت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والی سچائی کی نمائندگی ان کی روشنی میں دکھائی دیتی ہے جو ساری دنیا کو ان کے بنائے ہوئے عدم تشدد کے اصولوں پر کاربند ہوئے۔ شخصی آزادی اور امن پسندی کا سبق دیتی ہے۔"

ڈاکٹر پی کے گندلو پادھیائے

مہاتما گاندھی جی کی داستانِ ماضی

گذشتہ صدی کے ساتویں دہے کے دوران ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستانی نشاطِ ثانیہ سے تعلق رکھنے والی تین ہم عصر اہم شخصیتیں عالمِ وجود میں آئیں۔ جن کے نام گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور، سوامی وویکانندا اور مہاتما گاندھی ہیں جنھوں نے بالترتیب ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۹ء میں جنم لیا۔ اِن تینوں باوقار شخصیتوں کے قدم مادرِ وطن سرزمینِ ہند میں اس طرح مضبوطی کے ساتھ گڑھے ہوئے پائے گئے کہ انہوں نے ایک طرف عالمی مذہب کی بات کی تو دوسری طرف ہندوستان کا سر بلند اور بے خوف و خطر پُرامن زندگی کا خواب دیکھا۔ گرو دیو نے سری نکیتن کا زمین پر ایک قیمتی مینار کی مانند کھڑے ہو کر زرعی میدان میں بہت سارے تجربات کئے۔ سوامی وویکانندا جی نے انسانی جذبہ کے پیشِ نظر انسانیت کو غربت اور زوال پذیری سے بچانے کے لئے لامحدود اور انتھک کوشش کی۔ مہاتما گاندھی جی نے ہریجن طبقہ کو قعرِ مذلت سے اونچا اٹھانے معاشی میدان کو غیر مرکوز کرنے اور اہنسا و عدم تشدد کے اصولوں کے ذریعہ یکساں سماج کی تشکیل کے لئے کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

سماجی آزادی سے مندرجہ بالا تین ہم عصر شخصیتوں میں مہاتما گاندھی جی اگرچہ عمر میں چھوٹے تھے لیکن ہندستان کی جدوجہدِ آزادی کے بارے میں نہ

صرف ایک سرگرم کارکن بلکہ ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے سنہ ۱۹۱۹ء میں جدوجہد آزادی کے لئے ایک مایہ ناز کردار ادا کیا۔ اس وقت تک گرودیو اور سوامی وویکانند جی دونوں نے قومی ورثہ کے طور پر حاصل بلند خیال مُصفیانہ نظریات کی روشنی میں بین الاقوامی سطح پر اپنا پُروقار مقام حاصل کر لیا تھا۔ گاندھی جی اِن کے بلند خیال نظریات کے مجموعے سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور حقیقی آزادی کا یقین رکھنے والے ایک مفکر کی حیثیت سے انہوں نے انجام کے حصول کے لئے تدبر ذرائع اور سعی بلیغ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے عدم تشدد کے اصولوں کی بنیادوں پر آزادی حاصل کرنے کا طریقہ کو ترجیح دی اس قسم کے سماجی نظریات اور ساخت کی تکمیل اور حصول کے لئے صرف اکثریت کا مادی دولت میں انصاف کرنے کے لئے کافی نہ ہونے پر زور دیا۔

ہر قسم کے آزادانہ سماج کی تشکیل کے لئے ایک طرف شخصی آزادی کے لئے مناسب اور موزوں حالات و آب و ہوا کا ہونا ضروری ہے تو دوسری طرف شخصی خود داری کا صحیح احساس بھی ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ ایک آزاد سماج کی تشکیل کی راہ میں سیاسی سماجی اور معاشی اداروں اور میدانوں میں تشدد اور استعمال ایک زبردست رکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔ اسی لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اِن رکاوٹوں کا مقابلہ عدم تشدد کے طریقوں کے ذریعہ کیا جائے۔ سماجی آزادی ہی بالکلیہ طور پر سیاسی آزادی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سماج وہ ہے جو باہمی استحصال سے بالکلیہ آزاد ہے نیز ایک اور سماج وہ ہوتا ہے جس میں باہمی تعاون کے ساتھ مختلف فرقوں میں ایک دوسرے پر بھروسہ اور اعتماد کی روشنی میں حکومت خود اختیاری کی تشکیل عمل میں ہو سکتی ہے صرف چند خود غرض افراد حصولِ

اقتدار کی کوشش کرنا صحیح پہلو نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایسا سماج جس میں ہر سرگرم شہری کی رہبری اخلاقی اقدار کی بنیادوں پر ہو اور اقتدار کی ساری خرابیوں کی مذمت کی جائے۔

مہاتما گاندھی جی کا عالمی نظریہ ضمیر کی طاقت اور عدم تشدد کی بنیادوں پر آزادی حاصل کرنا تھا وہ ایک باشعور انقلابی کی حیثیت رکھتے تھے اور ایک اچھی حکومت کے قیام کے لئے اکثریت کی جانب سے تشدد کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ ایک ایسی غیر مرکوز حکومت جس کی بنیادوں اور سیاسی تعاون طاقت اور جبر و تشدد کے جابرانہ اور ظالمانہ حرکات سے بلکل مبرا اور پاک ہو۔ گاندھی جی کا نظریہ تھا کہ سماج اور اسٹیٹ کے مابین فرق پایا جاتا ہے اور اصولی طور پر کسی اسٹیٹ کو سماج میں مبدل کیا جا سکتا ہے جس کی رو سے سماجی زندگی کو ذاتی خود گرفت کے سانچے میں ڈھالا جائے تو ایک بہترین اسٹیٹ کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اِن خیالات کی روشنی میں گاندھی جی کی نظر میں ایک اصول حکومت وہ ہوگی جس میں کسی قسم کی ہلاک ہتھیاروں کا استعمال نہ ہو اور کوئی پولیس کی طاقت کارفرما نہ ہو بلکہ شہریانِ ریاست خود اپنے ذاتی معاملات کی موثر طریقہ پر نگران کریں اور ان کی ضمیر کی آواز اور اخلاقی طاقت کی بنیادوں پر ان کی صحیح رہبری کر سکے۔

گاندھی جی کی شخصیت ان کی ضمیر کی آواز اور خیالات کی روشنی میں ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر تھی جس کی مثال دبکتی ہوئی آگ سے دی جا سکتی ہے لیکن باہر اگرچہ وہ ایک امن پسند اور انسانیت نواز شخص تھے لیکن ان کے نظریات بلا لحاظ وقت اور زمانہ بالکلیہ اٹل تھے اِن کا بنیادی نظریات میں کسی قسم کی لچک یا تبدیلی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور جس طرح

خانی اختیار، حالات اور ماحول کے اثر کا شکار رہو جاتی ہے۔ کمی بیرونی یا ماحولیاتی اثر کو اپنے اندرونی خیالات میں خلفشار پیدا کرنے کا موقع نہیں دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے نظریات میں ایک چٹان سی تشکل رکھتے تھے۔ اور کسی تبدیلی کے خائف نہیں تھے جیسا کہ پنڈت جی نے لکھا ہے۔

"اس آدمی کے بارے میں کئی تصاویر میرے ذہن میں آتی ہیں۔ جسکی آنکھیں اکثر تمسخر اور غمگین نظاروں کا باعث نظر آیا کرتیں لیکن اس شخص کی تصویر جو میرے دماغ میں خصوصیت کی حامل نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھ میں عصا لئے ہوئے ۱۹۳۰ء میں نمک کی ستیہ گرہ کے دوران ڈنڈی کی جانب رواں دواں ہے جس کی حیثیت ایک عاشر کی ہے جو سچائی کی تلاش میں خاموش پرامن با مقصد مصمم ارادہ کے ساتھ بلا کسی خوف و خطر کے عواقب و نتائج کا خیال کئے بغیر ایک مقدس مقام کی طرف اپنا سفر جاری رکھے گا"

مہاتما گاندھی جی نے غیر مرکوز معاشی زندگی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ عوام الناس میں زیادہ تر لوگوں کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے اور ایک ایسے سماج کی تشکیل ہو سکے جس میں سماجی انصاف کو یقینی بنایا گیا ہو اور بلا لحاظ ذات پات و مذہب ملت انتہائی کمزور ترین شخص کو بھی آگے آنے کے موزوں اور مناسب و اصولی مواقع فراہم کئے گئے ہوں گاندھی جی نے نئی زمانہ اثر انداز ہونے والے صنعتی رجحان اور صنعتی ترقی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ عصر جدید کی صنعت کارانہ پالیسیوں کے نتیجہ میں اخلاقی اقدار و انسانی کردار زوال پذیر ہو رہا ہے لیکن اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ گاندھی جی نے صنعتی،

ترقی اور مشین کے استعمال کی مخالفت کی ہے بلکہ انسانی زندگی میں اخلاق
میدان میں مترتیب ہونے والے منفی رجحانات وا شرکی نکتہ چینی کی
ہے کیونکہ ترقی کے ساتھ اخلاقی پہلو زوال پذیر نہیں ہونا چاہیے -

دیہی آزادی پر زور دیتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ حقیقی
آزادی کا آغاز بنیادی طور پر ہمیشہ گاؤں کی سطح سے ہوتا ہے اور
ہر گاؤں میں عوامی طاقت جب مائل بہ ترقی ہو تو ایسی ترقی ہی
حقیقی جمہوریت کی راہ ہموار کرنے میں ممدو معاون ثابت ہو سکے گی
دستورِ ہند میں پنچایت راج کے نظام حکومت کو جو اہمیت دی گئی
ہے اس کی بنیاد دراصل گاندھیائی فلسفہ پر مبنی ہے نیز یہ بات مبنی
بر حقیقت ہے کہ اقتدار کی مرکوزیت میں عوام الناس کی شخصی آزادی
کو زبردست دھکا پہونچتا ہے اور ایک بامقصدی سماج پروان نہیں
چڑھ سکتا - اس اعتبار سے مہاتما گاندھی جی نے تقسیم محنت اور اخلاقی
پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت پر زیادہ زور دیا ہے تاکہ دیہی ترقی کی روشنی
میں سرسبزی و شادابی کے پیش نظر انسان کو مہمل و ناکارہ ہونے سے
بچایا جاسکے -

گاندھی جی اپنے مسیحائی نظریاتی پہلو کے علاوہ سماج میں
اخلاقی اقدار و کردار کی برقراری اور انسانیت کو روح کمال پر پہونچانے
کے لئے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے عمل پیرا رہکر انسانی زندگی کو
ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کے مواقع فراہم کرنے کے لئے مسلسل و پیہم کوشاں
رہے ہیں - صدیوں قبل شاعر کاندی داس نے کہا تھا کہ انسان دنیا میں ہر چیز
سے بلند و بالاتر ہے اور کوئی شئے بھی انسان سے بڑھ کر اہمیت والی نہیں ہے

گاندھی جی کی زندگی کا قریب سے جائزہ لیا جائے تو ان کے تجربات کی روشنی میں یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ سچائی اور حقیقت پسندی ہی انسانی زندگی کا وہ جزو لاینفک ہونا چاہیے جس کی بدولت انسان اپنی زندگی میں انتہائی نقطۂ عروج و کمال تک پہونچ سکتا ہے۔

گاندھی جی کے تصورات کے پردے میں انسان ایک ایسی روحانی طاقت ہے جس کے لئے اخلاقی ذمہ داری کے اعلیٰ معیار کی شدید ترین ضرورت ہے اور خود میں مضمر پیدا واری صلاحیت کو اجاگر کرنے اور محنت شاقہ کے ذریعہ خوشی حاصل کرنے کے طریقے سے کبھی بھی غفلت و لاپرواہی نہیں برتنا چاہیے۔ کارل مارکس نے عاملین پیدائش کے باہمی تعلق ربط ضبط اور انسلاک پر زور دیا۔ اور مہاتما گاندھی جی نے فرد کی انفرادی شناخت کی برقراری کے لئے شخصیت سے منسلک مجموعی اخلاق و کردار کے آئین و اقدار اور ضمیر کی آواز کو لازمی گردانا ہے جس کا سرچشمہ انسانی زندگی کی روزہ مرہ معروفیت و مشغولیت کے میدان میں کاروباری وسعت کے درمیان سماجی ذمہ داریوں کو تسلیم کرنے میں پایا جاتا ہے

یہی وہ صحیح طریقہ ہے جس کو انسانی زندگی میں روبہ عمل لاکر انسانی زندگی میں ترقی و خوشحالی کی راہوں کو ہموار کیا جا سکتا ہے گاندھی جی نے اپنی ساری زندگی قومی آزادی کے حصول کے لئے وقف کردی اور سچائی کے اصولوں پر کاربند رہنے کے نظریہ میں مستقل مزاجی کے پیش نظر اپنے خوابوں کی تکمیل اور تعبیر "سوراج سودیشی" اور دیہی ترقی کے قدرتی حق کے درمیان عدم تشدد کے اصولوں پر ثابت قدمی میں نظر آئی اور ان کو اپنے مقاصد میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوئی۔ گاندھی جی اپنے ہم عصر محب وطن ساتھیوں

باقی صفحہ ۴۳

ماہین علی حسرت
۹-۱۴ احمد پورہ
نظام آباد (اے۔ پی)

غزل

ذرا چھوڑ کر تو شوشہ دیکھ
اور پھر شہر میں تماشہ دیکھ

پوچھیے مت مزاج کی شوخی
کبھی تولہ کبھی ماشہ دیکھ

مل گیا جرم تیرا اے قاتل
اپنے دامن کا کوئی گوشہ دیکھ

سنگ پھینکے اگر کسی جانب
پہلے گھر کا بھی اپنے شیشہ دیکھ

ہاتھ اٹھا تو لیا ہے خنجر پر
اپنے ہاتھوں کا پہلے رعشہ دیکھ

یاس بدلے گی آس سے حسرت
جانب رب ہی تو ہمیشہ دیکھ

شبیر احمد خان انور
عادل آباد

غزل

عشق نے کہیں اگر سر نہیں جھکایا ہے
گر کہیں جھکایا ہے پھر نہیں اٹھایا ہے

میرے گاؤں سے جب بھی کوئی شہر آیا ہے
اس نے میرا چین بھی اپنے ساتھ لایا ہے

گر گیا ہے زخمی خود، ہم کو ہی پلٹ کر وہ
آسمان پر پتھر، ہم نے جب چلایا ہے

کل بھی میں پریشان تھا جب بنا تھا گھر کوئی
آج بھی پریشان ہوں۔ جب سے گھر بنایا ہے

دل نے عشق میں پھر بھی حوصلہ نہیں ہارا۔
جیسا چاہا جب چاہا۔ اسکو آزمایا ہے

صورت حرم جب سے ہو گیا ہے میرا دل
دل میں اس کی یادوں نے جب سے گھر بنایا ہے

بے سبب یہاں پھر اک ہو گیا ہے ہنگامہ
میں نے اس کو دیکھا تو وہ بھی مسکرایا ہے۔

جب بھی بے نیازانہ، وہ قریب سے گذرا۔
دل نے اسکو وعدہ بھی، یاد کبھی دلایا ہے

راستے کے پتھر خود، ہو گئے ہیں شرمندہ
ٹھوکروں نے جب میرا حوصلہ بڑھایا ہے

میں نے جو بھی کھویا ہے وہ بھی سب اسی کا تھا
یہ بھی سب اسی کا ہے میں نے جو بھی پایا ہے۔

تنگ آ گیا ہوں میں انور اک مشین میں تب سے
اپنے شہر میں مجھ کو، جب سے کوئی لایا ہے

پروفیسر کلیم ضیاء
بمعرفت نورانی مسجد انصار نگر
مومن پورہ ۔ ناگپور ۴۴۰۰۱۸
مہاراشٹرا

غزل

تھا خوفزدہ شہر کا ہر آدمی شر سے — ہم اتنے تھے خود غرض کہ نکلے نہیں گھر سے
آواز مرے درد کو افشاء نہ کرے گی — جو پوچھنا ہے پوچھ لے تو دیدۂ تر سے
نفرت کی قبا میں ہیں نہ الفت کے ہیں پردے — اترے گا کسی روز یہ سودا مرے سر سے
اے شب ترے جلووں کی مقدر کی قسم ہم — پوچھیں گے ترا حال کسی روز سحر سے
یہ خام خیالی کہ ہے ملعون فقط وہ — شیطان اماں مانگے ہے ہر روز بشر سے
نفرت کی سدا آگ بجھاتا رہا جو شخص — نکلا ہے مگر آج دھواں اس کے ہی گھر سے
صحرا کی دھوپ پاؤں کے چھالے دلِ سوزاں — پوشیدہ ہیں سب لیسے مناظر بھی نظر سے
کیوں آج فضائیں ہیں معطر مرے دل کی — ہے کون وہ گزرا جو فضا آج ادھر سے

آزادی کا پیغام ضیاؔ مل گیا لیکن
اُف! طائرِ ہستی مرا محروم ہے پر سے

★

ماہنامہ حیدرآباد
شاداب

جلد [۱۱] شمارہ [۲]
فروری ۱۹۹۴ء
قیمت: -/6 روپیہ

زر تعاون

ہندوستان سالانہ :	65 روپیے 2 سال	120 روپیے تاحیات	1500 روپیے
خلیجی ممالک ؍	200 ؍	360 ؍	3700 ؍
امریکہ ؍	40 ڈالر ؍	70 ڈالر ؍	700 ڈالر
انگلستان ؍	25 پونڈ ؍	45 پونڈ ؍	400 پونڈ
پاکستان ؍	175 پاکستانی روپیے ؍	300 پاکستانی روپیے ؍	3000 پاکستانی روپیے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147 - 5 - 11 ریڈ ہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس گھانسی بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب 147 - 5 - 11 ریڈ ہلز حیدرآباد ۔ سے شائع کیا۔

فہرست

مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل
امیر ملت - آندھرا پردیش

نعت شریف

ہر ادا معجزہ ہر صدا معجزہ
ہیں سراپا رسولِ خدا معجزہ

مسکرائے تو دانتوں سے کرنیں پھوٹیں
نور خیر الوریٰ بن گیا معجزہ

ابنِ خطاب فاروق اعظمؓ بنا
اک نگاہ کرم کا یہ تھا معجزہ

سیرتِ مصطفیٰ، صورتِ مصطفیٰ
معجزہ، معجزہ، معجزہ، معجزہ

نعت پاک نبیؐ اور عاقل لکھے
یہ بھی ہے میرے سرکارؐ کا معجزہ

صلاح الدین نیر

نعت شریف

طے نہ ہو یہ دید کا لمبا سفر یا مصطفیٰ
گنبدِ خضرا پہ ٹھہری ہے نظر یا مصطفیٰ

کعبۂ دل ہے مرا اوّل بھی آخر بھی یہی
اٹھ کے میں جاؤں یہاں سے کس کے گھر یا مصطفیٰ

فرش سے عرش بریں تک فاصلہ کچھ بھی سہی
نقشِ پا ہیں آپ کے حدِّ نظر یا مصطفیٰ

جب نہ آیا کچھ سمجھ میں بے گناہی کا حساب
چھپ گئی دامن میں آکر چشمِ تر یا مصطفیٰ

آپ سے پہلے ہی آجاتی ہے خوشبو آپ کی
آپ کی آمد کی دل کو ہے خبر یا مصطفیٰ

دید تو اک مرحلہ ہے جسرتِ دیدار میں
کیسے کیسے ہو گئے ہیں دیدہ ور یا مصطفیٰ

دیجئے قدموں میں اب نیر کو بھی تھوڑی جگہ
اک نہ اک دن آئے گا وہ راہ پر یا مصطفیٰ

ڈاکٹر ابوطاہر سعید

جذب و کیف

دل دیا قدرت نے دردِ عشق کے قابل مجھے
زندگی کی نعمتیں سب ہو گئیں حاصل مجھے

کشتیٔ عمرِ رواں اب ڈوب جائے غم نہیں
(طرح) "ارضِ یثرب کا بلاوا ہے آج دریا دل مجھے"

آئی ہے دوشِ صبا پر نکہتِ گیسوئے دوست
مل گیا آخر دعاؤں کا میری حاصل مجھے

ہے کچھ ایسی کیفیت میرے دلِ خوں گشتہ کی
خود بخود حلقے میں لے لیتے ہیں اہلِ دل مجھے

جب لیا نامِ مدینہ ہچکیاں کچھ تھم گئیں
کر رہا ہے یاد کیا سرکار کی منزل مجھے

راستے یثرب کے میں نے طے کئے ہیں خواب میں
دیکھئے دکھلائے گا کیا میرا مستقبل مجھے

گنبدِ خضرا تصور میں جو ابھرا طاہرہ
پھیکا پھیکا سا نظر آیا مہِ کامل مجھے

رئیس اختر

نعت شریف

دل و جاں پہ فیضِ دوام آپ کا ہے
زباں پر شب و روز نام آپ کا ہے
خدائی کا ہر اہتمام آپ کا ہے
خدا بھی تو خیر الانام آپ کا ہے
ادا کر دیا فرض دستِ دعا نے
دعا کارگر ہو یہ کام آپ کا ہے

بیاں کیا ہو مفہوم صبحِ ازل کا
ضیا پاشِ حسنِ تمام آپ کا ہے
خدا آپ کا آپ اُس کے ہیں مظہر
کلامِ خدا بھی کلام آپ کا ہے
ہوئی ختم سدرہ پہ جبریل کی حد
بہت اس سے اونچا مقام آپ کا ہے

ضرورت ہی کیا ہے اُسے سروری کی
رئیسِ حزیں جب غلام آپ کا ہے

"شاداب"
ڈاکٹر محبوب راہی۔
بارسی ٹاکلی
ضلع اکولہ مہاراشٹرا۔

نعت شریف

کس طرح نعتِ نبیؐ مدحِ پیمبرؐ لکھوں
میری اوقات بھلا کیا ہے میں کیونکر لکھوں
ماہ و خورشید میں وہ نور وہ تابانی کہاں
جو انہیںؐ ماہِ مبیں مہرِ منور لکھوں

ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے میں مثال ان جیسی
کون ایسا ہے جسے انؐ کے برابر لکھوں
بارہا کی ہے خود اللہ نے جن کی توصیف
انؐ کی توصیف میں لکھوں بھی تو کیونکر لکھوں

دونوں عالم ہیں تب و تاب سے جن کی روشن
سر سے پا آپ کو اک نور کا پیکر لکھوں
قسم اللہ کی کہنا ہو جو اللہ کے بعد
ساری مخلوق سے میں آپ کو برتر لکھوں

چوم کر نقشِ کفِ پا کو میں ان کے راہی
دونوں عالم کا انھیں ہادی و رہبر لکھوں۔

عزیز بھارتی۔
11-3-543 ۔
ملے پلی حیدرآباد

نعت شریف

میری بخشش کا ہیں بس آپ وسیلہ آقا
آپ سے ہٹ کے نہیں ہے کوئی دوجا آقا

غیر ممکن ہے کرے تشنہ لبی کا شکوہ،
جس کو مل جائے گا کوثر کا پیالہ آقا

میری نظروں کی یہ تقدیر نہیں تو کیا ہے
میری نظروں میں بس آپ کا روضہ آقا

نرم ہوتے رہے پتھر بھی قدم کو چھوکر
معجزہ آپ نے ایسا بھی دکھایا آقا

اس کی قسمت میں رہی خار بنے خار اجل
راہ میں آپ کی جس نے تھا بچھایا آقا

اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں مطلوب عزیز
آپکے فیض کا مل جائے جو صدقہ آقا۔

مومن خاں شوق
اشرف ولا۔ روبرو جامع مسجد
ٹلے پلی۔ حیدرآباد ۱۲

نعت شریف

حق پرستی کے ہیں اعلان رسولِ عربی۔
میرے معبود کے فرمان رسولِ عربی

آج امت ہے پریشان رسولِ عربی۔
کیجیے مشکلیں آسان رسولِ عربی

ہو جو دیدارِ مدینہ تو مقدر جاگے
ہے میرے دل کا یہ ارمان رسولِ عربی۔

آپ سے ہٹ کے نہیں ہے کوئی عنوان آقا
آپ ہی دین کے عنوان رسولِ عربی

ہوں گنہ گار مگر آپ کا ہوں شیدائی
آپ پر ہے مرا ایمان رسولِ عربی

اے مصطفےٰ آپ نے کیا کیا نہ کیا
آپ کا ہے یہی فیضان رسولِ عربی

کچھ نہیں چاہیے بس پاس بلا لو مجھ کو
کیجیے شوق پہ احسان رسولِ عربی۔

محمد بشیرالدین امجد
چار قندیل۔ کھنا پورہ
حیدرآباد۔

نعتِ شریف

بتاؤں میں کیسے کہ کیا دیکھتا ہوں بشکلِ محمدؐ خدا دیکھتا ہوں۔
گذر میری یارب ہو سوئے مدینہ تصور میں طیبہ سدا دیکھتا ہوں۔
تڑپ اے مرے دل کی بجھے گی نہ ہرگز اسی در پہ دل کی دوا دیکھتا ہوں
نظاروں کی کوئی نہیں مجھ کو حاجت جمالِ رسولِ خدا دیکھتا ہوں
رہِ گمرہی پر بھٹکتی ہے اُمت بتا اے مرے مالک یہ کیا دیکھتا ہوں

نظر جب سے ہے سبز جالی پہ امجد
ہر اک روز، روزِ جزا دیکھتا ہوں۔

رؤف خیر
دلاور شاہ نگر
وسالہ بازار گولکنڈہ حیدرآباد۔

نعت شریف

جتنے رستے ہیں سب پُر خطر مصطفیٰ
آپ کی رہ گزر رہ گزر مصطفیٰ
وار دی جان بھی آپ پر مصطفیٰ
اب عُمر ہو گئے ہیں عُمرؓ مصطفیٰ

سب کھرے اور کھوٹے کی پہچان دی
آپؐ نے دی ہمیں وہ نظر مصطفیٰ
آنکھ پر بوجھ تھے ٹمٹماتے دیے
آپؐ آئے تو آئی سحر مصطفیٰ

ہے مدینہ ادھر اور کعبہ اُدھر
ہے ادھر گھر اُدھر مستقر مصطفیٰ
ڈھل گئے چاند تاروں میں ذرے کئی
بے خبر جب ہوئے باخبر مصطفیٰ

آپؐ کا ساتھ ہے خیر ہی خیر سا
اب کہاں شر کا کوئی گزر مصطفیٰ

تشفیع اقبال
حجرہ کلثوم پورہ حیدرآباد ۔

نعت شریف

آپ ہیں احمدِ مختار مدینے والے ؐ
ہم ہیں رحمت کے طلبگار مدینے والے ؐ

میری دُنیا تو جہنم ہی بنی میرے لئے
میری عقبیٰ بنے گلزار مدینے والے ؐ

جرأتِ دید کا اظہار تو کرلوں لیکن
میری قسمت میں ہو دیدار مدینے والے ؐ

نام سے آپؐ کے نسبت تو بڑی ہے میری
ہوں غلام آپؐ کا سرکارؐ مدینے والے

آپؐ کی زلفِ معنبر کی مہک کے صدقے
تا ابد ہم رہیں سرشار مدینے والے ؐ

آپؐ ہیں شافعِ محشر تو نہیں فکرِ تشفیع
آپؐ ہیں سب کے مددگار مدینے والے ؐ

غلام محی الدین خاں کیف
جلال کوچہ، حیدرآباد۔

نعت شریف

دل غم سے ہو گیا ہے مجبور یا محمدؐ
اے کاش زندگی ہو، مسرور یا محمدؐ

موسیٰ کی طرح مجھ کو غش تو کبھی نہ آیا۔
تھا روضۂ مبارک یا طور یا محمدؐ

اُس در کی جستجو ہے اس در کی آرزو ہے
جس در پہ خود جبیں ہو، مغرور یا محمدؐ

مجبور بے وسیلہ معصوم اُمتی ہیں!
نسبت پہ آپ کی ہیں مغرور یا محمدؐ

ہم بیکسوں کی جانب کچھ رحمت کرم ہو
الطاف آپ کے ہیں مشہور یا محمدؐ

ہر وقت کیف پر ہو نظر کرم کا سایہ
ہر چند آپ سے ہے وہ دور یا محمدؐ

سکندر عرفان
حیدریہ منزل، رامیشور نگر
کمنڈوا (ایم پی)۔

نعتِ رسولِ عربی

دل تمہارا ہے طلبگار رسولِ عربیؐ
بخش دو دولتِ دیدار رسولِ عربیؐ

اپنی رحمت سے نوازا ہے خدا نے اسکو
جو محبت میں ہو سرشار رسولِ عربیؐ

رشک کرتی ہیں۔ زمانے کی نگاہیں جس پر
ایسی امت کے ہیں۔ غم خوار رسولِ عربیؐ

روشنی بخش دو ظلمت میں کھڑا ہوں آقا
آپ ہیں مطلعِ انوار رسولِ عربیؐ

کثرتِ غم سے چھلک آئی ہیں آنکھیں میری
گردشوں کا ہوں ستایا ہوا رسولِ عربیؐ

اپنے دکھ درد چلو چل کے سنائیں انکو
بےکسوں کے ہیں مددگار رسولِ عربیؐ

اپنے عرفان پہ اب مجھے عنایت کی نظر
اے مرے مالک و مختار رسولِ عربیؐ

ڈاکٹر محمد منشا الرحمن خان منشاؔ

حرفِ دُعا

میں کب یہ کہتا ہوں یا رب خوشی ہی دے مجھکو
بقدرِ ظرف غمِ دائمی ہی دے مجھکو

جو ہر قدم پہ اندھیروں میں کام آتی ہے
سُلگتے زخموں کی وہ روشنی ہی دے مجھکو

کس طرح مجھے رکھنی ہے آبروئے حیات
ہجومِ درد میں خندہ لبی ہی دے مجھکو

اسی سے گتھیاں سلجھاؤں گا مقدر کی
نہیں کچھ اور تو وحشت سری ہی دے مجھکو

مقامِ خواجگی کا میں اہل نہیں نہ سہی
شعورِ شغلۂ بندگی ہی دے مجھکو

کوئی بھی شئے مجھے اس کے سوا نہیں ہے عزیز
دل و نگاہ کی پاکیزگی ہی دے مجھکو

میں چاہتا ہوں کہ آگاہ مجھ سے ہو جاؤں
خود آپ اپنی خبر سرسری ہی دے مجھکو

ترے غزل سے پاتے ہیں لوگ کیا کیا کچھ
تو حسبِ منشاؔ غمِ آدمی ہی دے مجھکو

رشید الدین
ایم اے (عثمانیہ)

مرزا شکور بیگ
ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے

مرزا شکور بیگ جامعہ عثمانیہ کی قدیم نسل سے تعلق رکھتے ہیں زمانہ طالب علمی میں بے حد ذہین، شعر سرا اور ظریف رہ چکے ہیں۔ مرزا ظفر الحسن نے اپنی کتاب "ذکر یار چلے" میں ان کی اس زمانہ کی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں جامعہ عثمانیہ سے زبان اردو قانون کی ڈگری (۱۹۳۵ء) لینے کے بعد وہ پریکٹس کرنے کے لئے ورنگل چلے گئے اور وہاں وکالت میں بھی خوب نام اور پیسہ کمایا اور بڑے شاہانہ ٹھاٹھ کی زندگی گزاری۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مرزا شکور بیگ مغل ہیں ان کے آباد اجداد کسی زمانہ میں دلی سے حیدرآباد آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے چنانچہ وہ حیدرآباد ہی کے محلہ فتح دروازہ میں ۱۵ ستمبر ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے اس طرح آئندہ ستمبر کی ۱۵ تاریخ کو وہ پورے ۷۷ سال کے ہو جائیں گے باوجود ضعیفی کے وہ اب بھی گھر سے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔

مرزا شکور بیگ سیاست سے بھی وابستہ رہے وہ کانگریس پارٹی کے باضابطہ رکن رہے اور مسلسل دو میقاتوں کے لئے اپنے شہر ورنگل سے [illegible]

ساز اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے نمائندگی بھی کی۔ وہ تلنگانہ ڈیولپمنٹ کونسل کے صدر نشین بھی رہے۔ اس طرح انہوں نے سیاست میں بھی اچھا نام کمایا۔

مرزا شکور بیگ زمانۂ طالب علمی سے ہی شاعری کرتے تھے لیکن جوانی میں طبیعت کی مناسبت سے ان کا رنگ مزاحیہ تھا۔ اپنی شاعری کے بارے میں وہ بڑی سادگی سے اعتراف کرتے ہیں جو خود لکھتے ہیں:

"میں نہ اردو ادب کا طالب علم رہا نہ فن عروض سے واقف ہوں۔ ایک فطری انداز سے الفاظ کو جوڑ کر "کلام موزوں" سنا دیتا ہوں۔ اس خود رو شاعری میں فنی غلطیاں ہونا تعجب کی بات نہیں میں ان غلطیوں سے ناواقف ہوں۔ اس لئے قابلِ معافی ہوں۔ مگر اس کلام میں پرخلوص میری محبت، اور میرے آنسو شامل ہیں۔ تاثر خدا کی دین ہے اسے وسیلہ نجات سمجھتا ہوں" آخری جملے ان کی نعتیہ شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

پچھلے بیس پچیس سال سے ان کی زندگی میں ایک غیر معمولی تبدیلی آئی اور وہ جنہوں نے ظریف اور مزاحیہ شاعر سے ایک دم سنجیدہ اور مذہبی ہو گئے اور عشقِ رسول میں بری طرح گرفتار ہو گئے۔ غالباً یہ تبدیلی ان میں حضرت عبداللہ شاہ صاحب مرحوم و مغفور کے مرید ہونے کے بعد آئی۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ نعت میں نے اپنے مرشد کی ہدایت پر کہنی شروع کی۔ اب تو ان کے پاس نعتوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے اور اسکو وہ وسیلہ نجات سمجھتے ہیں۔

قبل ازیں ان کی مزاحیہ شاعری کا ایک مختصر مجموعہ "ترانے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کی ایک جلد ۱۹۶۰ء میں ان کے بڑے فرزند مرزا مظفر بیگ نے جو پچھلے تقریباً ۳۰ سال سے لندن میں منتقل سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں ازراہ کرم عنایت کی تھی جب کہ وہ میرے ہی دفتر میں اردو کے سینیر مترجم تھے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ مضامین شکور بیگ کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں زیادہ تر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی فرمائش پر لکھے گئے مضامین یا تقاریر شامل ہیں۔"

لیکن یہ سب قصہ پارینہ ہے وہ تو اب عشق رسول میں اتنے مستغرق ہیں کہ انہیں سوائے مدینے کی گلیوں کے اور کچھ نہیں سجھائی نہیں دیتا۔ اور یہ تمنا ہے کہ ان کا دم بھی مدینے ہی میں نکلے جب دل کی تنگی بہت بڑھ جاتی ہے اور بے قراری چین نہیں لینے دیتی تو نعت کہہ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا کرتے ہیں۔ بار بار حج کے بہانے مدینے کے چکر کاٹتے ہیں۔ اور اس امید میں جاتے ہیں کہ اب کی بار واپس نہیں آؤں گا اور مدینہ کی خاک ہی کا پیوند ہو جاؤں گا

مرزا شکور بیگ ۱۹۶۰ء میں سب سے پہلے حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اور بعد فراغت حج مدینہ کی زیارت بھی کی اس کے بعد پانچ سال تک انہیں حج کو جانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی لیکن ۱۹۶۷ء سے ۱۹۹۳ء تک ہر سال وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کا اصل منشا زیارت دیار مدینہ ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں

"جاتا ہوں مدینہ کو حج کے بہانہ سے"

وہ اب تک بفضل تعالیٰ ۲۸ حج کر چکے ہیں۔

شہر مدینہ میں انہیں بے پناہ مسرت حاصل ہوتی ہے اور وہ
یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ ع
ضعف ہر جگہ محسوس ہوتی ہے مگر مرزا۔
مدینے میں طبیعت کچھ جواں معلوم ہوتی ہے

حال ہی میں اِن کی نعتوں کے مجموعہ "خوشبوئے درود" کی
حیدرآباد میں ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ میں رسم اجرا دھوم میں آئی نشست
فرشی تھی۔ اور باوجود بارش کے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ بزم عثمانیہ جدّہ
نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا اور اس کی قیمت یا ہدیہ کچھ
نہیں رکھا۔ بلکہ یہ شرکا میں مفت تقسیم کی گئی۔ قیمت کے آگے لکھا ہے
"مفت" پھر آگے بریکٹ میں لکھا ہے "مصنف کے لئے دعائے خیر
کیجئے" اور وہ دُعا یہ ہے کہ مصنف کا دم مدینے میں نکلے اور جنت
البقیع میں تدفین ہو۔ اسی دُعا پر کون ہے جو آمین نہیں کہے گا۔ چنانچہ
میں بھی خدا سے یہی دُعا کروں گا۔ کہ یا خدا تو مرزا شکور بیگ کی یہ دُعا
قبول فرما۔

رسم اجراء کے اس جلسہ میں یوں تو کئی مقررین (بشمول عارف قریشی
معتمد بزم عثمانیہ جدّہ) نے تقاریر کیں۔ یہ کہنا میرے خیال میں سب سے
اچھی تقریر میرے دوست ڈاکٹر صادق نقوی کی رہی جنہوں نے کہا کہ "
نعت کہنا ایک عبادت ہے جس کا ذکر خدا کرتا ہے اگر اس کا ذکر اور

بندہ کرے تو وہ عبادت ہو جاتی ہے"

اردو میں نعت گوئی کی روایت بہت پرانی ہے یوں تو اردو کے ہر شاعر نے ایک نعت کہی ہے لیکن اس میں محسن کاکوروی کا ایک خاص مقام ہے۔ حیدرآباد میں بھی شائق حیدرآبادی، معز ملتانی اور ان کے شاگرد بے ہوش محبوب نگری (جو بفضل تعالیٰ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں) اچھے نعت گو گذرے ہیں۔ اس ضمن میں آخری نام مرزا شکور بیگ کا آتا ہے۔

یہ انیس کی ایک رباعی ہے ؎

مضمونِ بلند و بالا لامکاں سے آئے۔
ہم توڑ کے تارے آسمان سے لائے
ہر شعر اپنی جگہ خوب کہا۔۔!
لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے۔

یہ تاثیر نعت کے شعروں میں ہمیں مرزا شکور بیگ کے پاس ملتی ہے جو انہیں رسول پاکؐ کا صدقہ کہتے ہیں۔ عشق رسول میں وہ شعر ڈوب کر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے صدے سادے اور آسان و سہل اشعار میں بے حد تاثیر آگئی ہے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

موت سے نہیں ڈرتا یہ دعا ہے مولیٰ۔۔!
وقت موت جب آئے میں رہوں مدینے میں

بس اب یہ دعا ہے کہ طیبہ میں مرزا
یہیں میں رہوں اور یہیں موت آئے

مرزا فراقِ یار کا مارا ہے دوستو
اس کا علاج کچھ نہیں دیدار کے سوا

خدا کی سرزمیں میں دید کے قابل مدینہ ہے
میری حسرت، میرا ایماں، میرا دل مدینہ ہے

مرزا کرم یہ ہے کہ مجھے نعت کے لئے
آجاتے ہیں زباں پہ کلمے نئے نئے

خوشی نہیں ہے مگر آرزو ہے جینے کی
نصیب تاکہ زیارت ہو پھر مدینے کی

سُنا ہے اب تو کسی کام کا نہیں مرزا
اسے تو آٹھ پہر یاد ہے مدینے کی۔

دیکھتے ہی طیبہ کی یاد آنے لگتی ہے
تم تو حیز سے مرزا یادگارِ طیبہ ہو۔

واللہ نظر والوں کیلئے طیبہ کی سکونت سہل نہیں
ہو جائے نہ کوئی بے ادبی ہر وقت یہ ہیبت ہوتی ہے

مدینے میں مرنے کی عزت عطا ہو
غلام اب جو آئے تو واپس نہ جائے

شاعری کرتے تھے پہلے مرزا
اب فقط نعت کہا کرتے ہیں۔

ہر بڑے نے بڑا کہا ہے انھیں
ہیں وہ کتنے بڑے خدا جانے۔

نعت گوئی بہت احتیاط چاہتی ہے اگر انسان اس میں غلو کر جائے تو شریعت کی رو سے یہ کفر کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔۔ مرزا کے پاس بھی ہمیں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

جب بھی سجدے میں جاتا ہوں تو اس کو کیا کروں
ان کی چوکھٹ ہی رہا کرتی ہے سر کے سامنے

غرض مرزا شکور بیگ کی نعتیہ شاعری سرتاپا خراجِ رسولؐ ہے انھیں حضورؐ سے اتنا عشق ہے کہ وہ اس میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کہیں اِن کی یہ بات شریعت کی رو سے قابلِ گرفت تو نہیں ہے ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ مرزا شکور بیگ بڑے شوق سے مدینہ جاتے ہیں۔ اور وہاں پریشان رہتے ہیں کہ کہیں ان سے

اِس شہر میں کوئی بے ادبی نہ سرزد ہو جائے۔ سنا ہے وہاں ان کا یہ معمول ہوتا ہے کہ صبح ناشتے کے بعد وہ اپنی رباط سے نکلتے ہیں۔ (جو گنبد خضریٰ کے قریب ہی واقع ہے۔) اور گنبد خضریٰ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ اتنی دیر تک وہاں کھڑے رہتے ہیں کہ پاؤں جواب دے جاتے ہیں۔ اور وہ نیچے گر جاتے ہیں۔ لوگ اٹھا کر انہیں ان کی رباط میں لے جاتے ہیں۔ وہاں آرام لینے کے بعد پھر دوسرے دن وہ یہی عمل دہراتے ہیں۔ تو یہ حال ہے۔ اِن کے عشقِ رسول کا۔

آخر میں اس دعا کے ساتھ اپنا یہ مضمون ختم کرتا ہوں کہ اللہ ایسے بزرگ و ضعیف شاعر کی خواہش پوری کرے اور ان کا دم مدینے میں نکلے اور وہ جنت البقیع میں سپرد خاک ہوں۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی انہیں حضورؐ کا قرب حاصل رہے۔

(آمین)

(مرزا مظہر بیگ)

خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اگر اس کے بعد بھی کوئی اسلامی تصوف کو ویدانت سے مربوط کرے تو یہ اسلامی تصوف سے بے بہرہ ہونے کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے

برین عقل و دانش بباید گریست

کے۔ ایم عارف الدین
سیکرٹری مدینہ گروپ آف ایجوکیشنل انسٹیٹیوٹز
حیدرآباد۔

رمضان المبارک
قرآن اور احادیث کی روشنی میں

(رہنمائے دکن کے "استقبال رمضان المبارک سپلیمنٹ" کو سید فاضل حسین پرویز نے ترتیب دیا، کے ایم عارف الدین نے رمضان المبارک قرآن اور احادیث کی روشنی میں مرتب کیا، رہنمائے دکن کے شکریہ کے ساتھ اسے شاداب کے قارئین کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ... (بقرہ ۱۸۳)

اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ، چند روز ہیں گنتی کے، مہینہ رمضان کا جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینے کو ضرور روزے رکھے اس کے اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا

(بقرہ ۱۸۵)

روزہ اِس امت پر بھی فرض ہے اور اگلی امتوں پر بھی فرض تھا کیونکہ یہ انسان کی قوت بہیمی کو اس کی روحانی اور ملکوتی قوت کے تابع اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلہ میں نفس کی خواہشات اور پیٹ اور شہوت کے تقاضوں کو دبانے کی عادت ڈالنے کا خاص ذریعہ اور وسیلہ ہے اس کا نام تقویٰ ہے جو بندہ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک اور حلال چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے وہ خداوند قدوس کی حرام کی ہوئی چیزوں کی طرف کیسے جا سکتا ہے ..؟ اس آخری امت کے لیے جس کا دور دنیا کے آخری دن تک ہے سال میں ایک مہینہ کے روزے فرض کیے گئے ہیں۔ اور روزہ کا وقت طلوع سحر سے غروب آفتاب تک رکھا گیا ہے بلاشبہ یہ مدت اور یہ وقت مناسب ترین اور نہایت معتدل وقت ہے پھر اس کے لیے مہینہ وہ مقرر کیا گیا ہے جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا، قرآن مجید انسانوں کے لیے ہدایت ہے اس لیے اس مہینہ کو قرآن کریم سے خصوصی مناسبت ہے اس لیے اس مہینہ کو قرآن کا مہینہ کہنا چاہئیے اس مہینہ میں قرآن کریم کی تلاوت کثرت سے ہوتی ہے اس مہینہ میں بے حساب برکتوں اور رحمتوں والی رات لیلۃ القدر بھی ہوتی ہے پھر اس مہینہ میں دن کے روزوں کے علاوہ رات میں بھی ایک خاص عبادت کا عمومی و اجتماعی انتظام قائم کیا گیا ہے یہ تراویح کی نماز ہے دن کے روزے کے ساتھ رات کے تراویح کی برکت مل جانے سے اس مبارک مہینہ کی نورانیت اور تاثیر میں وہ اضافہ ہو جاتا ہے جس کو اپنے ادراک اور احساس کے مطابق ہر وہ بندہ محسوس کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کا نور عطا فرمایا ہے۔

فرضیت روزہ :— رمضان المبارک سنہ ۲ ہجری میں روزے فرض ہوئے اور سال میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھنا اسلام کا چوتھا رکن قرار پایا۔ رمضان کا مہینہ قمری حساب پر رکھا گیا ہے کیونکہ جب نصف دنیا پر سردی کا موسم ہوتا ہے تو دوسرے نصف حصہ پر گرمی کا موسم ہوتا ہے قمری مہینہ ادل بدل کر آنے سے کل دنیا کے مسلمانوں کے لئے مساوات قائم کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی شمسی مہینہ مقرر کر دیا جاتا تو نصف دنیا کے مسلمان ہمیشہ سرما کی سہولت میں اور نصف دنیا کے مسلمان ہمیشہ گرما کی سختی اور تکلیف میں رہا کرتے اور یہ امر عالمگیر مذہب کے اصول کے خلاف ہوتا۔

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

میری امت کو رمضان شریف کے بارے میں ۵۔ چیزیں مخصوص طور طور پر دی گئی ہیں۔ جو پہلی اُمت کو نہیں ملی ہیں۔ (۱) روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے (۲) ان کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں۔ اور افطار کے وقت تک کرتی رہتی ہیں (۳) جنت ہر روز ان کے لئے آراستہ کی جاتی ہے، پھر حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ قریب ہے کہ میرے نیک بندے دنیا کی مشقتیں اپنے اوپر سے پھینک کر تیری طرف آئیں (۴) اسمیں سرکش شیاطین قید کر دئیے جاتے ہیں۔ (۵) رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کے لئے مغفرت کی جاتی ہے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یہ شب مغفرت شب قدر ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ دستور ہے مزدور کو کام ختم کرنے کے وقت مزدوری دی جاتی ہے (ابو ہریرہؓ ترغیب

و ترہیب ہے) ۔ ٥ یہ برکت و رحمت اور صبر کا مہینہ ہے صبر کا بدلہ جنت ہے یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اس مہینہ میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے جس نے اس مہینہ میں کسی روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے افطار کرایا۔ تو اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا۔ اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کمی کی جائے اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس کو بھی دے گا۔ جو پانی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کو افطار کرا دے (سلمان فارسی) شعیب الایمان) ۔ ٥ ۔ روزہ دار کے لئے دو مسرتیں ہیں۔ ایک افطار کے وقت دوسری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو چاہیئے کہ وہ بے ہودہ اور فحش باتیں نہ کرے اگر کوئی اس سے گالی گلوچ یا جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں ۔۔ ٥ سحری میں برکت ہے اسے ہرگز نہ چھوڑے اگر کچھ نہیں تو اس وقت پانی کا ایک گھونٹ ہی پی لیا جائے کیوں کہ سحری کھانے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے ان کے لئے دعا کرتے ہیں۔ (ابو سعید خدری رضؓ مسند احمد) جو لوگ رمضان کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھیں گے ان کے گذشتہ سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (ابوہریرہؓ بخاری مسلم) ۔۔ ٥ اس مہینہ میں ایک ایسی رات ہے جو ہزاروں مہینوں سے افضل ہے جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا وہ سارے ہی خیر سے محروم رہ گیا (انسؓ مشکوٰۃ)

روزہ کی جزاء :۔ جزاء معنی بدلہ، عوض۔ اسلام

کی بنیادی تعلیمات میں ایمان، نماز، اور زکوٰۃ کے بعد روزہ کا درجہ ہے اسلام میں پورے مہینہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ اور جو شخص بلا کسی عذر کے یا مجبوری کے رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑ دے تو وہ بہت سخت گناہگار ہے ایک حدیث میں ہے کہ بندے کے سارے نیک اعمال کی جزا کا ایک قانون مقرر ہے اور ہر عمل کا ثواب اسی مقررہ حساب سے دیا جائے گا۔ لیکن روزہ اس عام قانون سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ بندہ روزے میں میرے لئے سب کام یعنی اپنا کھانا پینا اور اپنے نفس کی شہوت کو قربان کرتا ہے۔ اس لئے روزہ کی جزا بندے کو میں خود براہِ راست دونگا۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مر جائے اور اس پر روزوں کی قضا واجب ہو تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھ لے۔ حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اگر تیس آدمی اس کی طرف سے ایک دن کا روزہ رکھ لیں تو کافی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب رمضان آتا ہے جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور دوسری روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دئیے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری اردو ج ۱)

(بشکریہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

. محترم المقام حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی صاحب قبلہ
سجادہ درگاہ گلبرگہ شریف.

تصوف - ایک تاثر

صوفیائے کرام نے تصوف کو احسان کا نام دیا ہے۔ تزکیۂ نفس تصفیۂ قلب اور مراقبہ ہی سے مدارج سلوک طے کئے جاتے ہیں.

بڑے تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگوں نے تصوف کو غیر اسلامی فکر و کردار کا نام دیا ہے حالانکہ تصوف کی بنیاد، قرآن حکیم اور حدیث سرچشمہ ہے چنانچہ خواجہ اعظم خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتیؒ نے راہ سلوک کے چار راستے تبلائے ہیں۔ پہلا راستہ شریعت دوسرا طریقت تیسرا و چوتھا حقیقت و معرفت ہے۔ جس کے طے کرنے سے روحانی معراج حاصل ہو سکتی ہے کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ طلب صادق ہو۔ خواجہ غریب نواز نور اللہ مرقدہٗ کے ایک عظیم خلیفہ حضرت خواجہ حمید الدین ناگوریؒ (راجستھان) نے کیا خوب ان چار راستوں کی تشریح بیان کی ہے کہ

شریعت ابر ہے۔ طریقت بارش / شریعت سے ظاہر کو سنوارتے ہیں اور طریقت سے باطن کو سنوارا جاتا ہے۔

حضرت حمید الدین ناگوریؒ اس کے بعد راستے ہیں کہ.

"شریعت بلا طریقت تو ممکن ہے لیکن طریقت بلا شریعت ناممکن"

لہٰذا ظاہر ہوا کہ بلا شریعت کوئی راستہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ انہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں نے شریعت ہی کی پابندی کو اولیت دی ہے۔

حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ فرماتے ہیں۔ شریعت کے پابند رہو کہ اسی میں سلامتی ہے اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر وہ مطلوب حاصل نہیں ہو سکتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے راستہ کے سوا قرب الٰہی حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں رشد و ہدایت حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک قرآن حکیم اور دوسرے سنت نبوی۔ جب تک دونوں امور میں کامل اتباع نہیں ہمارا راہ حق کو عبور کرنا مشکل ہے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید۔

حق تعالیٰ کے طالب کی راہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ پر عمل ہو شریعت کے بغیر طریقت کی راہ چل نہیں سکتی طریقت حاصل ہونے کے بعد حقیقت حاصل ہوتی ہے پس جو شخص شریعت سے بے بہرہ ہے نادانی اور جہالت سے علم شریعت کے بغیر طریقت میں قدم رکھتے ہیں ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دولت ایمان بھی ان کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور شیطان کے جال میں پھنس کر نہ ادھر کے رہتے ہیں۔ اور نہ ادھر کے

(باقی ص ۲۳ پر

محمد اسحاق ڈپٹی ڈائرکٹر
پرنسپل کالج آف ایجوکیشن
6/619-4-11 بازارگارڈ
حیدرآباد ۔ ۲

تعلیمی اداروں کا معیارِ تعلیم

کسی محفل میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں، بچوں کی تعلیم کا ذکر چل پڑا۔ کوئی نہ کوئی صاحب یہ تبصرہ کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں کرسچین مشنری اسکول کا معیارِ تعلیم بہت اونچا ہے ہمارے تعلیمی اداروں کا پست ہے۔ کسی ہائی اسکول کا نتیجہ ہر سال صفر ہے تو کسی اور اسکول کا دس پانچ فی صد برسوں سے یہ ادارے اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جس شخص کی زندگی کا سارا تعلق تعلیم ہی سے رہا ہو وہ اس بحث کا اولین مخاطب ہوتا ہے کبھی کبھی کسی تعلیمی ادارہ نے اس احقر کو معیارِ تعلیم پر کچھ کہنے کی دعوت دی لیکن ایسے وعظ و نصیحت سے معیارِ تعلیم اونچا ہونے کی توقع نہیں۔

کرسچین مشنری اسکولوں کی تعداد کہا جاتا ہے کہ اس وقت سارے ملک میں چالیس ہزار کے قریب ہے یہ سب اسکول بظاہر وہی نصاب، وہی زبان، وہی قابلیت کے ٹیچرس ہوتے ہیں جو

ہمارے اسکولوں میں ہوتے ہیں۔ لیکن معیار تعلیم میں بڑا فرق ہوجاتا ہے آخر کچھ تو بات ضرور ہوگی جو ہمیں آج تک راز ہی راز رہ گئی ہے جس کا سمجھنا اور پانا مشکل ہے اس مضمون کے لکھنے کی غرض بھی یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں کا پتہ چل جائے کہ آخر اس امتیاز کی وجہ کیا ہے۔

کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے کہ حیدرآباد کے ایک نامور اسکول "لٹل فلاور" کے پرنسپل سے ایک نجی ملاقات میں بات چیت کا موقع ملا۔ میں پوچھ بیٹھا کہ آپ کا اسکول کوئی پچاس برس سے اعلیٰ معیار تعلیم کے لئے مشہور ہے آپ کالج کیوں نہیں کھول لیتے۔ آپ کو منظوری سرکار سے لانا چند گھنٹوں کی بات ہے اس لئے کہ سارے سکریٹریز اور ڈائرکٹرز کے بچے آپ کے اسکول میں ہیں۔ "برادر" نے جواب دیا کالج کی ہمیں کیا ضرورت ہے دیکھئے اس سال انٹرمیڈیٹ میں ایک سو طلباء بیٹھے ۹۸، درجہ اوّل آئے اور صرف ۲، درجہ دوم میں۔ ان میں ۱۲، میڈیکل کالج - ۲۹، انجینئرنگ کالج ۱۱، ای۔ ای۔ ٹی چند زرعی کالج اور وٹرنری وغیرہ میں شرکت کے مستحق ہوئے۔ باقی ۱۱، رانسنا پور پالی ٹکنیک میں بجز ایک تا پندرہ سرفہرست ہمارے ہی طلباء کا قبضہ۔

تعلیمی معیار کا اندازہ چند باتوں سے ہوجاتا ہے، یعنی سیکھنے کی رفتار، مضامین پر ان کی گرفت، ہوم ورک کا سلیقہ طلباء کا ذوق وشوق اساتذہ کی دلچسپی، پبلک امتحان کے نتائج جو ہر اسکول کے معیار تعلیم کے لئے بیانہ میٹر کا کام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول

ڈسپلن تعلیمی مصروفیات اسپورٹس گیمس، ڈرامے، تقریری و تحریری مقابلوں سے طلباء کی تعلیم اور تربیت کا اندازہ ہو جاتا ہے محض بچوں کے یونیفارم، وزنی اسکول بیگ اونچی فیس اور ٹیپ ٹاپ سے یہ سمجھ لینا کہ تعلیمی معیار بہت اونچا ہوگا غلط فہمی ہے البتہ یہ باتیں بھی اسکول کے ڈسپلن اور معیارِ تعلیم میں معاون ہو سکتی ہے ایک اور بات یہ ہے کہ اس اسکول سے کامیاب طلباء نے کس حد تک پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ لیا ہے کیونکہ اکثر فرسٹ کلاس طلباء کو آرٹس کالجس میں بھی داخلہ نہیں ملتا۔

اچھی معیاری تعلیم مہنگی ہوتی ہے غیر معیاری تعلیم سستی ہوتی ہے ویسے تعلیم "ایجوکیشن انڈسٹری" میں تبدیل ہو چکی ہے اعلیٰ معیاری شئے کے لئے بازار میں قیمت زیادہ دینی پڑتی ہے اسی لئے بعض تعلیمی ادارے EDUCATION SHOPS میں تبدیل ہو چکے ہیں گورنمنٹ اسکول، میونسپل اسکول پست تعلیمی معیار کے لئے مشہور ہیں۔ غریب ماں باپ ان ہی اسکولوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان کے بچے اچھے طلباء کا مقابلہ کر نہیں سکتے۔ جو کسی اچھے اسکول میں پڑھ آئے ہوں۔ ان میں برسوں میں ایک آدھ کوئی کسی پیشہ ورانہ کالج میں داخلہ کا مستحق ہوتا ہے۔

معیارِ تعلیم کا انحصار :۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کی کارکردگی اور معیارِ تعلیم کا انحصار مندرجہ ذیل سات عناصر کے باہمی

خوشگوار اور گہرے ربط و ضبط پر ہے جس کو ہم "زنجیری مجموعی اثر" یا انگریزی میں CUMULATIVE EFFECT, کہتے ہیں۔ (۱) ادارہ کے قیام کا مقصد (۲) انتظامیہ کی کارکردگی (۳) اساتذہ کی قابلیت اور دلچسپی (۴) داخلے کے شرائط (۵) والدین کا تعاون (۶) مادی سہولتیں (۷) پرنسپل کی شخصیت ۔ یہاں پر ان سب پر تفصیل سے بحث کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ضرورت لیکن ایک اجمالی خاکہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ معیار تعلیم میں اِن عناصر کی کیا اہمیت ہے۔

(۱) تعلیمی ادارہ کے قیام کا مقصد تجارتی یا ذاتی منفعت ہو سکتا ہے یا پھر اپنی کمیونٹی کی خدمت یا ایسا اسکول قائم کرنا۔ جس میں صرف اونچے طبقہ کے لوگ ہی اس کا رخ کر سکیں داخلہ فیس اتنی رکھی جائے کہ عام لوگ ادھر کا خیال ہی نہ کریں۔ وہ ادارے جو عام غریب طلبہ کے لئے قائم کئے جاتے ہیں وہ سوشیل سرویس کے جذبہ اور مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یہاں پر تعلیم کا کچھ انتظام ضرور ہو جاتا ہے لیکن معیار تعلیم بہت دور رہ جاتا ہے۔

(۲)۔ کرسچین مشنری اسکولوں میں انتظامیہ کہاں ہے کس کو پتہ نہیں اور نہ اِن تک پہنچ آسان ہے سارے اسکول کا ذمہ دار پرنسپل ہوتا ہے یہ پرنسپل اپنے کام کے پکے اور سچے ہوتے ہیں۔ سارا اسکول مشین کی طرح چلتا ہے مشین ہر پرزہ پر پرنسپل کی نظر ہوتی ہے کوئی ناقص ٹیچر اِن اسکولوں میں چھ سات مہینوں سے زیادہ رہ نہیں سکتا۔

اب ذرا ہمارا خیال دیکھئے انتظامیہ کے رکن کی ٹیچ ٹائم ٹیبل

سے لے کر بچوں کے بجز بڑھانے تک ہے سارے ٹیچر کسی نہ کسی ممبر کے منظور نظر ہیں پرنسپل صرف پوسٹ آفس وڈک کرتا ہے کبھی اس کی شکایت کبھی اس کی شکایت۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت حال کی خرابی یہ ہے کہ اسکول چلانے کی ذمہ داری پرنسپل یا صدر مدرسہ کی ہے لیکن اسے کوئی اختیار نہیں جن کے ہاتھوں میں اختیار ہے وہ ذمہ دار نہیں۔ اس کو لارڈ کلائیو کی دوعملی پالیسی کہا جاتا ہے۔ وہ مال گزاری وصول کرتا لیکن انتظام کے ذمہ دار تھے انہیں مال گزاری وصول کرنے کا اختیار نہیں تھا جس کا بس چلتا ہے وہ ذمہ دار نہیں جو ذمہ دار ہے وہ بے بس ہے۔ اس صورت حال کی عملی مثالیں ہمارے تعلیمی اداروں میں کثرت سے مل جائیں گی۔

انتظامیہ کے بعض اراکین کی انا EGO بہت مضبوط ہوتی ہے بعض تو احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ اب انہیں کوئی سیٹ مل گئی تو پھر ان کی رائے کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے اکثر آپس میں تو تو میں میں ہو جاتی ہے پھر یہ باتیں ملازم ہو کر اسٹاف روم میں آتی ہیں۔ چند اساتذہ کے گروپ بن جاتے ہیں۔ اسکول پالیٹیکس خوب کام کرتی ہے وہ جو پڑھانے کی بات تھی نصاب کی تکمیل وغیرہ سب بھول جاتے ہیں۔ سب کچھ ہے مگر تعلیم نہیں ہے جس کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا۔

(۳) کسی بھی تعلیمی ادارہ کا معیار تعلیم اچھے اور قابل اساتذہ پر ہی ہوتا ہے۔ اگر اسکول میں سب کچھ ہے اچھے ٹیچر نہیں ہیں تو سب بے کار محض ہے۔ مغربی اسکولوں میں NUNS اور SISTERS ہوتی

ہیں جنہیں خدائی خدمت گار کہا جاتا ہے انہیں دنیا کے دھندوں سے کام نہیں بچوں کی تعلیم ہی ایمان اور یہی زندگی ہے۔ ان میں بلاشبہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہیں DEDICATED کہا جاتا ہے انہوں نے اس پیشہ کو خدمتِ خلق اور مذہب کے پرچار کا ذریعہ بنا لیا۔ ان کے کام اور لگن کو دیکھئے تو رشک آتا ہے یہ ٹیچر اسکول کا نمک ہیں ان کا وجود اس ادارے کے لئے باعثِ فخر اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ہمارے پرائمری اسکول سے لے کر کالج، یونیورسٹی کی سطح تک دو چار اساتذہ ضرور ایسے مل جائیں گے جنہیں ہم DEDICATED کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا۔ کہ فلاں لیڈر، فلاں منسٹر ابتداء میں ٹیچر رہ چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے سیاسی شعبدہ بازی کے ٹریننگ سنٹرس ہیں۔ دیہات میں شاید ہی کوئی ایسا ٹیچر ہوگا جو کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا سرگرم کارکن نہیں ہے الکشن کے زمانہ میں ان کی حاضری اسکولوں میں مہینوں برائے نام رہتی ہے جب ان کا لیڈر کامیاب ہو گیا تو دوسرے الکشن تک اس سے جائز و ناجائز کام لے کر یہ اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں۔ اصل تعلیم کا مسئلہ کہاں رہ گیا خود انہیں بھی نہیں معلوم۔

پیشہ تعلیم اکثر اساتذہ کے لئے ان کے مزاج اور ذوق سے بہت دور کی بات ہے ساری زندگی یہ لوگ اس پیشہ کا بوجھ پیٹھ پر لادے چلے جاتے ہیں تعلیم کا کام اکثر وجدانی اور روحانی نوعیت کا ہوتا ہے جہاں تک ان بچاروں کی پہنچ نہیں۔ جو کام تسلسل چلتا رہا۔ وہاں تعلیم کے معیار کا تذکرہ بیکار ہے ہمارے ملک میں ایک اور بڑی خامی ہے اساتذہ کی تنخواہیں بہت

کم دی جاتی ہیں۔ گورنمنٹ سے گرانٹ جو ملتی ہے وہ ٹیچر کو نہیں دی جاتی وہ دستخط تو کرتا ہے لیکن تنخواہ کم ادا ہوتی ہے میں ایک ایسی آگ ہے جو ہر ٹیچر کے سینہ میں سلگتی رہتی ہے وہ اس کا بدلہ معصوم بچوں سے لیتا ہے۔ آنے والی ساری نسل کی قابلیت کا انحصار اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے کسی ماہر تعلیم نے سچ کہا ہے کہ جو ٹیچر مالی پریشانیوں سے بدحال رہتا ہے وہ ملک کو اتنا نقصان پہنچاتا ہے جو کسی بیرونی دشمن سے ممکن نہیں۔

A DISSATISFIED TEACHER CAN HARM THE COUNTRY MORE THAN THE ARMY OF A FOREIGN ENEMY

دینی مدارس میں اساتذہ کی معاشی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے بیشک دین کا کام ثواب کا ہے لیکن محض تعریف و توصیف ایثار و قربانی کا درس دیتے رہنے سے ٹیچر کا حال درست نہیں ہو سکتا۔ انہیں حکومت کے معیار کی تنخواہیں دینا لازمی ہے تب ہی انہیں سکون حاصل ہوگا۔ تعلیم کا معیار بلند ہوگا۔

ایک عرصہ سے مغربی ممالک میں ایک نئی اصطلاح چل پڑی ہے۔ "فروغ انسانی وسائل میں سرمایہ کی مشغولیت"

INVESTMENT IN HUMAN RESOURCES.

یہ بات اب مسلم ہو چکی ہے کہ سرمایہ کا بہترین استعمال انسانی وسائل کی ترقی کے لئے ہی ہو سکتا ہے اس راز کو جاپان نے پالیا دوسری جنگ عظیم میں ایک تباہ شدہ ملک نے پرائمری اور سکنڈری۔ ایجوکیشن پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اچھی تعلیم کے لیے اچھے ٹیچرس کی ضرورت ہے حکومت نے ان کی تنخواہوں کو پرکشش بنادیا

اور ٹیچرس کو وہی سہولتیں دیں۔ جو منسٹر کو نصیب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بس تیس چالیس برس میں جاپان دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن گیا ذہن اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بچے ملک کا اصل سرمایہ ہیں۔ ہم چاہتے ملک کی دولت مختلف ہی شعبوں پر صرف کرتے رہیں تعلیم پر اگر خرچ نہ کیا جائے تو سو برس بعد بھی وہیں ہوں گے جہاں آج ہیں۔ اساتذہ کی تنخواہوں سے بہتر کوئی اور انسانی وسائل میں سرمایہ کی مشغولیت نہیں ہو سکتی ہمارا ملک تعلیم پر سالانہ بجٹ سے صرف ۲ فی صد خرچ کرتا ہے اور دفاع پر ۲۷ فی صد کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے ۶۶ ۱۹ء میں (۶) فی صد کی سفارش کی تھی لیکن آج تک بھی تعلیم کا حصہ یہاں نہیں پہنچ سکا۔

۴۔ طلبا کا داخلہ اور والدین کا تعاون

مشنری اسکولوں کے اعلیٰ معیار تعلیم کا چرچہ ہر شہر میں ہے ہر سال ہزاروں لوگ آدھی رات سے درخواستوں کے فارم حاصل کرنے کے لئے اِن کے دروازے پر ہی سو جاتے ہیں۔ وہ بچوں سے زیادہ ماں باپ کا انٹرویو لیتے ہیں۔ قسمت سے آپ کے بچے کو داخلہ مل گیا تو سارے خاندان میں آپ کا وقار بڑھ گیا۔ اب اس وقار کو قائم رکھنے کے لئے لاکھ جتن کئے جاتے ہیں۔ اکثر ماں باپ بچوں کو خود پڑھاتے ہیں۔ یا پھر ٹیوشن کا انتظام کرتے ہیں۔ اسکول کی پڑھائی ۶۰ فیصد ہے تو گھر کی محنت ۴۰ فیصد۔ اس طرح اِن اسکولوں میں خس و خاشاک جمع ہونے نہیں پاتا۔ تعلیم کا معیار اونچی سطح پر قائم رہتا ہے

مادّی سہولتوں میں بلڈنگس، کلاس روم، فرنیچر، تجربہ گاہیں،

لائبریری، کینٹین، کھیل کے میدان، پانی اور ٹائلٹس وغیرہ کی سہولتیں شامل ہیں اکثر مدارس میں ان سب باتوں کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کا اثر بھی تعلیم پر پڑتا ہے۔

ان سب کے درمیان پرنسپل کا عہدہ اہم اور کلیدی ہوتا ہے قابل اور تجربہ کار امانت دار ہونے کے علاوہ اس میں اساتذہ سے کام لینے اور طلباء میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے ہنر سے اس کا موقف ہونا ضروری ہے اسکول کی فضا کو خوشگوار بنائے رکھنا ایک مشکل کام ہے یہ ایک نہایت لطیف فن ہے یہیں پر آکر بعض اچھے اچھے قابل لوگ ناکام ہوجاتے ہیں۔ پرنسپل کا تعلق انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ اور والدین سے آئے دن رہتا ہے ان سب کے مسائل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس کو بڑے حوصلہ سے کام کرنا پڑتا ہے اس کے کام کا جذبہ نیک نیتی اور اخلاص کا اثر سارے اساتذہ اور طلباء پر پڑتا ہے اس کا امانت دار ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ اسکول کا ڈسپلن جب بگڑتا ہے تو اکثر اس کی وجہ "کیاش بک" ہوتی ہے چھوٹی بڑی بے ایمانی پیسہ کے بارے میں، پرنسپل کی اعلیٰ صفات اور قابلیت پر پانی پھیر دیتی ہے اساتذہ کی بغاوت اور لاپرواہی بڑھ جاتی ہے اس کا اثر طلباء کے ڈسپلن اور اسکول کے معیار تعلیم تک پہنچ جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان تمام عناصر میں کوئی ایک کڑی بھی کمزور ہو تو معیار تعلیم پر اس کا اثر پڑے گا۔ اگر انتظامیہ ہوشمند ہو اور پرنسپل مخلص ہو تو معیار تعلیم ضرور ترقی کرکے رہے گا۔

ایم۔ اے مجید
ریجنل منیجر الامین اسلامک
فینانشیل انوسمنٹ کارپوریشن

اسلام اور بلاسودی بینک کاری

حال ہی میں شپنگ کارپوریشن آف انڈیا نے ایک سعودی عرب کے بینک الراجی کے ساتھ سمندری جہاز کی خرید ی کے لئے مالیہ کی فراہمی و سرمایہ کی غرض سے اسلامی بنیادوں پر معاہدہ کیا ہے اس معاہدہ کو نہ صرف تاریخ ساز بلکہ اسلامی تعلیمات اقدار اور اصولوں کی شاندار کامیابی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں جبکہ مغربی دنیا اپنی ترقی پر ناز کر رہی ہے اسلامی اصولوں کو حسن و پشیمانی کے ساتھ قبول کیا گیا ہے اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ بلاسودی بینک کاری۔ رفتہ رفتہ پوری دنیا میں عام ہو جائے گی اس سال کے اوائل میں وال اسٹریٹ جرنل نے لکھا تھا کہ عالم اسلام کے بیشتر ممالک نے مغربی ممالک کے بینکوں کو بلاسودی بینک کاری کے طریقے کار کو اختیار کرنے میں بڑی حد تک مدد کی۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں اس سلسلہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ ملیشیا میں ایک برطانوی بینک اسٹنڈرڈ چارٹرڈ نے گذشتہ سال سے بلاسودی منافع کی تقسیم کا اعلان کیا۔ اور سنٹرل بینک اس قسم کی پہل کر چکا ہے۔

بلاسودی بینک کاری کے فروغ میں ملیشیا نے اہم رول ادا کیا ہے۔

بیان کی حکومت پہلے ہی اعلان کر چکی ہے کہ وہ دُہرے بینکنگ نظام کو
فروغ دینے کا وعدہ کیا ہے یعنی روایتی بینکنگ کے ساتھ ساتھ بلاسودی
بینک کاری کے نظام پر عمل کیا جائے گا۔ بنک نغارا کے اسلامی بینکنگ
ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ڈاکٹر نور محمد کے بموجب ایک جامع اسلامی بینکنگ
سسٹم کے لئے درکار تین میں سے دو بنیادی شرطوں یعنی افراد اور مختلف
اور وسیع بنیادوں پر انفرا اسٹرکچر کی فراہمی کی تکمیل ہو جائے گی اور اسٹر
بنکینگ سسٹم کے لئے مطلوب تیسری بنیادی شرط کو آئندہ برسوں میں
فوقیت دی جائیگی۔ اور اس سلسلہ میں پیشرفت کی جا چکی ہے۔ ۱۹۹۳ء
کے آغاز کے ساتھ بنک آف ملیشیا نے تمام چیکس بلاسودی بنیک کاری اسکیم
کے تحت علٰحدہ کمپیوٹرائزڈ پول سسٹم کے ذریعہ اجرائی کے انتظام کئے ہیں
بلاسودی بنکس جو خسارہ کا شکار ہیں۔ وہ سرپلس SPTF بنکوں سے
بلاسودی فنڈز حاصل کریں گے۔ اگر نقد رقم میں کمی ہو تو اس کی پابجائی
بنک نغارا ملیشین سنٹرل بنیک کرے گا۔ تاہم بنیک سے مستقل طور پر
قرض حاصل کرنے والوں کو جرمانے کی رقم ادا کرنی ہوگی۔ امید کی جا رہی ہے
کہ اس پول سسٹم کا مرکز و محور اسلامی بنیک کاری ہی ہوگا۔ ملیشین سنٹرل
بنیک نے اسلامی کیپیٹل مارکٹ کا تجزیہ کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ جبکہ سعودی
عرب میں اسلامک یونٹ ٹرسٹ، اسلامک گورنمنٹ سیکیوریٹیز اور کارپوریٹ
بانڈز اور رہن بانڈز اسلامی اصولوں پر جاری کئے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا
ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ ملیشیا میں ان دو نئے سسٹمز کو زبردست عوامی مقبولیت
حاصل ہوگی۔ اس ملک میں مسلم و غیر مسلم کو دونوں ہی قسم کے بنیکنگ سسٹم

سے استفادہ کی سہولت رہے گی۔ غیر مسلموں کو اس بات کا حق واختیار رہے گا۔ کہ وہ کسی بھی بینکنگ سسٹم کو منتخب کریں۔ چونکہ یہاں کی نصف سے زائد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اس لئے اسلامی بینک کاری اسلامی کیپٹیل مارکٹ کو روشناس کرنے اور اس پر عمل آوری میں کوئی دقت نہیں آئے گی بینک اسلام ملیشیا نے حال ہی میں ایک اسلامی بروکینگ کمپنی شروع کی ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر عبدالحلیم اسماعیل ہیں۔ جو اسلامی بینک کاری کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ملیشیا نے اسلامی بینک کاری پر عمل آوری کے لئے جو پیشرفت کی ہے۔ برونی، انڈونیشیا میں اس کی تقلید کی جارہی ہے وہ بینک اسلامی ملیشیا کے تعاون سے اسلامی بینک قائم کئے جارہے ہیں۔

اسلامی بینک کاری کو آئندہ چند برسوں تک کئی محاذوں پر چیلنجس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مسلم ممالک میں بینک کاری کے نظام میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ بظاہر ان ممالک کے اور غیر اسلامی ممالک کے طریقۂ کار میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ لائسنسنگ اور بینکنگ کاری میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

پاکستان شرعی عدالت نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا تھا کہ جون ۱۹۹۲ء کے اختتام تک ملک کے تمام بنکس بلا سودی نظام کے تحت کام کریں گے۔ تاہم سپریم کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف کامیابی کے ساتھ چیلنج کیا گیا۔ متحدہ عرب امارات میں اسلامی بینک حالیہ عرصہ تک وزارت اوقاف کی زیر نگرانی تھے۔ مصر میں نام نہاد اسلامی سرمایہ کاری کمپنیوں نے بد انتظامی کی بدترین مثالیں

ہیں ۔ تاہم بیشتر مغربی بنکس اور مالیاتی اداروں نے اسلامی بنک کاری کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنانے کے سلسلہ میں سنجیدہ کاوشیں کیں ۔ چنانچہ بنک آف انگلینڈ نے یہ اعتراف کیا کہ برطانیہ میں اسلامی بنک کاری ممکن ہے ۔ بنک آف انگلینڈ اور اسلامی ڈیولپمنٹ بنک کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اسلامی بنکس میں اکاؤنٹنگ کے مشترکہ اصولوں کو نافذ کیا جائے ۔ اسی ضمن میں بنک آف انگلینڈ کے میڈل ایسٹ ڈپارٹمنٹ نے اسلامی ڈیولپمنٹ بنک کے عہدیداروں کے ساتھ باقاعدہ ملاقاتیں کی ۔ بی سی سی آئی کے زوال کے بعد اسلامی ممالک کو بھی اپنے اصولوں قواعد اور قوانین پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور BIS کی بنک کاری کے رہنمایانہ خطوط سے اتفاق کرنا پڑا ۔

بہرکیف بیشتر ممالک اسلامی بینک کاری کو اختیار کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں ۔ الرجی بنکنگ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن جو سعودی عرب کا سب سے بڑا اسلامی بنک ہے کئی ممالک سے اسلامی اصولوں پر معاہدے کئے ہیں ۔ الرجی طیاروں اور سمندری جہازوں کی خریداری کے سلسلہ میں غیر سودی قرضے مہیا کئے ہیں ۔ اس کمپنی نے پاکستان کے برقی پیداوار کے پراجکٹ کے علاوہ متحدہ ایرلائنز کو طیارہ خریدنے کیلئے غیر سودی معاوضات مہیا کئے ہیں ۔ ہندوستان میں بلا سودی بنک کاری کے نظریات کو فروغ دینے اور اسے عام بنانے میں الامین سند جو خدمت انجام دیئے ہیں ۔ وہ اظہر من الشمس ہیں ۔

الامین تحریک : — تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی حالت بدتر

مائل بہ زوال ہوتی گئی اور مسلمان ہر شعبہ میں پست سے پست ہوتے چلے گئے قوم کی اس حالت زار پر قوم کے رہنما صرف کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان حالت میں آج سے تقریباً ۲۸ (اٹھائیس) سال قبل ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب نے جو دور بیں کی سر حس کی قابلیت رکھتے ہیں۔ شہر بنگلور سے الامین تحریک کی ابتداء فرمائی۔ بانی الامین تحریک نے قوم کے اہم مسائل جیسے تعلیم صحت اور معاشی کے اعلیٰ کے لیے ساری توانائی صرف کر دی۔ اور الحمد للہ الامین آج ہندوستان بھر میں ان کے تمام شعبوں میں کارکردگی کا لوہا منوا چکی ہے۔

الامین :— ہندوستان کا پہلا اور واحد ادارہ جو ریزرو بنک کے ہدایات اور شرعیہ مشاورتی بورڈ کے تحت اسلامی معاشی اصولوں پر گامزن ہے۔

(سلسلہ صفحہ ۴)

بائیو گیس اور چولہا پروگرام :—

کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز نے ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء کی تاریخ تک آندھرا پردیش میں ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران (۱۹۴۴۳) بائیو گیس پلانٹس اور ۶۳۵۸۶ ترقی یافتہ چولہے تیار کئے ہیں جبکہ ۹۲-۹۳ کے دوران کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز نے ۲۴۶۳ بائیو گیس پلانٹس اور ۱۳۳۰۰ ترقی یافتہ چولہے تیار کئے ہیں۔

آر۔ پربھاکر راؤ۔
ڈائرکٹر۔

آندھراپردیش میں کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ کی سرگرمیاں

کھادی اینڈ ولیج انڈسٹری بورڈ اپنے قیام کے بعد سے ہی بے روزگاروں اور غیر منفعت بخش ملازمتوں سے وابستہ افراد کو روزگار فراہم کررہا ہے کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز نے دیہی علاقوں میں غربت کو دور کرنے کے کام میں مصروف ادارہ کی حیثیت سے ایک اہم اعزاز حاصل ہے اس کے علاوہ اسے موجودہ پنچسالہ منصوبوں میں بھی زبردست ترجیح دی گئی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آندھراپردیش کو اس کے علاقے اور آبادی کے اعتبار سے سارے ملک میں پانچواں مقام حاصل ہے آندھراپردیش سابق میں بھی کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز (دیہی صنعتوں) میں ایک اہم مقام کا حامل تھا آج بھی اسے ایک ایسی ریاست ہونے کا فخر حاصل ہے جہاں کھادی کی چند بہترین اقسام پونڈورو و فائن کھادی پٹناپورم ڈی۔ بی۔ اور گدوال سلک وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ کھادی کے علاوہ بعض دیہی مصنوعات مثلاً بخاری کوباگیری، ولیج لیدر، ولیج آئیل، چونا، صابن، اور گوند بھی آندھراپردیش کی خاصیت ہیں ان مصنوعات کی تیاری اور فروخت کے علاوہ کھادی اور ولیج انڈسٹریز کی شعبہ ہندوستان کی ترقی میں خاطر خواہ تعاون دیتا ہے۔

تنظیم :۔ مجموعی طور پر کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز کے ۲۵۵ ادارے ہیں۔ جو ریاست میں رابستہ کمیشن کو فہرست میں شامل کئے گئے

ہیں۔ اس کے علاوہ ۷۶۳ ادارے، ۲۱۶۶ کوآپریٹوز اور ایک لاکھ ۲۳ ہزار ۴۵۷ افراد کو آندھرا پردیش کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کی جانب سے مالیہ فراہم کیا گیا ہے یہ مالیہ مختلف کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز کے ذریعہ فراہم کیا گیا۔ یہ تقسیم ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء تک کی ہے۔

مجموعی طور پر کھادی اسکیم بشمول کاٹن (سوتی) کھادی، منرلین کھادی، سلک کھادی اور پالیسٹر اسکیموں کو کھادی اداروں کی جانب سے روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ جو کمیشن کی راست فہرست میں شامل ہیں۔ دولن کھادی پروگرام دراصل اِن کوآپریٹو اداروں کی جانب سے روبہ عمل لایا جا رہا ہے جنہیں آندھرا پردیش کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کی جانب سے مالیہ فراہم کیا جاتا ہے۔

گریجن کوآپریٹو کارپوریشن لمیٹیڈ، وشاکھاپٹنم، جو کمیشن کی فہرست میں راست شامل ہے۔ کمیشن کی جانب سے جنگلات کی صنعتوں کو بھی روبہ عمل لایا جا رہا ہے اِن میں غیر خوردنی بیج طبی اہمیت کے پودے، جمع کرنا اور شہد کی مکھیوں کو پالنا شامل ہے یہ تمام امور کمیشن کے تحت ہیں۔

آندھرا پردیش کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ، ریاست کا ایک بڑا ادارہ ہے۔ جو دیہی صنعتوں کے پروگرام کو روبہ عمل لا رہا ہے اور کھادی پروگراموں کے تحت پیداوار میں بھی اپنا حصہ ادا کرتا ہے جبکہ کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کے ذریعہ راست امداد دیئے جانے والے ریاستی اداروں کے مقابلہ میں معمولی ہے۔

آندھرا پردیش میں کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کی ۹۱-۱۹۹۰ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء میں صلاحی ترقی کی تفصیلات حسب ذیل جدول میں دی گئی ہیں۔

تفصیلات	۱۹۹۰-۹۱ء کھادی	۱۹۹۰-۹۱ء ویلیج انڈسٹریز	۱۹۹۰-۹۱ء جملہ	۱۹۹۱-۹۲ء کھادی	۱۹۹۱-۹۲ء ویلیج انڈسٹریز	۱۹۹۱-۹۲ء جملہ
پیداوار کروڑ روپے میں	۱۳٫۰۹	۱۴٫۸۳	۱۲۷٫۹۲	۱۷٫۲۹	۲۸٫۱۲	۱۴۵٫۱۴
فروخت کروڑ روپے میں	۱۰٫۷۶	۱۲۶٫۳۴	۱۳۷٫۱۰	۱۵٫۵۶	۱۴۱٫۲۶	۱۵۶٫۸۲
روزگار (روپے لاکھوں میں)	۰٫۲۹	۲٫۸۰	۳٫۰۹	۰٫۳۰	۲٫۹۷	۳٫۲۷
آمدنی (روپے لاکھوں میں)	۵٫۷۳	۴۳٫۱۹	۴۸٫۹۲	۶٫۷۲	۴۸٫۰۳	۵۴٫۷۵

آندھرا پردیش میں خصوصی اقسام کی کھادی کی تیاری

① آندھرا پردیش پوندورو کھادی : — آندھرا پردیش اوسط اور فائین دونوں درجہ کی کھادی کی تیاری میں مشہور ہے آندھرا پردیش کے شمال مشرقی علاقوں جہاں سریکاکلم، وجیانگرم کے اضلاع واقع ہیں۔ روایتی فائن کھادی تیار ہوتی ہے جیسے پوندورو کھادی کہا جاتا ہے پوندورو کھادی ریاست کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں میں بھی مشہور ہوئی۔ ضلع سریکاکلم خاص طور پر ضلع وجیانگرم کے کچھ حصہ میں کئی بُنکر کھادی بُنتے ہیں۔

گدوال، پوچم پلی، دھرماورم سلک کھادی : —

گدوال اور پوچم پلی آندھرا پردیش کے بعض مشہور مقامات ہیں جہاں گذشتہ کئی برسوں سے سلک ساڑیاں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ ساڑیاں ہاتھ سے بنی جاتی ہیں۔ اور ڈائی کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اس میں دیسی ساختہ رنگوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک منفرد طریقہ کار ہے اور متذکرہ دونوں مقامات پر خاص طور پر اس طریقہ کار کا استعمال کیا جاتا ہے اور اندرون ملک اور بیرون ملک کے گاہکوں کو معیار کا تیقن دیا جاتا ہے —

ضلع اننت پور میں دھرما ورم میں بافندوں کی کثرت ہے جو سلک ساڑی اور دھوتی تیار کرتے ہیں یہ پرکشش ڈیزائینوں اور رنگوں میں ہوتی ہے

دیہی صنعتیں : — قبل ازیں یہ کہا گیا تھا کہ آندھرا پردیش کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز بورڈ کے یونٹ دیہی صنعتوں کے پروگراموں کی عمل آوری کے بھی مجاز رہیں گے تاہم شہد کی مکھیوں کو پالنا پالی وستر اور بائیو گیس کی صنعتیں کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز کی راست نگرانی میں ہوں گی ۔

کھادی اور ویلیج انڈسٹریز کے شعبہ کے تحت سنہ ۱۹۹۱-۹۲ء کے دوران آندھرا پردیش نے جملہ دیہی مصنوعات کا ۵٫۷ فیصد حصہ کا تعاون دیا آندھرا پردیش میں کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز کی جانب سے ادا کئے گئے حصہ کی تفصیلات حسب ذیل ہیں ۔

پیداوار ۹۲ - ۱۹۹۱ء

نشان سلسلہ	صنعت	کل ہند	آندھرا پردیش	فیصد
۱	جنگلاتی پودے اور پھل	۴٫۴۷	۰٫۹۳	۲۰٫۶
۲	چونے کی تیاری	۶۶٫۱۸	۱۱٫۹۳	۰۸٫۰
۳	پھلوں کی پراسنگر	۱۵٫۶۲	۲٫۰۶	۱۳٫۲
۴	گڑ اور کھانڈسری	۴۵٫۹۳	۱۴٫۹۹	۱۰٫۳
۵	ویلیج آئیل	۳۲۰٫۰۳	۳۰٫۵۱	۹٫۵
۶	بڑھئی و لوہاری	۳۳۴٫۶۰	۱۵٫۸۷	۴٫۷
۷	دیہی کار	۲۰۴٫۲۰	۹٫۲۷	۴٫۵
۸	بام گڑ	۱۱۹٫۹۵	۴٫۷۱	۳٫۹

ماہنامہ
حیدرآباد

مئی : ۱۹۹۷ء
جلد : ۱۱ ، شمارہ : ۵
قیمت : ۶ روپے

[illegible]

فہرست

[illegible]

[illegible]

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ہمارا نظامِ تعلیم

تعلیم کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر اور اقبال کی تنقید اصلاحی کے خیالات پر اگرچہ مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس کو علیحدہ کر کے ایک مستقل فن [illegible] مستقل موضوع بنا کر اس پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ اقبال ان چند خوش قسمت لوگوں میں تھے جو خود اپنے زمانہ میں جدید نظامِ تعلیم کے آغوش میں [illegible] کر بہت کچھ اس کی خصوصیات کے ساتھ نکلے۔

انہوں نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ میں اس جال میں پھنسا تھا لیکن [illegible] نکل گیا۔ میرے بال و پر اس جال کا پھندا نہیں ہے [illegible]

مسلم ہم عالم حاضر را الکسیر [illegible]

[illegible] کہ [illegible] پیدا نشستم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ضلع میں عموماً یہ بات تھی کہ فلاں زمیندار صاحب یا فلاں [illegible] صاحب اعلیٰ تعلیم [illegible]
فلاں خان صاحب کے صاحبزادے ولایت گئے ہیں۔ اس وقت مصر و شام سے کم ہندوستان
سے زیادہ مغربی ممالک کی طرف نوجوانوں کا رجحان تھا۔ غیر منقسم ہندوستان سے اس وقت
بہترین جوہر اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان انگلستان گئے اور وہاں خاص طور
پر آکسفورڈ اور کیمبرج میں انہوں نے تعلیم پائی۔ ہم برصغیر کے مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں
کہ یہاں کے اسلام پسند اور اخلاق پسند طلبہ کے اثرات سے جو لوگ آکسفورڈ، کیمبرج سے نکلے بلکہ ایک
طرح سے باغی بن کر نکلے۔ ان میں ہم دو شخصیتوں کے نام لے سکتے ہیں۔ ایک علامہ اقبال اور ایک
مولانا محمد علی جوہر۔ مغرب کا مشرق پر [illegible] اپنی طویل تاریخ میں یہ فخر حاصل نہیں کہ وہ کسی
ایسے مغربی تعلیم یافتہ کا نام پیش کر سکتا جس نے [illegible] کا نام [illegible] ہو
بلکہ وہ خود ان کا مبلغ بن کر آیا ہو۔ مولانا محمد علی جوہر جیسا جوہر قابل جو اس [illegible] کا باغی
اس ملک کا باغی اور ایک شعلہ جوالہ بن کر آیا۔ یہ ہمارے اس تحقیق و مطالعہ کے لئے فخر کی بات ہے
کہ کم سے کم یہ دو نام ہیں جن کو جھٹلایا نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ یوں اور بھی بہت سے نام [illegible]
جو وہاں سے بھی بن کر آئے، پھر کھو کر نہیں آئے حقیقت کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔ لیکن ہم
اقبال کا کلام پڑھتے ہیں، مولانا محمد علی جوہر کی تحریریں پڑھتے ہیں ان کی نظم پڑھتے ہیں اور بعد
میں تحریک خلافت میں انہوں نے جو قائدانہ کردار ادا کیا اس کو دیکھتے ہیں ان کی تقریریں
پڑھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب [illegible] تعلیم [illegible] باغی
اور [illegible]

[illegible]

دستانِ نوازش گرچے تو تحریر کی نہیں

[illegible]

انھوں نے اپنی خوشی کو برقرار رکھا، بلکہ وہ خوشی کے عالم میں آ کر آگے بڑھے تو [illegible] کے قلب و جگر میں اتر کر مغرب کی گمراہی کو دیکھا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا کہ جو ملک اسلامیت [illegible] سیاسی بحثوں اور کشمکش پائی جاتی ہے وہ غیر اسلامی ممالک میں کیوں نہیں پائی جاتی، [illegible] جاپان یا سیلون میں کیوں نہیں پائی جاتی۔ یہ اسلامی ممالک کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟ یہاں ایک صف آرائی اور رقابتیں اور ہنگامے [illegible] مقابل قائم ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں انقلابات کثرت سے آتے ہیں، کابینہ تبدیل ہوتی ہیں، عوام کو اپنے قائدین اور حکمرانوں پر بھروسہ نہیں اور ہر برسرِ اقتدار طبقہ کو عوام کی طرف سے اطمینان نہیں؟

جہاں تک میرے ذہن [illegible] اس کا ایک جواب آیا۔ بات یہ ہے کہ [illegible] اسلامی ممالک میں آیا ہوا ہے [illegible] اقتدار اور بنیادی عقائد سے متصادم [illegible] اطمینان نہیں [illegible] کو قبول کرنے کی صلاحیت [illegible]

[illegible]

میں بہت سی کتابیں ہیں میں پڑھ لوں گا۔ آپ تو اس وقت دو لفظوں میں بتا دیجئے کہ
اگر مجھ سے ہی کوئی پوچھے کہ ہندو کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا تعریف ہے تو میں کیا جواب
دوں ؟ تھوڑی دیر سوچتے رہے' کہنے لگے ' مسٹر قدوائی یا... اصل بات یہ ہے کہ جو کسی
چیز میں BELIEVE نہیں کرتا وہ بھی ہندو ہے اور جو ہر چیز میں BELIEVE کر
ہے وہ بھی ہندو ہے۔ تو ان کا نظام عقائد اگر ہے تو وہ اتنا روادار ہے کہ ہر فلسفہ
ساتھ دے سکتا ہے' اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اسلئے فرض کیجئے کہ مغرب کا نظام تعلیم جب
ہندوستان میں آیا تو اس نے ہندو سوسائٹی میں کوئی بے چینی پیدا نہیں کی' کچھ پرانے
لوگ تھے جو کہتے تھے کہ سمندر کا سفر نہیں کر سکتے' صبح کا نہانا ضروری ہے ' اس کے بغیر کھ
نہیں کھا سکتے۔ اس کے اندر کیا جان ہے ؟ تھوڑے دنوں کے اندر معلوم ہو گیا کہ یہ نے
سوچے سمجھے باتیں قبول کر لی تھیں۔ یہ موجودہ تمدن کے ساتھ نہیں چل سکتیں' لیکن اصل م
پیش آیا ہمارے مسلم معاشرے کو' وہاں توحید کا ایک مفہوم ہے' اس کے حدود معین
کہ یہاں تک ایمان ہے۔ اس کے بعد کفر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ ایک وقت
آدمی کئی مذاہب کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ ایک وقت آدمی توحید و شرک کو جمع نہیں
اور یہ خیال کہ مغرب سب کچھ ہے اور نئی قیادت کا اہل ہے' پھر اس کے بعد رس
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دائمی و عالمی رہنما اور معیار ماننا' اقبال ہی کے الفاظ میں کہ۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ● غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دانائے سبل' ختم الرسل' مولائے کل بھی۔
اور مغربی تہذیب کو حرف آخر بھی سمجھے' سائنس کو علم کی معراج بھی سمجھے۔ دونوں باتیں
نہیں ہو سکتیں۔ اسلئے بے چینی ان ملکوں میں نہیں ہو سکتی جہاں مذہب کا کوئی مثبت
نظام نہیں تھا جس کو کسی بات پر اصرار نہیں کہ یہ ہدایت ہے۔ یہ ضلالت ہے۔
فماذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون۔ ہدایت کے بعد ضلال

علاوہ باقی کیا رہتا ہے، وہ کہتا ہے نور ایک ہے ظلمات بے شمار ہیں، آپ قرآن مجید میں دیکھئے کہیں نور کی جمع استعمال نہیں ہے، کیا عربی میں نور کی جمع آتی نہیں؟ کوئی طالب علم کہہ دے "انوار" آتی ہے۔ آپ کے یہاں کتنے بھائیوں کے نام انوار ہوں گے۔ ممکن ہے دو چار انوار یہاں بھی مل جائیں، تو نور کی جمع نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ غیر فصیح بھی نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں نور ایک ہی ہے اور ظلمات کا کوئی حساب و شمار نہیں، ظلمات ایک کروڑ بھی ہو سکتی ہے لیکن نور ایک ہوگا، "وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ" جس کے لئے اللہ کی جانب سے نور نہ ملے اس کے لئے نور کا کوئی اور ذریعہ نہیں اور سرچشمہ نہیں، جس مذہب کی اور دین کی فطرت یہ ہے کہ اس پر اس کو اصرار ہے کہ تنہا وہی حق ہے، جس کو اس پر اصرار ہے کہ عقیدہ و ایمان کے حدود معین ہیں، اس کو اس پر اصرار ہے کہ اسلام ایک متعین شکل رکھتا ہے، خالص عقائد کا نام اسلام ہے، جب مغربی تہذیب اپنے پورے تصورات کے ساتھ، پورے نظام حیات کے ساتھ، پورے مقاصد کے ساتھ آئی، تو اس کا اسی سے ٹکراؤ لازمی تھا، ٹکراؤ ہوا، اور غضب ہوا، پھر اس کے بعد ایک دوسرا سانحہ یہ پیش آیا کہ اس ملک و قوم کے ذہین کھاتے پیتے گھرانے کے نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی اور عوام کی یہی حالت رہی ہے، وہ اسی مسئلہ کو اپنے سینے سے لگائے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ عوام کے تصورات اور عوام کے احساسات و جذبات سے اتنا بیگانہ ہو گیا کہ جیسے ایک نئی قوم پیدا ہوتی ہے۔ یعنی دو نئی قومیں پیدا ہو گئیں اور دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے محسوس کیا اور تجربہ کے بعد یہ کر یہ معلوم ہوا کہ اگر وہ زندگی چاہتا ہے، قیادت باقی رکھنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ عوام کے دین و ضمیر کو یا اپنا [illegible] [illegible]

یہاں تک کہ شاعری کے ذریعہ عوام کی [illegible] دینی حمیت کو، اس اسلامی غیرت کو اور ان کی اس ذکاوت حس کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی، اب مستقل معرکہ پیش آیا۔ ان ملکوں کو کہ انھوں نے دیکھا کہ اگر یہی رہنا ہے تو عوام اگر اسی طرح رہے، ان کے یہی احساسات و جذبات رہے تو کبھی یہ عوام ہمارے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں، یہ میں کہانی سنا رہا ہوں آپ کو مصر کی، شام کی، عراق کی، ترکی کی، میں نہیں کہتا کہ یہ ہر ملک کی کہانی ہے، اور خدا کرے اس ملک میں یہ ڈرامہ کبھی اسٹیج نہ ہو، لیکن یہ ترقی یافتہ مسلم ممالک کی کہانی، ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو اسلام سے نہ صرف یہ کہ بے گانہ تھا بلکہ اس کو اس سے ایک طرح کا بعد اور وحشت تھی، یہ عوام ہمارا کیا مقابلہ ہے، یہ بالکل چھوئی موئی بن گئے ہیں، کبھی کسی نے ہاتھ لگایا اور وہ سمٹ گئی، شرمائی تو کیا عوام بالکل جذباتی ہیں، ان کا عقیدہ اتنا مرکز رہے، اسے بھی الگ کر [illegible] تو پھر ان میں کونسی ایسی مصیبت آگئی اور اگر ملک میں یہ سب کچھ کھلایا جاتا ہے اور اس سے لڑکوں اور لڑکیوں پر اثر پڑتا ہے تو ایسی کیا قیامت آجاتی ہے؟ وہ کمائیں، پیسے پیدا کریں اور کاروبار کریں، دولت پیدا کریں، ان کو اس سے کیا تعلق ہے، مذہب تو ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، ان کے استادوں نے اور مغرب کی تعلیم نے ان کے دل و دماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ مذہب تو ایک شخصی معاملہ ہے اور مذہب کی بقا بھی اسی میں ہے کہ شخصی معاملہ رہے اور اب دنیا اسی طرح چل سکتی ہے کہ مذہب شخصی معاملہ کہا جائے۔ ان کے ذہن نے پہلے سے اس کو قبول کر لیا، اب یہاں وہ آئے تو دیکھا کہ عوام حکومت کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں، تنقید کرتے ہیں، بات بات میں متاثر ہو کے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا۔ جمال عبد الناصر کے دور میں مصر میں اسلام کے خلاف معرکہ [illegible] اور اس کی مشنری لگ گئی۔ فوج، پولیس [illegible]۔ مصر کے سارے رسائل و جرائد، اور مصر کے سارے [illegible] آزاد [illegible] اور جو [illegible] برسر حکومت تھی اس کی ساری طاقت [illegible] کے [illegible] جو [illegible]

یہ ملک کی سمت استبداد کر گئی تھی جو دور جمال عبد الناصر کی لیڈر شپ کا تھا۔ یہ بجائے اسرائیل سے لڑنے کے ' بجائے کمیونزم سے لڑنے کے ' بجائے الحاد سے لڑنے کے ' یہ پھر امن شہریوں سے لڑنے میں مصروف تھا ' اور ان دینی اور اسلامی تحریکوں کے ختم کرنے میں مصروف تھا اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ' اس کے اثرات کہاں تک باقی ہیں ' یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہی حقیقی جنگ تھی جو وہاں لڑی گئی ' یہی حقیقی جنگ ہے جو شام و عراق اور لیبیا و تونس ' الجزائر ' اور مراکش میں لڑی جا رہی ہے ' کہیں گرم ' کہیں سرد ' عالم عرب کے ملکوں کے علاوہ کسی غیر عرب ملک کا نام نہیں لوں گا۔

یہ مصنوعی کارزار پیدا کیا ہے ان دو فلسفیوں نے ان دو متوازی نظام تعلیم نے ہمارے مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ تو قال اللہ و قال الرسول کی تعلیم ہے لیکن یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اس کی نفی کی تعلیم ہے ' جب انگریزی دور اقتدار (غیر منقسم) ہندوستان میں آیا اور انگریزوں کا نظام تعلیم آیا تو اکبر نے وہ شعر کہا جس سے بہتر شعر جدید لا دینی نظام تعلیم اور اس کے دور رس نتائج کے متعلق آج تک کسی نے نہیں کہا ہے ' مغربی نظام تعلیم کے اثرات کے بارے میں اس سے زیادہ سادہ الفاظ میں اس سے زیادہ گہری حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا ● افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

انہوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ فرعون نے اپنی حماقت اور کند ذہنی سے خواہ مخواہ اپنے خلاف اتنا بڑا ہنگامہ کرایا اور اپنے لئے اتنی مشکلات پیدا کیں کہ آج تک بعض اسلامی ملک میں وہ علامت ہے جبر و استبداد کی ' وہ نظام تعلیم بدل دیتا تو بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی ' بجائے جبر کی جہالت کی ایک علامت سمجھ لینے کے علم کا سرپرست مانا جاتا ' مربی مانا جاتا ' اس کے نام سے کتنی یونیورسٹیاں قائم ہوتیں ' کتنی اکاڈمیاں قائم ہوتیں ' مسلم ممالک عرب میں بھی مغربی نظام تعلیم سے اسی سے کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔

پھر ایسے ملک کو جس کو اسلام کی خدمت کرنی ہے اور جس کو اسلام کا احیاءِ ثانیہ کرنا ہے اپنے ملک کو اس ذہنی کشمکش سے بچانا چاہیئے۔ اسلئے کہ اس ذہنی کشمکش کے شروع ہوجانے کے بعد پھر وہ ساری ذہانتیں اور قوت عمل، وہ سب کی سب اس میں لگ جاتی ہیں، جو ملک کی تعمیر میں، ملک کو مستحکم کرنے میں، عالمیت کی حفاظت میں جو توانائیاں صرف ہونی چاہیئں وہ صرف ہوتی ہیں، کون جیتے، کون ہارے، کس کا فلسفہ اخلاق، کس کا فلسفۂ مابعد الطبیعات کس کا فلسفہ حیات غالب اور کارفرما ہے۔

علامہ اقبال موجودہ نظامِ تعلیم سے غیر مطمئن تھے۔ وہ اسلامی ملکوں میں اس نظامِ تعلیم کے نافذ ہونے سے ہراساں و ترساں رہتے تھے۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو شاید مطالبہ اس کا کرتے کہ سب سے پہلے نظامِ تعلیم بدلا جائے اس لئے کہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ تیزاب ہے جس میں انسان کی خودی کو ڈال کر بالکل تحلیل کردیا جاتا ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ● ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب ● سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

عمان میں ایک مکالمہ تھا۔ استاد کامل الشریف وہاں کے وزیر اوقاف ہیں، اور سعودی عرب کے ایک فاضل شیخ احمد جمال، تینوں سے سوال کئے جارہے تھے۔ یہ مکالمہ ریڈیو پر بھی نشر ہوا تھا۔ مجھ سے کہا گیا، اس وقت کی سب سے بڑی مصیبت خصوصاً نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے۔

میں نے کہا، زندگی کا تضاد، وہ بیک وقت اتنی متضاد چیزیں دیکھتے ہیں، گھر کا نقشہ کچھ دیکھتے ہیں، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں، اسکول یا کالج جاکر کچھ سنتے ہیں، ادب پڑھتے ہیں اور لٹریچر دیکھتے ہیں تو اس میں کچھ اور دعوت پاتے ہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر وہ تفریح حاصل کرتے ہیں، وہ ان کو کچھ اور دیتا ہے۔ اس نے ایسا کنفیوژن (CONFUSION) پیدا کردیا ہے، ایک ایسا ذہنی تضاد اور انتشار پیدا کردیا ہے کہ

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

سید محمد عبد الستار
ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ریٹائرڈ

صحیح طریقہ طلاق

طلاق کے لغوی معنی قید دور کرنے کے ہیں۔ اصطلاح فقہ میں خاص قید نکاح کے دور کرنے کا نام طلاق ہے۔ طلاق ایک برا اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ جس کی اجازت اسلام نے اس وقت دی ہے جبکہ دو شوہر اور بیوی کے درمیان ایک ایسا بگاڑ پیدا ہوجائے جو کسی صورت میں دور نہ ہوسکے اور اس کو سلجھانے کا سوائے طلاق کے کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف ہے کہ "حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے" (ابوداؤد۔ ابن ماجہ اور حاکم)۔

میں طلاق کے چند اہم اصول اور شرائط بیان کرنے کے بعد عام معلومات کیلئے صحیح طریقہ طلاق کی وضاحت کروں گا۔ اہم اصول اور شرائط طلاق درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱)۔ شوہر کا عاقل بالغ اور مفہوم کو سمجھنے کا اہل ہونا چاہیئے۔ ان امور کے سوا اور کوئی چیز صحیح طلاق کے دینے میں مشروط نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص زبردستی یا ہنسی یا مذاق یا حالت نشہ میں غصہ میں طلاق دیدے تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ البتہ کسی پہ غصہ کا اس قدر غلبہ ہو اور اس پہ جنونی کیفیت طاری ہوجائے تو ایسی حالت میں دی ہوئی طلاق قابل قبول نہ ہوگی۔

(۲)۔ طلاق کا حق مرد (شوہر کو) ہے۔

(۳)۔ طلاق کے لئے گواہ کا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ البتہ گواہ ہوں تو بہتر ہے۔

(۴)۔ طلاق کے لئے بیوی کی حضوری یا اس کے کسی داشتہ کی موجودگی بھی ضروری نہیں ہے۔

(۵) طلاق کے لئے کسی زبان کی خصوصیت ضروری نہیں ہے۔ جس زبان میں چاہے طلاق دیدی جاسکتی ہے۔

(۶)۔ طلاق اصالتاً وکالتاً اور مختارتاً دی جاسکتی ہے۔ مختار کے ذریعہ طلاق دینے کو تفویض طلاق کہا جاتا ہے۔

(۷)۔ بیوی کا طلاق قبول کرنے سے انکار وقوع طلاق پر اثر پذیر نہیں ہو سکتا

(۸)۔ طلاق لفظ صریح سے بھی دی جاسکتی ہے اور کنایہ سے بھی۔ طلاق صریح میں لفظ طلاق کا استعمال کرنا ضروری ہے اور طلاق کنایہ میں لفظ طلاق استعمال نہ کیا گیا ہو البتہ اس لفظ سے زوجیت ختم کردینے کا مفہوم نکلتا ہو۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے "میں نے تجھے چھوڑ دیا" "عدت میں بیٹھ" بصورت ابہام اس کا تصفیہ شرعی قاضی یا عدالتی ڈگری سے ہوگا۔

(۹)۔ طلاق کے وقوع کے لئے نسبت زوجہ کی جانب ہونا ضروری ہے ورنہ طلاق نہ ہوگی مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ حمیدہ جو میری بیوی ہے اسے طلاق ہے یا طلاق دیدی

(۱۰)۔ طلاق دینی وجہ کی بناء پر دی جائے تو مباح اور مستحب ہے۔ اگر طلاق ضرر رسانی کی غرض سے دی جائے تو مکروہ۔

سطور ذیل میں صحیح طریقہ طلاق کے متعلق وضاحت کی جاتی ہے۔

طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) طلاق احسن (۲) طلاق حسن (۳) طلاق بدعی یا

طلاق احسن کی صورت یہ ہے کہ ایک طلاق رجعی اس طہر میں دی جائے جس طہر میں جماع نہ ہوا ہو تو پھر دوسری طلاق نہ دے یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہوجائے۔ طلاق حسن وہ طلاق ہے کہ زوجہ کو تین طلاق بہ تفریق طہر دی

اور جماع نہ ہوئی ہو۔ جس عورت کو حیض نہ آتا ہو اُس کو تین طلاق بہ تفریق تین مہینوں میں دی جائیں۔ طلاق بدعی وہ طلاق ہے جو حالت حیض میں دی جائے یا ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں۔ اول الذکر کی دو طلاقوں میں نکاح فوری ختم نہیں ہوتا بلکہ ختم عدت تک باقی رہتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں شوہر کو یہ اختیار ہے کہ اندرون عدت بیوی کو لوٹا لے یعنی رجوع کرلے۔ عدت گذرنے کے بعد اگر مرد اور عورت پھر ساتھ شوہر اور بیوی کی طرح رہنا چاہیں تو باہمی رضامندی سے جدید نکاح کر سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں جدید مہر باندھنا ہوگا۔ یہ دونوں طریقے طلاق رجعی کہلاتے ہیں۔ دوسرا طریقہ طلاق جسے طلاق بائن کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شوہر نے طلاق کی نیت سے بیوی سے کہا کہ میں تیرا شوہر نہیں یا تو میرے اُوپر حرام ہے۔ ایسی صورت میں طلاق بائن واقع ہوگی۔ طلاق بائن میں نکاح فوراً ختم ہوجاتا ہے۔ اب اگر مرد اور عورت پھر بحیثیت میاں بیوی ساتھ رہنا چاہیں تو باہمی رضامندی سے حلالہ کئے بغیر دوبارہ نکاح کر کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اس جدید نکاح کے ساتھ مہر بھی جدید ہوگا یہ نکاح عدت کے اندر بھی ہوسکتا ہے اور عدت گذرنے کے بعد بھی تیسرا طریقہ طلاق مغلظ کہلاتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ایک مجلس میں کوئی شوہر اپنی زوجہ کو ایک ساتھ تین طلاق دیدے۔ اس طلاق کے وقوع کے بعد زوجین بغیر حلالہ کئے ایک دوسرے کے ساتھ جدید نکاح نہیں کر سکتے۔ الاّ اس کے کہ زوجہ عدت کے بعد کسی اور شخص کے ساتھ نکاح کرے اور اس کے ساتھ ہم بستری بھی ہو۔ پھر وہ شخص اس عورت کو طلاق دیدے یا مر جائے تو طلاق کی صورت میں عدت طلاق وفات کی صورت میں عدت وفات کے گذرنے [illegible]

حکم دیتے ہیں اور اصحاب تشیع ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو لغو اور ناجائز سمجھتے ہیں۔ حضرت امام تیمیہؒ کی وہ واحد شخصیت ہے جس نے اس اجماع کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ کہ ایک مجلس کی تین طلاق "تطلیقات ثلاثہ" چونکہ حرام ہیں اور لغو قرار پاتی ہیں اسلئے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو رجعی قرار دیا لیکن اجماع کی موجودگی میں اس انفرادی فتویٰ کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اگر کسی شخص کو طلاق دینے کی ضرورت لاحق ہو تو قطعی طلاق مغلظہ نہ دے۔ اسلئے کہ طلاق مغلظہ نصوص صریحہ کی بنا پر گناہ اور قابل سزا جرم ہے۔ مسلمانوں کا امیر قاضی اس شخص کو سزا بھی دے سکتا ہے۔ مثلاً کوڑے مارے یا جیل میں ڈالے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اکثر اسلامی ممالک اور بالخصوص ہندوستان میں ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا عام رواج ہے۔ فوری جذبہ کے تحت لوگ ایسا کر بیٹھتے ہیں اور بعد میں نادم ہوتے ہیں اور حلالہ کی کڑی شرطوں سے بچنے کے لئے شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں یا طلاق ہی سے انکار کر دیتے ہیں یا طلاق کو مخفی رکھ کر مطلقہ بیوی کے ساتھ بدستور سابقہ تعلقات برقرار رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی زندگی شرعی اعتبار سے گناہ گاری ہوگی۔ اور اگر اولاد ہو تو وہ حرام قرار پائے گی مقام تعجب ہے کہ بعض جاہل اور ناواقف لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ہی صحیح طلاق ماننے پر اصرار کرتے ہیں۔ جب ان کو اس ناجائز عمل کا علم ہوتا ہے تو اپنی اصلاح کے لئے لوگوں سے مشورہ لے کر مزید غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا کہ ایک مرتبہ مجھ سے ایک شخص نے ایک واقعہ بیان کیا کہ [illegible] کہ [illegible] نے ایک شخص کو جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں [illegible] دی تھیں مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ تین [illegible] ختم ہو جائے گی اور اپنی بیوی کو رجوع کر سکتا ہے۔ مجھ سے معلوم کیا کہ آیا [illegible] والوں کا یہ مشورہ صحیح ہے تو میں نے اس شخص کو اس مسئلہ کے شرعی [illegible]

کرانے ہوئے اس مشورہ کو غیر صحیح ہونا بتلایا اور صاف صاف بتلا دیا کہ تین رات مسجد میں سونا ایک مجلس کی تین طلاق کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ حلالہ کی شرط کی تکمیل کے بغیر اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع ہی نہیں کر سکتا۔

متذکرہ بالا واقعہ اور دیگر تلخ حقائق کی روشنی میں اس مسئلہ کے صحیح شرعی موقف سے عوام کو واقف کروانا ازبس ضروری ہے۔ ہمارے علماء فقہا اور قانون دانوں پر بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ عوام کو قرآن اور سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین اور تفہیم کریں۔ ایک مجلس کی تین طلاقوں سے متعلق حدیث "رکانہ" خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کو ابو داؤد نے روایت کی ہے۔ رکانہ ایک صحابی تھے جنہوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدیں۔ رکانہ نے متاسف ہوکر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ "واللہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق رجعی دینے کا تھا تو حضور نے بحیثیت جج کے ان کے حلفی بیان پر اس واقعہ کو رجعی طلاق قرار دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی روشنی میں غلطی سے تین طلاق بیک وقت دینے والے کا ارادہ صرف ایک طلاق دینے کا تھا تو وہ شخص قاضی یا حاکم عدالت کے پاس پیش ہوکر اپنے حلفی بیان کے ذریعہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو قاضی یا جج کے حکم سے ایک رجعی طلاق کی صورت میں بدلوا سکتا ہے۔ ایسا اختیار کسی قاضی یا جج کو دینے کے بجائے طلاق احسن و حسن جو رجعی طلاق ہے استعمال کرتے ہوئے بہت سی پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں طلاق کے متعلق بہت صریح اور صاف احکام موجود ہیں۔ عام طور سے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ طلاق کے سلسلہ میں یہ بات بہت اہم ہے کہ قرآن مجید میں شوہر اور بیوی کی طرف سے تنازع یا اختلاف کی صورت میں دو حکم مقرر کئے جانے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کریم کے رو سے اگر میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے تو ایک حکم

شوہر کی طرف سے، اور ایک حکم بیوی کی طرف سے مقرر کرے اور وہ دونوں پنچ یا حکم
اور بیوی کے مابین صلح صفائی پیدا کروائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکمین کے
کو آخری اور قطعی قرار دیا ہے اور حکمین کو یہ اختیار ہے کہ وہ طلاق کو قائم رکھیں
رد کریں۔ امام مالک کی بھی اس بارے میں یہی رائے ہے (مؤطا) حکومت پاک
نے قرآن اور سنت کی روشنی میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ طلاق کے تعلق سے
احکام نافذ کئے ہیں جو عورتوں کے لئے راحت کا باعث بنے ہیں۔ یہ واضح کر
ضروری ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں جو بدعت ہیں ترک کی جائیں اور عورتوں کے
سے قرآن مجید نے جو معروف اور احسان کا ذکر کیا ہے اس کو اختیار کریں تو اس
عورتوں کو بڑی راحت ملے گی۔ اس کے برخلاف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص از
بذریعہ وکیل، بیوی کے خلاف جذبہ انتقام کے تحت اور طلاق کے جواز کو ثابت
کرنے کے لئے بیوی کے خلاف الزام تراشیوں سے کام لیتے ہوئے اخبارات میں اشتہار
اور اعلانات دینے کا عام رواج ہو گیا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان
اعلانات میں ایسے رکیک اور مذموم الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن سے
عورت کی توہین ہوتی ہے بلکہ عورت کی عظمت اور عزت نفس کو دھکہ پہنچتا۔
ایسے نامناسب اور نازیبا حرکات سے باز رہنا از بس ضروری ہے تاکہ
شائستگی کا معیار قائم رہے۔ ●●

(اس مضمون کی تیاری کے ضمن میں ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری، ...
... فی ملا، حقوق زوجین مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ...
شرعیہ مرتبہ صدارت العالیہ محروسہ سرکار عالی سے مدد لی گئی ہے)

محمد اسحاق

سوشیل سرویس کے نتائج

اہمیت و افادیت

سال ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ آندھراپردیش میں پہلی مرتبہ تلگو دیشم پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے چیف منسٹر این ٹی راماراؤ نے کچھ ہی دنوں میں اعلان کیا کہ ریاست کی ایسی بیواؤں کو جن کی عمر پچاس برس سے زائد ہو اور بے سہارا رہ گئی ہوں، انھیں حکومت کی جانب سے پچاس روپے ماہانہ تاحیات وظیفہ منظور کیا جائے گا۔ یہ ایک غیر اہم خبر اخبار "سیاست" کے کسی کونے میں شائع ہوئی تھی۔ ایک غریب بیوہ اپنے مکان آتی جاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو۔ تمہاری قسمت چمک گئی۔ چیف منسٹر نے اعلان کیا ہے کہ بیواؤں کو ماہانہ پچاس روپے، تاحیات وظیفہ ملے گا۔ بس اتنا کام کرو کہ ناپملی اسٹیشن روڈ پر کلکٹر آفس ہے۔ وہاں پہ فارم ملے گا۔ یہ تلگو میں ہوگا۔ اس فارم کی خانہ پری کر کے کسی گزیٹڈ افسر کی تصدیق اور اپنی فوٹو کے ساتھ ایک مہینہ کے اندر اندر اسی آفس میں داخل کر دو۔ پھر کیا ہے مزہ ہی مزہ ہے۔ میری اس ساری تقریر کا اس بوڑھی بیوہ پہ ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اور نہ اس نے کسی مسرت کا اظہار کیا بلکہ حسرت سے ایک سرد آہ بھری اور یوں کہنے لگی۔

س ۔ یہ فارم کہاں سے لانا ہوگا۔

ج ۔ بس یہیں تو کلکٹریٹ آفس ہے۔ وہاں چلے جاؤ، فارم مل جائے گا۔

س : آنے جانے کے لئے کم از کم رکشا کے لئے دو تین روپے ہوں گے ' وہ کہاں سے لاؤں

ج : چلو میں دیدوں گا ۔ تم لوگوں کو تو بہانہ چاہیئے ۔

س : اچھا تو وہاں افسر سے ہمیں کون بات کرنے دے گا ۔ پہلے تو اندر ہی جانے نہ دے گا ۔

ج : دیکھو دفتر میں یوں ہی کام نہیں بنتا ۔ وہاں کے اسٹنڈر کو آٹھ آنہ روپیہ دیدینا ۔

س : یہ فارم کون بھرے گا ۔ کون افسر ہمارے لئے تصدیق کرے گا ۔ وہ بڑا افسر کہاں رہتا ہے ۔

ج : بس بس تم لوگ تو اپنے سے کچھ حرکت ہی کرنا نہیں چاہتے ۔

ج : ہاں ہماری قسمت ہی کچھ ایسی ہے ۔ سرکار کیا دیتی ہے ۔ کس کو دیتی ہے اور کتنا دیتی ہے ۔ ہم لوگ بھی سنتے ہیں ۔ لیکن کون خدا کا بندہ ایسا ہے جو ہماری فریاد سنتا ہے ۔ کون ہماری مدد کرتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

یہ بڑھیا چلی گئی ۔ اس کو وظیفہ کی اطلاع دے کر پہلے تو کچھ ایسا محسوس کیا کہ میں نے اس پر بڑا احسان کیا ہے ۔ جب اس کی حسرت آگیں باتیں سنیں تو شرم آئی کہ ہم صوفوں پر بیٹھ کر بہت سی باتیں کرتے ہیں اور ایسا ہونا چاہیئے وہ ہونا چاہیئے ۔ جہاں کہیں آپ سنیں گے سب کی تان " چاہیے پر آکر ٹوٹ جاتی ہے ۔ دل میں خیال آیا کہ بس یہی دو ٹکے کا کام کرکے بتلادو تو معلوم ہوگا کہ غریب اور حکومت کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے ۔ اپنے محلے میں اور بھی چھ سات بیواؤں کا پتہ چلا ۔ کلکٹر آفس سے فارم لائے گئے ۔ اور ضروری تکمیل کے بعد داخل کر دئے گئے ۔ کوئی چھ ماہ گزر گئے ۔ ایک دن وہی بیوہ چھوٹا سا بسکٹ مٹھائی کا لے کر حاضر ہوئی ۔ اسے تین ماہ کا وظیفہ ڈیڑھ سو روپے ذریعہ منی آرڈر اسی روز مل چکا تھا ۔ معلوم ہوا کہ اور بھی تین بیواؤں کو یہ وظیفہ منظور ہوا ۔

ریاست بھر میں ہزاروں ہوائیں ایسی ضرور ہوں گی جنھیں آج تک بھی یہ پتہ نہ ہوگا کہ حکومت نے کبھی ایسا اعلان بھی کیا تھا۔ سینکڑوں پڑھے لکھے لوگوں نے سرسری طور پر اس خبر کو دیکھا ہوگا لیکن کبھی انھیں یہ خیال نہیں آیا کہ محلہ کی کم از کم ایک بیوہ کے لئے کچھ مدد کر دیں۔ اسی بات کا تذکرہ ایک بزرگ کے سامنے آیا جو ایک مذہبی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں اور جن کے پاس سوشیل سرویس کا ایک مستقل شعبہ بھی ہے۔ کہنے لگے در اصل یہ کام ہمارے ہی کرنے کا تھا۔ افسوس کہ وقت گزر گیا۔

اسی زمانے میں یہ راقم گورنمنٹ سرویس سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ سامنے وقت ہی وقت تھا۔ اب مشورے ہونے لگے کہ بندہ کو کیا کرنا چاہیئے۔ ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق رائے دی۔ راشن شاپ کھولنے سے لے کر ریڈیو ٹی ٹک۔ ایک قابل احترام بزرگ نے ایک ایسا مشورہ دیا جنھوں نے ساری زندگی ایسا کوئی کام بھول کر بھی نہ کیا تھا۔ "کچھ سوشیل سرویس کیجئے" بیکار کے کام بہت مل جاتے ہیں۔"

محلہ بازار گارڈ میں ایک سلم ایریا (SLUM AREA) تھا جس کا آسان ترجمہ "گندی بستی ہے" جو شہروں میں ایسے محلوں کے لئے مخصوص ہے۔ جو شہر کی عالی شان، خوبصورت عمارتوں کے بیچ غریبوں کی جھونپڑیوں کے جزیرے ہیں۔ جن کی گندگی کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی چند منٹوں کے لئے اس بستی سے گزرے ہوں۔ میونسپلٹی کے اربن کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں یہ بستی دس برسوں سے منظورہ پلان میں تھی کہ اگر یہ لوگ اپنا مکان پکا بنا لینا چاہیں تو سرکار سے سات ہزار روپے بطور قرض منظور کئے جائیں گے۔ کچھ بلدیہ کے افسر اور اس آبادی کے لوگ بھی میرے پاس آئے کہ انھیں کچھ وقت دیجئے۔ یہ ۲۰۶ خاندان تھے۔ اور ان جھونپڑیوں میں کوئی دو سو افراد بستے تھے۔ اس پروجکٹ کی مشکلات کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ بے خطر اس سوشیل سرویس میں کود پڑا۔ بلدیہ سے ایک لاکھ بیاسی ہزار روپے دو برس کی مدت میں دس اقساط میں سینکڑوں چکر لگانے کے بعد

لے۔ پھر یہ اندازہ ہوا کہ یہ رقم بالکل ناکافی ہے۔ کوئی ساٹھ ہزار کی رقم چندہ کے ذریعہ اکٹھی کی گئی۔ یہ کام تو اور بھی مشکل ہے "جان حاضر ہے مگر چندہ کس کے پاس ہے" بہرحال دو سال کی مدت میں ۳۶ پختہ مکانات بن گئے۔ اب اس کا نام "فل کالونی" ہے۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر حسن صفا نے نوجوان طلباء سے خطاب کرتے ہوئے بڑے کام کی بات بتلائی۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سوشل سروس کے ذریعہ غریب مخلوق کی خدمت کے کئی مواقع ہیں۔ اپنی طبیعت، ذوق، وجدان کے مطابق زندگی میں کسی نہ کسی کام کو لے لو۔ اس لئے کہ مخلوق کی خدمت اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ اگر تم جرمنی یا انگلستان چلے جاؤ اور وہاں کچھ سوشل سروس کرنا بھی چاہو تو وہاں کوئی موقع نہیں ملے گا۔ وہاں پر فلاحی حکومتیں ہیں اور آپ کی مہربانیوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہندوستان میں آبادی کی کثرت، غربت اور جہالت کی وجہ ملک کے ہر شہر اور ہر بستی میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں پر آپ اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔

کوئی پندرہ برس سے امریکہ میں چند ماہرین اس بات کی ریسرچ میں لگے ہوئے ہیں کہ "وہ کیا راز ہے کہ سوشل سروس میں مشغول لوگوں کی صحت نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں اور شرح اموات بھی کم ہے"۔ مشی گن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے ۱۴ برس تک (۲۷۰۰) افراد پر اپنی ریسرچ جاری رکھی اور بتلایا کہ ایسے لوگ جو کسی سوشل سروس کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے ان میں شرح اموات دوسروں کے مقابلہ میں ڈھائی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ہان سلی J. HANSALLY اس ریسرچ کا ماہر اول ہے لکھتا ہے کہ "دوسروں کے کام آنے سے لوگوں کی مشکور نظریں اور احسان مندی کے سچے الفاظ دماغ کے ان خلیوں کو تازگی بخشتے ہیں جن کا تعلق راحت و مسرت سے وابستہ ہے جو زندگی اور صحت کے لئے ضروری ہیں۔ اسی طرح ماہرین امراض قلب کا کہنا ہے کہ "دل جلا" (ANGRY HEART) بہت زیادہ امراض قلب میں گرفتار رہتا ہے۔ دل کی شریانوں پر اس کا اثر پڑتا ہے۔

ان میں حرکت قلب بند ہو جانے کے زیادہ امکانات پائے ہو گئے (ریڈرس ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۹۰ء)

عیسائی مشنریز میں خلق خدا کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کا ایک سلسلہ ہے۔ نوبل انعام یافتہ مدر ٹریسا کی مثال سامنے ہے۔ ہزاروں بے سہارا بچوں، غریب ولاچار لوگوں، یتیموں اور بے سہارا عورتوں کے لئے یہ رحمت کا فرشتہ بنی ہوئی ہے کروڑوں کی رقم ساری دنیا کے دولت مند اور دردمند "نذر" کے نام پر بھیجتے رہتے ہیں جن کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ ساری دنیا کے لوگوں نے کوئی پچاس ساٹھ برس سے اس کے کام کو پرکھا ہے، دیکھا ہے اور سمجھا ہے کہ یہ خالص سونا ہے۔

ایک اور نادر مثال پاکستان کے عبد الستار ایدھی کی انگریزی اخباروں کے کے ذریعہ پڑھنے میں آئی۔ ساری دنیا میں اس ایک شخص کے کام کی دھوم ہے سوچو تو حیرت ہوتی ہے کہ اس ایک شخص نے کیا کیا کام کر دکھایا ہے۔ ۲۲ سال کی عمر میں تقسیم ہند کے وقت گجراتی مسلمان پاکستان آیا۔ اب اس کی عمر ۶۲ سال ہے۔ "ایدھی ویلفیر سنٹر" میں ایک ہوائی جہاز، کشتیاں کا بیڑہ، چارسو امبولینس کاریں ہیں جو دن رات غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لئے سارے ملک میں دوڑتے رہتے ہیں۔ ۲۴ سنٹر میں کوئی تیس ہزار مریضوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ ۱۳ دواخانوں میں پانچ ہزار سے زیادہ مریض شریک ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے تین ہزار ڈاکٹر، نرسس اور دوسرے لوگ مشغول ہیں۔ ایدھی نے اب تک چالیس ہزار لاوارث نعشوں کو دفن کرنے کا انتظام کیا ہے۔ آدھی رات کو کوئی اس کا دروازہ کھٹکھٹائے وہ اسی وقت ان کی مدد کے لئے چل پڑتا ہے۔ اکثر تو وہ خود [illegible] اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے! اس کا کہنا ہے کہ "... پاکستان ... [illegible]" [illegible]

[illegible]

نہایت [illegible] اور [illegible] میں [illegible]

آشکار ہو۔ ایدھی انٹرنیشنل سنٹر نیویارک" اور اس کی شاخ لندن کے ذریعہ ہزاروں لوگ فیاضانہ روپیہ اس سنٹر پر بھیجتے رہتے ہیں جس کی مقدار سالانہ پانچ کروڑ سے زیادہ ہے۔ ایدھی دو روپے کی رسید بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتا ہے۔

اوپر کی دو مثالوں سے آپ کو ضرور اس بات کا اندازہ ہوا ہوگا کہ انھوں نے کام شروع کرنے سے پہلے نہ تو پیسہ کی پرواہ کی اور نہ ہمدردوں کو آواز دی۔ کام شروع کر دیا۔ لوگ آتے گئے قافلہ بنتا گیا اور رواں دواں ہوتا گیا۔ آخر ان میں خاص بات کیا ہے۔ یہی بس اخلاص، ایثار اور خلق خدا کی خدمت کا شدید جذبہ، یہ کچھ ایسی نادر صفات ہیں جن کے ناقابل یقین اور ہوش رُبا کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں۔

سوشیل سرویس کے لئے چھوٹا بڑا کام سب برابر ہے۔ اپنے اطراف دیکھیں تو ایسے کئی کام آپ کو آواز دے رہے ہیں۔ آدمی کسی اچھے کام کے شروع کرنے کے لئے بہت سوچتا ہے۔ کرنے یا نہ کرنے کی سوچ میں ساری زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے اور یہ تذبذب اسے لے ڈوبتا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کسی اچھے کام کے شروع کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم اُٹھانے والے اس دُنیا میں کتنے ہیں۔ ●●

پروفیسر ڈاکٹر ثمینہ شوکت
سابق صدر شعبہ اُردو سنٹرل یونیورسٹی
تلک نگر۔ حیدر آباد۔۴۴

عظیم مجاہدِ آزادی مُحب وطن

حسرت

فضل الحسن حسرت موہانی ادب کی تاریخ میں وہ مسیحی نفس شاعر ہے جس نے غزل کے جسد مُردہ میں نئی جان ڈال دی تھی۔ مولانا حالی کی اصلاحی اور اجتہادی تحریکوں کی بدولت غزل ایک فرسودہ، واماندہ اور پژمردہ بلکہ مردہ صنف سخن بن چکی تھی۔ حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اِسے ہر دم جوان، تمام رواں حیاتِ نو بخش دی۔ سوزِ جگر بخشا۔ خونِ دل سے آبیاری کی۔ میر کے سوز اور مومن کے گداز کے دو رنگوں کو اپنے رنگ میں سمو کر حالی نے جس شاعری کو "ناپاک دفتر" سے تعبیر کیا تھا۔ اُسے ایک تازہ و آبدار گلدستہ بنا دیا۔ موضوع اور ہیئت دونوں کو تہذیب و تزئین بخش دی۔

حسرت نہ ہوتے تو وارداتِ عشق کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی نہ ہوتی جو آج کی اُردو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظر اور نظارے کی یہ پہچان 'بصارت اور بصیرت کے فرق سے آگہی اُردوئے معلیٰ میں "انتخابِ سخن" کے نام سے اساتذہ کے دواوین کے انتخاب کی بدولت ہوئی۔ رئیس المتغزلین حسرت اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے ایک باشعور انسان تھے۔ ماحول اور معاشرے سے بھرپور آگہی رکھتے تھے۔ معاشرے

میں ساحرِ افرنگ کی پیدا کردہ زبون حالی، خلفشار اور انتشار کا ایسا شدید احساس کا ادراک تھا کہ شاعرِ رنگین نوا کو سیاست کے خارزاروں میں اُلجھنا پڑا۔ یہی سیاسی حقیقت حسرتؔ کے حق میں جیل کی سختیوں اور "چکی کی مشقت" کا موجب بنی۔ رئیس الاحرار کہلائے۔ آزادی کی جنگ میں بے طبل و علم، بے نشاں، بے تیغ و تیر "جفا پیشگان ہند" کی جفا پیشگی کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ قلندر مزاج حسرتؔ کی میزانِ جسارت میں جفا پیشگان کی ہر جفا کم مایہ تھی۔ یہ مولانا حسرتؔ ہی تھے جنھوں نے پہلی بار سنہ ۱۹۲۱ میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے "آزادیِ کامل" کی آواز بلند کی تھی اور قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

"نیشنل کانگریس کا مقصد جائز اور پُر امن ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کا ایسا سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا ہے جو تمام بیرونی تسلط سے آزاد ہو۔"

سر آغا خاں کی سرکردگی میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو حسرتؔ اُس کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ وہ ایک آزاد مسلم ادارے کے قائل تھے جو حکومت کی بے جا مداخلت سے پاک ہو۔

مسز اینی بیسنٹ اور بال گنگا دھر تلک نے کانگریس میں ہوم رول لیگ کی بنا ڈالی تھی۔ اس کا مقصد ہوم رول کے حصول کی خاطر زبان اور قلم کے ذریعہ جنگ لڑنا تھا۔ مسلمانوں کے حُریت پسندوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرتؔ موہانی آتش نوا احرار میں سے تھے جو زبان و قلم سے [illegible] نظر بند کر دیئے گئے تھے۔

[illegible] مسلم لیگ [illegible] ساتھ تمام فرقوں ہندو مسلمان اور سکھ کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر متحد کرنے

کانگریس اب ایک لبرل جماعت سے بدل کر انقلابی جماعت بن گئی تھی اور اس جماعت کی رہنمائی بہ قول پنڈت نہرو "مسلمان حریت پسند کر رہے تھے"۔

علی برادران اور دوسرے مسلمان رہنما ہمہ یاران دوزخ (یہاں دوزخ بمعنی جیل) جب جیلوں سے رہا ہوئے تو سیدھے امرتسر پہنچے۔ حسرت "سید الاحرار" تھے برصغیر کی تاریخ میں مختلف فرقوں کا یہ اجتماع ایک تاریخی اجتماع تھا جب خلافت تحریک کے پرچم تلے مسلمانوں کا مذہبی گروہ اور نوجوان تعلیم یافتہ گروہ دونوں برطانوی حکومت کی مخالفت میں ایک ہو گئے تھے اور کانگریس کے ساتھ مکمل اشتراکِ عمل کر رہے تھے۔ قومی یکجہتی کی یہ ایسی مثال تھی جس نے برطانوی حکومت کے ایوان متزلزل کر دیئے تھے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کے ایما پر جب ترکِ موالات جیسی تحریک کو ختم کر دیا گیا تو حسرت نے بد دل ہو کر کانگریس سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ ترکِ موالات بھی حسرت کے ذہنِ رسا کا ثمرہ تھی۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے لندن میں جب ترقی پسند تحریک کا منشور تیار کیا تو ہندوستان میں اس پر دستخط کرنے والوں میں حسرت بھی شامل تھے۔ تحریک کے آغاز ہی سے وہ اس کے مستقل طرفدار تھے۔ کیونکہ اس تحریک کا مقصد بھی فرنگی جوئے سے حصولِ آزادی تھا۔

حسرت سیاست اور شاعری دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ خود اپنے الفاظ میں "طرفہ تماشا" شخصیت۔ کہتے ہیں،

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کی شاعری ایک شگفتہ [illegible] بلکہ ان کے [illegible] دیتے [illegible] ہیں۔

عاشقانہ شاعری میں ارضیت ہے۔ اُن کا محبوب اُردو شاعری کے محبوب کی طرح ظالم خونخوار، خنجر بہ دست سفاک قاتل نہیں۔ گوشت پوست کا وہ جیتا جاگتا انسان ہے جس کے سینے میں نرم و نازک احساسات سے مملو دل ہے جو تڑپتا اور دھڑکنا جانتا ہے۔ حسرت کے موقلم کی تصویریں ذہنی پرزہ سرائی نہیں۔ اُن کی واردات پر مبنی ہیں۔ جن میں دردمندی، سادگی اور پاکیزگی ہے۔ عاشقانہ شاعری میں احتیاط محبت نام کی جنسِ گراں مایہ اُردو میں حسرت کے فیضان سے عام ہے۔

عارفانہ شاعری حسرت کے صوفیانہ مزاج کی ترجمان ہے۔ باغیانہ شاعری برطانوی سامراج سے مخالفت کی آئینہ دار ہے۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ایک اجلاس میں جس کے صدر حسرت مقرر کئے گئے تھے آزادی کامل کے حق میں پُرجوش تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"اگر کانگریس کا نصب العین آزادی کامل بیرونی حکومت برطانیہ منظور نہیں ہوتا تو کانگریس سے مستعفی ہوجاؤں گا"۔

گاندھی جی اور حسرت کے درمیان اختلاف رائے یہی تھا کہ حسرت آزادئ کامل کے قائل تھے۔ آزادی کامل حسرت کی زندگی کا نصب العین تھا جس کے حصول کے لئے وہ ہر اُس تحریک سے وابستہ تھے جو اس منزل کی سمت جاتی تھی۔ وہ خلافت تحریک ہو یا انڈین نیشنل کانگریس یا جمیعۃ العلماء یا مسلم لیگ یا ترقی پسند تحریک آزادی کامل کا نعرہ بلند کرنے کے جرم میں حسرت پر بمبئی ہائی کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا۔ برطانوی حکومت سے منصفی کے لئے حسرت نے اپنا مقدمہ خود بحث کیا۔ عدیل عباسی اپنی تصنیف تحریک خلافت میں لکھتے ہیں:

"ماسوا اللہ سے خوف نہ کرنے والا یہ درویش بوریہ نشین مرد مومن ذرا بھی نہ سہما اور اپنا مقدمہ خود بحث کیا وکیل بھی رکھا

حصولِ آزادی کی جدوجہد میں مولانا حسرت نے بارہا قید فرنگ کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سابرمتی جیل میں قید کے زمانے میں جو غزل کہی تھی۔ برطانوی حکومت کے "دشمن دوستانِ صادق" سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

کچھ یاد بھی ہے وہ عہد سابق — اے دشمنِ دوستانِ صادق
کچھ بلت ہے میرے حسن ظن کی — ہے جور تیرا کرم پہ فائق
حسرت کو دیارِ عاشقی کی — زنہار نہیں ہوا موافق

حکمرانِ وقت کو "غلامانِ وقت" کا عنوان دینا بھی حسرت جیسے بے باک مجاہد ہی کے بس کی بات تھی۔ کہتے ہیں :

حسرت و آزاد پر جور غلامانِ وقت
از رہ بغض و عناد دیکھئے کب تک رہے

بہ قول رشید احمد صدیقی حسرت "مختصر خیال نہیں مختصر عمل تھے۔" ساری زندگی انھوں نے جہد و جہاد میں گزار دی۔ جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے۔ حسرت اس وقت بھی مطمئن اور آسودہ نہ ہوسکے۔ رائج الوقت نظام کی کوتاہیوں کے شکوہ سنج رہے۔ حسرت تو تھے مزاجاً صوفی باصفا دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کی رکنیت اُن کے اندازِ درویشانہ کو بدل نہ سکی۔ جب سب ممبر شاندار ہوٹلوں میں قیام کرتے حسرت سکریٹریٹ کے ایک طرف ایک قدیم بوسیدہ مسجد کے حجرے میں ٹھیرتے یا گلی قاسم جان میں دفتر "الامان" کے چھوٹے سے کمرے میں مقیم ہوتے۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے جب سب لوگ پچھتر روپے یومیہ لیتے حسرت صرف پانچ روپے میں اپنا مہینہ بھر کا خرچ چلاتے تھے۔

حسرت کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ رئیس المتغزلین بھی کہلائے اور سید الاحرار بھی۔ اپنی صلاحیتوں کو مختلف طور پر اور کبھی متضاد جہات میں صرف کرتے

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

راحت عزمی

ماہ لقا چندا

(قسط اوّل)

ماہ لقا کا اصلی نام چندا بی بی تھا۔ ماہ لقا خطاب۔ "چندا" تخلص اور "بائی" حالات کے جبر کی علامت۔ حسب نسب ایسا کہ ددھیال میں وجاہت و شرافت ننھیال میں سیادت و نجابت مگر خاندان ستم ہائے روزگار کا نشانہ۔ آسمان بھی کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کیسے ' ایسے ویسے ہوجاتے ہیں۔ فلک کج رفتار کے تماشے حسرتناک بھی ہوتے ہیں اور عبرتناک بھی۔ کہا جاتا ہے کہ آسمانی رنگ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے لیکن چرخ نیلی فام نے تو ایسے ایسے رنگ دکھائے کہ آنکھوں سے مایوسیاں برسنے لگیں۔ نگاہوں میں اندھیرا چھاگیا اور تاریکیوں نے ہنستی مسکراتی زندگیوں کو ایسا بھٹکایا کہ گھر کا راستہ نہ ملا۔ ماہ لقا چندا کی ماں ' نانی ' خالائیں اور ماموں ایسی آسمانی بلاؤں کا ہدف بنے۔

ابوالفتح نصیر الدین محمد شاہ کا عہد تھا۔ ابھی دلی کی رونق میں اور چہل پہل میں فرق نہیں آیا تھا۔ ہر طرف خوشحالی تھی۔ لوگ چین سے کھاتے تھے۔ میٹھی نیند سوتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک صاحب محمد حسین خاں نامی دلی آئے۔ مولف ماہنامہ گلزار آصفیہ [illegible] [illegible] لقا [illegible] لکھتے ہیں۔

"[illegible] محمد حسین خاں دہلی [illegible]

[illegible] ہم [illegible] کے جوہر دیکھ کر صوبہ گجرات و احمد آباد کے ناظم

[illegible] کا [illegible] عہدہ تفویض کیا ...... طبیعت [illegible] شوقین تھی۔ مزاج [illegible]

ـجمال کے شیدائی ہے۔"

خواجہ محمد حسین خاں خوبی خوبرو اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ احمد آباد تیں انھوں نے کسی شریف الخاندان خوبصورت لڑکی سے شادی کرنی چاہی۔ اس ین کاٹھیاواڑ کے متوطن خواجہ زادگان میں سے ایک بزرگ شخصیت احمد آباد میں اقامت تھی۔ ان کی لڑکی چندابی بی خوبصورتی میں لاکھوں میں ایک تھی۔ خواجہ محمد حسین خاں نے لڑکی کی خواستگاری کی اور یہ شادی ہوگئی۔ چندابی بی کو (۱۹) اولادیں ہوئیں۔ ان میں پانچ زندہ رہیں باقی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ان پانچ بچوں میں دو لڑکے غلام حسین محمد اور تین لڑکیاں نوربی بی، بولن بی بی اور سیدہ بی بی سب میں چھوٹی تھی۔ یہ سیدہ کی لڑکیاں تھی کہ آئندہ ہر ایک اس پر رکھا اس کا والہ وشیدا ہوا۔ قدرت کی بے شمار ماؤں سے حسن بھی ایک نعمت ہے۔ قدرت یہ نعمت خواجہ محمد حسین خاں کی اولاد کو فراوانی سے عطا کی تھی۔ ان بچیوں میں ہر ایک چندے آفتاب، چندے مہتاب، حسن و میں آپ اپنی مثال اور آپ اپنا جواب تھی۔

خواجہ محمد حسین خاں کی خوشحال زندگی کو ان کی عیش پسندی دیمک بن کر چاٹنے رفتہ رفتہ گھر کا سارا اثاثہ عیش و عشرت کی نذر ہو گیا۔ یہاں تک کہ سرکاری رقمیں غلب و تصرف کی زد میں آگئیں۔ فلک کج رفتار تو ایسوں کی تاک میں رہتا ہے۔ وکسی کی خوشحالی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہی دنیا تو ہے اس نے کب کسی کا ساتھ دیا ہے جو کا ساتھ دیتی۔ یہاں تو ہر شخص کے ہزار دوست، ہزار دشمن لگے رہتے ہیں۔ خواجہ دشمنوں سے بچ سکتے تھے۔ ان کے کسی مخالف نے ان کے غبن کی شکایت حاکم گجرات سے کر دی۔

حالات کی چھان بین شروع ہوئی۔ غبن ثابت ہو گیا۔ گھر میں جو کچھ تھا ضبط کر لیا گیا۔ نے بدنامی کے خوف سے بیوی بچوں کو بے سہارا چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اور ایسے گئے مفقود الخبر ہو گئے۔ حکومت کا غضب چندابی بی اور ان کے بچوں پر ٹوٹا۔ ناظم گجرات نے

جو کچھ چھوڑ دیا تھا۔ چندا بی بی اس کو بیچ کر کچھ دن گذر اوقات کر سکی۔ جب وہ بھی ختم ہو گیا اور کوئی پرسان حال نہیں رہا تو حسرت سے آسمان کو دیکھا اور رات کی تاریکی میں اپنے بچوں کو لے کر احمد آباد سے نکل پڑی۔ نہ منزل نہ ٹھکانہ، نہ جانے کتنے دن جنگل میں صحرا میں رہی۔ آخرکار قصبہ دولیہ پہنچی ۔ یہاں بھگتوں کی بستی میں سر چھپانے کے لئے تھوڑی جگہ کچھ دن دم لینے کے لئے یہاں رُک گئی ۔ یہ بھگت ایسے ویسے بھگت نہیں تھے ۔ یہ لوگ رقص و سرور کے ماہر تھے ۔ انھوں نے ان بے وارثوں پر رحم کھا کر چند روز تو کھانا پینے کے لئے دیا، لیکن کب تک ۔ اُنہوں نے چندا بی بی کی کسمپرسی پر رحم کھا کر مشورہ دیا کہ وہ اپنی خاندانی وجاہت کو بھول جائے اور اپنی اور اپنے بچوں کی خورد و نوش کے لئے انھیں ناچ گانا سکھائے ۔ یہ کوئی گرا ہوا فن نہیں ہے بلکہ دیوی دیوتاؤں کا ہے۔ اگر وہ آمادہ ہے تو اپنی لڑکیوں کو ان کے پاس بھیج دے ۔ وہ ان بچیوں کو یہ سکھا دیں گے ۔ چندا بی بی نے پہلے تو اس مشورہ کو بڑی حقارت سے سُنا اور انکار کر لیکن یہ دیکھا کہ روزگار کی کوئی صورت نہیں اگر یہی لیل و نہار رہے تو معصوم بچے ہو سکتے ہیں تو اس نے بھگتوں کی بات مان لی اور بچوں کو آمادہ کیا اور اس فن کو سیکھنے ان کے پاس بھیجنا شروع کر دیا ۔ اس فن رقص و سرور کو دو بہنوں نے سیکھا اور سیدہ بی بی کے ساتھ گھر پر رہی ۔ اس لڑکی نے گانا بجانا نہیں سیکھا کیونکہ سیدہ بی بی کے رقص و سرور تعلیم حاصل کرنے کا ذکر نہ کسی تذکرہ میں ملتا ہے اور نہ ماہنامہ کے مولف نے ایسا کوئی اشارہ ہے۔ صاحب ماہنامہ نے ماہ لقا کے خاندانی حالات اس کے بیاض سے معلوم کئے ہیں۔ جس صراحت انھوں نے اپنے مقدمہ میں کر دی ہے۔

جس زمانہ میں یہ لڑکیاں موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں حاکم دولیہ سالم سنگھ کو غریبوں کا حال معلوم ہوا ۔ اس نے ان کے لئے مکان اور خورد و نوش کا انتظام کر دیا۔ اسی دوران سیدہ بی بی سے اس کی نظریں چار ہوئیں اور کیوپڈ اپنا کام کر گیا ۔ وہ سیدہ بی بی کا دیوانہ ہو

...بی بی کو تحفے تحائف بھیج کر اس لڑکی کی خواستگاری کی۔ سالم سنگھ بھی مردانہ حسن سے وابستہ تھا۔ چندہ بی بی کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ حالات کی بساط ...ہر بر اسے ایسی شہ دی گئی ہے کہ اب بات کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ سالم سنگھ کی ...دبانہ خواستگاری کو رد کیا جائے تو حالات اور بگڑ سکتے ہیں۔ اس پر تشدد بھی کیا جا سکتا ہے ...ندہ بی بی نے سینہ پہ پتھر رکھ لیا اور قسمت پر شاکر رہ کر حمیدہ بی بی کو سالم سنگھ کے ساتھ ...ہنے کے لئے بھیج دیا۔ سالم سنگھ نے حمیدہ بی بی کو بڑی عزت سے رکھا۔ اس کے صلب سے ایک ...ند جیسی لڑکی پیدا ہوئی۔ مہتاب بی بی نام رکھا گیا۔ سالم سنگھ کی بیوی نے اپنے شوہر کو حمیدہ بی بی کی طرف زیادہ مائل پایا تو اس نے جلن سے اس پہ جادو کروایا جس سے اس پر سکتہ ...اری ہو گیا۔ لیکن بہت جلد اس کا توڑ کر دیا گیا۔ حمیدہ بی بی تو اچھی ہو گئی مگر اس حادثہ سے ...ندہ بی بی اتنا متاثر ہوئی کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ پانچوں بھائی بہنیں اور زیادہ بے سہارا ہو گئیں کیونکہ اب تو ماں کا سایہ بھی سر پر نہیں رہا تھا۔ پھر ان بھگتوں نے جو اب ان بچوں کے استاد ہونے کے ناطے خود کو ان کا سرپرست سمجھنے لگے تھے۔ حمیدہ بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بہنوں کو ساتھ لے کر دلولیہ سے چپ چاپ نکل جائے کیونکہ سالم سنگھ اب اس پر زیادہ ملتفت نہیں رہے گا۔ یہ مشورہ نامناسب نہیں تھا۔ بلکہ بہت مناسب تھا۔ ان بھائی بہنوں نے اسے مان لیا اور بھگتوں ہی کے ساتھ ایک تقریب میں موقع پاکر دیولیہ سے نکل گئے۔ سنہ ۱۱۶۰ھ میں یہ بدقسمت قافلہ برہان پور پہنچا۔ راستہ میں دونوں بھائی اپنی بہنوں سے چھٹ کر لاپتہ ہو گئے۔ اس وقت برہان پور میں آصفجاہی فوج گھیری ہوئی تھی۔ یہ تینوں بہنیں اور ایک بھانجی بھگتوں کے ساتھ آصفجاہی فوج کی پناہ میں اورنگ آباد پہنچیں۔ اس وقت اورنگ آباد ایک بارونق شہر تھا۔ بھگتوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتی ہیں۔ اسی کو اپنا روزگار بنالیں۔ یہ بھی ایک محترم فن ہے۔ بھگتوں کا یہ عقیدہ اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ ویسے

ان بہنوں نے حالات کے پیشِ نظر اس مشورہ کو مناسب سمجھا لیکن کراہت ضرور محسوس
اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان دو بہنوں نے اپنی چھوٹی بہن کو یہ فن نہیں سکھایا۔ اور پھر
اپنے فن کے مظاہرے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے اپنی خاندانی وجاہت کے لئے اپنے نام
بدلے۔ نورانی بی بی برج کنور بائی ـ پولن بی بی پولن کنور بائی ـ میدہ بی بی راج کنور بائی
اور مہتاب بی بی مہتاب کنور بائی ہوگئی ـ اس کے بعد سامان رقص کو ڈبلیا میں سے نکالا اور آنکھ
سے دیکھا۔ برج کنور بائی اور پولن کنور بائی نے بادل ناخواستہ ساز اٹھایا اور گھنگرو باندھ
لئے۔ اپنی چھوٹی بہن اور بھانجی کو اپنا شریک بنایا۔ بڑی بہنوں کی یہ بہت بڑی قربانی تھی۔

ان دونوں بہنوں نے یہ فن ایک شوقین کی طرح سیکھا تھا۔ وہ فنکار جو خاندانی نہیں ہوتے گائکی کی اصطلاح میں شوقین کہلاتے ہیں۔ ان خاتون گلوکاروں اور کلاکاروں کو اپنی "آنا" کا بڑا خیال تھا۔ وہ خودداری کی عظمت اور اس کے تقدس کو کھنی تھی وہ فن کے مظاہرے میں اس کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ ان کا یہ فن ہر کہہ ومہ کے لئے نہ تھا۔ انھوں نے باعزت فنکاروں کی حیثیت سے اس فن کا مظاہرہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اورنگ آباد کے سارے رئیسوں، امیروں، دولتمندوں اور ذی مرتبہ لوگوں میں ان کے فن کی شہرت ہوگئی۔ ان کا مکان فنکاروں کا مکان تھا، کوٹھا نہیں تھا جہاں دو شریف زادیاں رہتی تھیں لیکن زمانے نے ان کو طوائف کا لقب دیا۔ شاید اس دور جاگیردارانہ دبدبۂ نظام کی شناخت یہی تھی کہ وہ کسی خاتون فنکار کو طوائف کا نام دے۔ بہرحال طوائف کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی لیکن آج انسانیت دوست ذہن انھیں طوائف کہتے ہوئے بڑا تکلف ہوتا ہے کیونکہ طوائف کی کوئی علامت ان میں نہیں ملتی۔

برج کنور بائی اور پولن کنور بائی کے فن نے آصفجاہی خاندان کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اس خاندان سے اور اس سے وابستہ امیروں اور رئیسوں سے ان کا ربط ضبط بڑھنے لگا۔ یہ بہنیں ان امیروں سے برابر والوں کی طرح ملتی تھیں۔ راج کنور بائی

ہی میں ایک رئیس سے رشتہ ازدواج قایم ہوا اور اس کو ایک لڑکی ماں کنور پیدا ہوئی اس لڑکی نے ابھی منزل شباب میں قدم رکھا تھا۔ آصفجاہ ثانی کے بھائی بسالت جنگ شجاع الملک ماں کنور کے گرویدہ ہوگئے۔ اور اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن ماں کنور عالم شباب ہی میں انتقال کرگئی جس کا شجاع الملک کو بے حد صدمہ ہوا۔ چندا بی بی کی تینوں بیٹیاں حُسن و جمال میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ خدا کی یہ نعمت ان پر بہت فراواں تھی۔ جب یہ لوگ آصفجاہی فوج کے ہمراہ اور اس کی پناہ میں اورنگ آباد کے لئے رخت سفر باندھے ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں رکن الدولہ میر موسیٰ خاں بہادر احتشام جنگ مدارالمہام دیوان کل مملکت آصفجاہی مہتاب کنور کے حسن خداداد سے متاثر ہوگئے تھے۔ انھوں نے پہلے تو ان کا حسب نسب معلوم کر لیا۔ جب مطمئن ہوگئے اور اپنے مرتبہ کے ہم رتبہ پایا تو خواستگاری کی۔ اور عقد شرعی نکاح کے بعد اپنی زوجیت میں لیا اور صاحب جی صاحبہ کا خطاب عطا کیا نیز اس کے مقام کو اتنا بلند کیا کہ عید، بقرعید کے موقع پر "امرائے نامدار" اور "منصبداران با اقتدار" جیسے مبارز الملک ظفر الدولہ فاضل بیگ خاں بہادر ضابطہ جنگ، شمشیر الدولہ اور دوسرے بلند مرتبہ سردار "مبارکباد" دینے کے لئے صاحب جی صاحبہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوتے اور انھیں "تحفۂ عید" میں ڈیوڑھی سے پاندان بھیجے جاتے تھے۔ اگر صاحب جی صاحبہ مہمات میں رکن الدولہ کے ساتھ ہوتیں تو فوج روزانہ سویرے انھیں سلامی دیتی۔ یہی نہیں رکن الدولہ کے چھوٹے بھائی شرف الدولہ ظہور جنگ، میر احمد علی دستان جنگ، ایزد یار خاں حشمت جنگ بھی اپنی بڑی بھاوج کا احترام کرتے۔ اور آداب بزرگی کا خیال رکھتے تھے۔

صاحب جی صاحبہ لاولد رہیں۔ رکن الدولہ کی شہادت کے بعد اس عابدہ نے سامان زندگی، صلوٰۃ خمسہ صوم، وظائف و اوراد، تسبیح و تہلیل، الوزہد و تقویٰ،

میں گزار دی۔ خاندانی نجابت و اصالت نے اپنا رنگ دکھایا۔ اس نے "مخدرات عفت سرشت" کی طرح اپنی بیوگی کے دن کاٹے اور دنیا سے سرخرو اُٹھی۔

عجیب بات ہے کہ غلام صمدانی خاں گوہر نے "حیات ماہ لقا" لکھی۔ انھوں نے ابتدائی حالات "ماہنامہ" سے لئے جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ مہتاب کنور بائی کا عقد شرعی رکن الدولہ میر موسیٰ خاں سے ہوا۔ لیکن جناب گوہر نے مہتاب کنور کی شادی ارسطو جاہ سے کروادی۔ حیات ماہ لقا کے صفحہ ۸ پر یہ سُرخی قائم کی " مہتاب کنور بائی کا ارسطو جاہ کا اپنے نکاح میں لانا اور صاحب جی صاحبہ کا خطاب ملنا " جو سراسر غلط ہے۔ ماہنامہ کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو۔

"ہنگامیکہ راج کنور بائی درلشکر ..... سر نظام علی خاں آصف جاہ
جلوہ افروز گردید کیفیت حسن و جمالِ مہتاب بائی دلنشین رکن الدولہ
میر موسیٰ خاں بہادر احتشام جنگ مدار المہام کل نواب مستطاب شد"

اب صورت حال یہ تھی کہ ان بہنوں کے حسن کے چرچے سارے اورنگ آباد میں ہونے لگے تھے۔ راج کنور کے حُسن و جمال کی بڑی شہرت تھی ہر طرف سے خواستگاریاں ہورہی تھیں نواب بسالت خاں بخشی داروغہ محلات شاہی کی قسمت نے یاوری کی۔ راج کنور بائی ان کے حبالۂ عقد میں آگئی۔ بسالت خاں بلخ کے اُونچے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے باپ شاہجہانی منصبدار تھے۔ دونوں باپ بیٹے نہایت متقی پرہیزگار تھے۔ بسالت خاں بہت سی اخلاقی خوبیوں کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ حسین و جمیل خوبرو [illegible] وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ [illegible] ۱۱۸۱ھ روز دوشنبہ چاند سی لڑکی پیدا ہوئی [illegible] جشن ولادت دھوم دھام سے منایا گیا۔ چھٹی اور عقیقہ کا اہتمام شاہانہ انداز سے کیا گیا کیونکہ اس تقریب کے لئے آصفجاہ ثانی [illegible]

...ت نواب ارسطو جاہ بہادر نے اپنی نگرانی میں عقیقہ اور چھٹی کی تقریب کا اہتمام کیا۔
...دل خاں کی دیوڑھی کو کافوری شمعوں سے سجایا گیا تھا۔ اور خود ارسطو خاں، راجہ
...ب وقت، نواب شہر الملک اور دوسرے امرا ہاتھیوں پر چھٹی کی کھچڑی لائے تھے
اس تقریب کے بعد راج کنور بائی نے چندا بی بی کو اپنی بڑی بیٹی صاحب
...بہ کی گود میں دے دیا کیونکہ وہ لاولد تھی۔ صاحب جی صاحبہ نے اپنی چھوٹی بہن
...سرت تمام اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی لی۔ چندا بی بی
میرزادیوں اور شہزادیوں کی طرح علم و آداب و اخلاق سے آراستہ کیا۔
...اساتذہ سے تعلیم دلوائی۔ چندا بی بی نے بھی غیر معمولی حسن کے ساتھ ساتھ غیر معمولی
...بھی پایا تھا۔ جس میدان میں قدم رکھا اس کی مرد میدان بنی۔ اُردو و فارسی
...ادہ تاریخ سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ موسیقی سے اس کو فطری رغبت تھی۔ گائکی
...لئے سُریلا گلا اور رقص کے لئے قد موزوں، قدرت کی عطا تھی۔ اس کی ذہانت و
...ت بھی خداداد تھی۔ دوسرے فنون لطیفہ سے اس کو فطری دلچسپی تھی۔ طبیعت
...رانہ پائی تھی۔ اس کے پہلو بہ پہلو فنونِ سپہ گری میں بھی وہ مردوں سے پیچھے نہیں تھی۔
...ب جی صاحبہ نے اس کے لئے ہر میدان مہیا کیا۔ اس نے علوم متداولہ کو قابل
...ذہ سے حاصل کیا۔ غلام مہدی دھرپدیہ اور خوشحال خاں کلاونت سے موسیقی
...اور اس دور کے مشہور رقاص چھتا بھانڈ سے رقص میں کمال حاصل کیا۔ کمال بھی
...دوسری فنکار اس کا نام سُن کر کانوں پکڑتی تھیں۔ فنون سپہ گری کے حصول کی
...ت صاحب... کی مجبور... تعریف قدرت اللہ قاسم سے سنئے۔

نظر مردانہ در دش می کند، واسپ می تازد از ناوک وسنان
...[illegible] تیر اندازی و نیزہ بازی سیاہ... [illegible]
[illegible]

ربط ضبط کے تعلق سے اس کا رویہ بہت محتاط تھا۔ اپنے عزت و وقار کے مقابلہ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ صاحب مجموعہ نغز نے ٹھیک کہا ہے کہ

"ما سرش بہر کس فرود نمی آید، بہات ہوشمند است و بغایت پختہ کار و نادرۂ عصر است و محبوبۂ روزگار"۔

چندا بی بی کی عمر ابھی (۱۷، ۱۸) سال کی تھی کہ اس نے مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی۔ جب اس کی شہرت آصفجاہ ثانی کے دربار میں پہنچی تو بادشاہ نے اس کو پہلے تو ارباب نشاط کے زمرہ میں ملازم رکھ لیا۔ پھر دربار مصاحبت سے نوازا۔ جب اس کے تدبر، معاملہ فہمی اور سیاسی حکمت عملی کے جوہر کھلے تو آصف جاہ ثانی اس سے مشاورت بھی کرنے لگے۔ اس نے بادشاہ کے مزاج میں اتنا دخل پا لیا تھا کہ امرا اس کو بادشاہ کا مشیر سمجھنے لگے۔

۱۲۱۳ھ میں پانگل فتح ہوا۔ نوروز کے موقع پر جشن منایا گیا۔ اس جشن میں آصفجاہ دوم نے اپنے وفادار جاں نثاروں، امیروں اور وفادار منصبداروں کو ان کے رتبے کے مطابق خطاب، خلعت، منصب اور جاگیروں سے نوازا۔ چندا بی بی بھی ہمیشہ مہمات میں آصفجاہ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ارسطو جاہ کی ایما پر بادشاہ نے اس کو بھی "ماہ لقا" کے خطاب سے سرفراز کیا اور نوبت اور گھڑیال بھی عطا کی۔ یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اب وہ خطاب یافتہ منصبدار تھی۔ اس پر مسرت موقع پر شعراء نے قطعات تہنیت پیش کئے۔ ایک شاعر نے یہ قطعہ کہا ہے

نوید آمد بعالم ماہ لقا را ● نوازش کرد او نوبت شہنشاہ

ترانہ ساز مالش گفت ناہید ● بلند آواز نوبت باد دلخواہ

شاہ شمس مرزا علی لطف نے بھی اس موقع پر ایک تہنیتی رباعی کہی تھی۔

نوبت یہ جو ماہ لقا کے بالمعہ شوکت ● زیر و بم آسماں سے جا پہنچی رفعت

ید نے ہنس کے مشتری سے کہا • اب لیلیٰ و شیریں کی کہاں ہے نوبت

ماہ لقا کو آصفجاہ ثانی نے پانگل کے سفر پر جانے سے ایک دن پہلے (۷۰۰)
نام دیا تھا۔ بعد میں یہی انعام اس کی ماہانہ تنخواہ قرار پایا۔ ماہ لقا ۱۷۸۲ء
سے لے کر مرنے تک آصفجاہی دربار کی وفادار رہی۔

۱۲۱۸ھ میں آصفجاہ دوم کا انتقال ہوا اور سکندر جاہ آصفجاہ ثالث تخت
ئے۔ ماہ لقا اسی دربار سے متوسل رہی۔ آصفجاہ ثالث اپنی ولیعہدی کے زمانہ
ں قدر و منزلت اور اس کے مرتبہ کو دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اس کے رتبہ
رقی آنے نہیں دیا۔ ماہ لقا نے بھی نمک خوار کی حیثیت سے آصفجاہی دربار کی
اپنی اعلیٰ حوصلگی سے بلند رکھا۔

نواب سکندر جاہ کو والی پونا مادھو راؤ نے شادی کی تقریب میں شرکت کی
ی۔ نواب سکندر جاہ نے دعوت قبول کر کے شرکت کی عزت بخشی۔ پونا تشریف لے گئے
ں اس سفر میں ساتھ تھی۔ یہاں اس نے شاہی اشارے پر اپنے فن کا ایسا
یا کہ مقامی رقاصہ [illegible] نے کان پکڑ لئے۔ اس طرح ماہ لقا نے آصفجاہی دربار
معیار منایا۔ اس سے بڑھ کر اس بزم رقص میں جو بات [illegible] وہ یہ [illegible]
ذی اقتدار شخصیتوں نے ماہ لقا کے فن سے متاثر ہو کر اس کو بیش قیمت تحفے پیش کئے
نے ان کو قبول نہیں کیا اور نہایت انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔ اس عمل نے واضح
صفجاہی نمک خوار کتنے بلند حوصلہ ہوتے ہیں۔

دوسرا واقعہ اس سلسلہ میں بھی عجیب ہے۔ نانا فرنویس کے پاس ایک تاجر اعلیٰ نسل کے
ے لے آیا۔ اور دو ہزار روپیہ فی اسپ قیمت بتائی۔ نانا فرنویس نے ڈیڑھ ہزار
سب قیمت لگائی۔ تاجر کچھ بیچے بغیر واپس ہو گیا۔ ماہ لقا نے تاجر کو بلوایا۔
خرید لئے اور مقامی ساہوکار کو چٹھی لکھی۔ تاجر کو بارہ ہزار روپیہ دلے ۔

پوچھا گیا کہ اس نے گھوڑے کیوں خریدے۔ جواب دیا گیا کہ حیدرآباد کے ایک امیر واجد علی خان کو عمدہ گھوڑے بہت پسند ہیں ان کی نذر کئے جائیں گے۔ گویا ماہ لقا نے بڑے سلیقہ سے ناناف رنویس کو بتایا کہ بڑے آدمی مال چکایا نہیں کرتے بلکہ مقررہ قیمت سے کچھ زیادہ ہی دیا کرتے ہیں۔ وہ تو آصفجاہی دربار کی ایک معمولی نمک خوار ہے۔ اس سے تاجر کی مایوسی دیکھی نہ گئی۔ آصفجاہی دربار کا یہی مزاج ہے۔

۱۲۰۷ھ میں ماہ لقا ابھی ۲۶ / ۲۷ سال کی تھی کہ اس کی ماں راج کنور بائی کا انتقال ہو گیا۔ وہ کوہ مولا میں دفن کی گئی۔

بسال رحلت او گفت ہاتف ؎ بیامرزد خدا ایں ماجزہ را
۱۲۰۷ھ

سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ماہ لقا نے دو لاکھ کے صرفہ سے ماں کی قبر پر مقبرہ تعمیر کروا لیا۔

راج کنور بھی اپنی بڑی بیٹی کی طرح ماہ لقا کو اس کی گود میں دینے کے بعد اپنی ساری زندگی " صلوٰۃ و صوم، تسبیح و تحلیل، زہد و تقویٰ اور صوفیائے کرام سے استفادہ" کر کے ریاضتوں کے لئے وقف کر دی۔ سچ ہے کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ۔ اس نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ وہ نہیں ہے جو حالات کے جبر سے اختیار کردہ نام سبب سے سمجھی جا رہی ہے۔ سیادت و نجابت، شرافت و وجاہت اس کا خاندانی ورثہ ہے۔ وہ " مخدرۂ عفت سرشت " ہے۔ ویسے دنیا جو چاہے سمجھے۔ راج کنور ہاتھ کی بہت کھلی تھی۔ غلام صمدانی گوہر نے اسے صاحب کشف و کرامت بتایا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس کی ایک کرامت لکھ کر گوہر صاحب کے بیان کی توثیق کر دی ہے۔

ماہ لقا کی پہلودار شخصیت نے اس کو مہر دربار کی روح رواں بنا

زندگی بھر چار پانچ درباروں ہی سے وابستہ رہی جن میں سے ایک تو آصف جاہی دربار تھا۔ دوسرے تین دربار مدار المہاموں ارسطو جاہ، میر عالم اور چندو لعل کے دربار تھے وہ راجہ راؤ رنبھا کی رکن حکومت آصفی سال نیل و ماہی مراتب کے دربار سے بھی متوسل رہی لیکن بعد میں اس نے یہ ملازمت ترک کر دی تھی۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنی کتاب " ماہ لقا چندا " میں ایک سرخی " ماہ اور ستارے " قائم کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ماہ لقا کے بے حساب چاہنے والے تھے۔ کیا امیر کیا غریب سب اس کے گرویدہ تھے۔ بے شک اس کے بہت سے چاہنے والے ہوں گے۔ شمع روشن ہو تو پروانوں کا ہجوم ہو ہی جاتا ہے لیکن اس ہجوم عاشقاں سے شمع بے نیاز رہتی ہے۔ اس کو صرف اپنی انا کی پاسداری ہوتی ہے۔ یہی اس کی وضعداری بھی ہے۔

چندا کو دیکھنے کی جو خواہش کوئی کرے تو دیکھتا ہو وصف میں وہ عز و جاہ کا

اسی صاحب مجموعہ لغزر نے کہا تھا " اما سوش بہر کس فرو نمی آید " ڈاکٹر صاحبہ نے جن ستاروں کے نام گنائے ہیں ان میں آصف جاہ دوم، آصف جاہ سوم، میر عالم، ارسطو جاہ، مہاراجہ چندو لعل شاداں، حکیم غلام حسین خاں جوہر وغیرہ ہیں۔ ماہ لقا کے ان ستاروں کی عمروں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آصف جاہ دوم	۵۰ سال		• ماہ لقا کے عقیقہ کی تقریب کیلئے فرمان جاری کیا تھا
ارسطو جاہ	۶۰ سال	ان تینوں کے عہد میں ماہ لقا	عقیقہ کی تقریب کا اہتمام کیا تھا
میر عالم	۶۴ سال	کی عمر ۱۷ تا ۱۹ سال	• ماہ لقا فن شعر میں شاگرد تھی

عمروں کے اس تفاوت سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان شخصیتوں کی ماہ لقا سے محبت مشفقانہ تھی۔ نواب سکندر جاہ ماہ لقا سے چھ سال چھوٹے تھے۔ ان کی وابستگی میں احترام پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے والد کے دربار میں ماہ لقا کے موقف اور اس کی درباری مصروفیت کو و شادت کو بچشم خود دیکھا تھا۔ راو رمبھا کو

موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اب رہی مہاراجہ چندولعل کی نوک جھونک یہ ہم عصروں کی نوک جھونک تھی جو صداے الرحیل کے بعد شروع ہوئی۔ مہاراجہ کی عمر ۴۶ سال ہو چکی تھی۔ ماہ لقا اس وقت ۴۴ سال کی تھی۔ پھر یہ نوک جھونک دربار کی نوک جھونک تھی کیونکہ ماہ لقا کا مزاج اور اس کی محتاط روش اسی کی متقاضی تھی۔ اب رہے حکیم غلام حسین خاں جوہر۔ وہ بہت ضعیف العمر تھے۔ ماہ لقا نے جب ماہنامہ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اپنی ضعیفی کا عذر کیا تھا لیکن اس کے اصرار پر راضی ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے دیباچہ میں ماہ لقا کو سلمہا لکھا ہے۔ اس سے بھی "ستارے" کے پس پردہ معنی کی رد ہو جاتی ہے و نیز ذیل کی رایوں سے بھی کسی اور زاویہ سے سوچنے کی نفی ہو جاتی ہے۔

میر عالم اپنے مصاحبوں سے ماہ لقا کے بارے میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کی کہ: "تلمیذی برسای فہم و ذکاوت طبع و جدت مزاج در زمرۂ [illegible] ام"

اور کبھی کہتے، "جلیس باتمیز و تلمیذی بہ این جدت طبع و رسائی فہم مثل ماہ لقا کم دیدہ شد"

نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث فرماتے۔

"مانند ماہ لقا بائی دیگرے بہ این کمالات پیدا شدن مشکل است"

اس کے علاوہ آصف جاہ ثالث ماہ لقا کی مزاج پرسی کے لئے روزانہ چوبدار بھیجا کرتے تھے۔ مہاراجہ چندولعل بس یہیں تک تھے۔

"ماہ لقا ہم چو لولو نمک بہ رقاصی پاے کوب و در فن خود ممتاز است"

ماہ لقا کا معمولاتی نظام العمل اس کے عادات و خصائل اس کی شخصیت کی بہت کار گرہیں کھولتے ہیں اور اس کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اس کو غلام صمدانی گوہر سے سُنئے۔

"باوصف سامان ثروت و حشمت کے ماہ لقا بائی کا اخلاق اور تواضع بہت بڑھا ہوا تھا۔ اکتسابِ علم کے لئے اکثر فصحا، علماء اور شعراء کی صحبت رہتی تھی۔ چونکہ طبیعت موزون پائی تھی اس لئے ضلع جگت میں طاق لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں شہرہ آفاق تھی۔ محاورہ درست روزمرہ چست، مکمل لباس سے آراستہ و پیراستہ رہتی تھی۔ ہر وقت بارگاہ خسروی پر حاضر ہوتی تھی۔ باقی اوقات کتب کی سیر اور کتب متداولہ کے مطالعہ میں گذرتے تھے۔ کتب خانہ ہر ایک علم و فن کے کتب سے مملو تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں مطبع نہ تھا اسلئے اکثر کتابوں کی نقل کرلی جاتی تھی۔ .... سخن سنجی و قدر دانی میں اس محبوبہ روزگار کی ذات مغتنمات سے تھی۔ ہر روز ہزاروں فقرا و مساکین کا ہجوم رہتا تھا۔ سادات کرام، مشائخین عظام کو بعنوانِ نذر و نیاز بہت کچھ عطا کرتی تھی"۔

اسی طرح جناب گوہر نے روزانہ کے نظام العمل کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "ماہ لقا چند ا رات کے آخری پہر کو بیدار ہوجاتی۔ اس کی خاص کنیزیں یاسمین اندام اور سوسن نام فوراً سیلا بچی آفتابہ حاضر کر دیتیں وہ فوراً وضو کرکے مصلی پر آجاتی۔ نماز صبح سے فارغ ہوکر وظائف و اوراد میں مشغول ہوتی۔ صحیفہ سجادیہ سے مخصوص دعائیں پڑھتی، سورج طلوع ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد مولوی ببر علی المعروف

یہ لاڈلے صاحب آتے۔ ان کے روبرو کلام مجید کی تلاوت کرتی تھی۔
تلاوت سے فارغ ہوتے ہی دسترخوان چُنا جاتا۔ اقسام اقسام کے کھانے
موجود رہتے۔ خود کی بہت کم خوراک تھی .... اس کے بعد
بالاخانہ پر قیلولہ کے لئے جاتی۔ وہاں سے فارغ ہوکر ظہرین کی نماز ادا
کرکے تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتی اور دو گھڑی دن رہتے دیوان خانہ
میں بڑا قالین بچھایا جاتا۔ اس پر مسند آراستہ کی جاتی۔ منشی متصدی
اور اہلکار کارخانہ حاضر ہوکر داخل و خارج ملاحظہ میں گذراتے۔
جب اس سے فراغت پاتی تو دو بزرگ قابل وسخندان مجالست و
ہم بزمی کے لئے حاضر ہوتے۔ چنانچہ علم سیر میں روضۃ الصفا،
جلا العیون، نادر نامہ، حبیب السیر وغیرہ کا مطالعہ رہتا اور دواوین
فارسی و ہندی نہایت مرغوب خاطر تھے۔ جب شام ہوتی تو نماز مغرب
و عشا ادا ہوتی۔ بعد ازاں فن موسیقی کے اساتذہ آتے۔ رقص وسرود
کی تعلیم ہوتی۔"

ماہ لقا کو شعر و شاعری سے فطری دلچسپی تھی۔ لطیفہ گوئی، بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی اس کی گھٹی میں تھی۔ جس محفل میں ہوتی اس کو زعفران زار بنا دیتی تھی۔ اس لئے ہر دربار کی روح رواں تھی۔ نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے کہ وہ اپنے گھر میں محفل مشاعرہ منعقد کرتی تھی جس میں اچھے اچھے شعرا حصہ لیتے تھے۔ وہ بزم رقص وسرود کا بھی اہتمام کرتی تھی جس میں شہر کے اُمراء اور رؤسا شریک ہوتے تھے۔

ماہ لقا نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں صرف (۱۲۵) غزلیں کہی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بسیار گو نہیں تھی۔ بلکہ جب بھی طبیعت موزوں ہوتی شعر

یا کرتی تھی۔ ایک عرصہ تک مہ لقا چندا اردو ادب کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ تسلیم
ن تھی لیکن لطف النساء امتیاز کے دیوان کے ملنے کے بعد وہ پہلی صاحب دیوان
رہی۔ ڈاکٹر اشرف رفیع نے مجلہ عثمانیہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں اردو کی پہلی صاحب دیوان
ہ کے عنوان سے تفصیلی مضمون لکھا جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ لطف النساء امتیاز
کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہے۔ ماہ لقا کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں راو رنبھا کی ایما پر
تے مرتب کیا تھا۔ " ہو الطیف الاعظم " سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔
۱۲ھ ایسٹ انڈیا ہاوس کی لائبریری میں اس کے دیوان کا جو نسخہ ہے اس کو
علے کپتان ملکم کو ۱۷۹۹ء میں بطور نذر پیش کیا تھا۔ اس سنہ عیسوی کا متبادل
سنہ یکم جمادی الثانی ۱۲۱۴ھ ہے۔ لطف النساء امتیاز کے دیوان میں ایک
ی بھی ہے جس میں اس نے اپنے حالات زندگی بیان کئے ہیں۔ اس مثنوی کے آخر
اس نے اپنے دیوان کے مرتب ہونے کا سنہ خود بیان کر دیا ہے۔

مناقب قصاید مدح جو لکھا ؛ مخمس قطعہ ریختہ جو ہوا
ہیں تعداد ابیات دیوان جو ؛ ہوئے دو ہزار ساٹھ اور ایک سو
کیا سن ہجری کو جب میں بیاں ؛ ہوئے یک ہزار دو سو بارہ پہ جاں

ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ " امتیاز نے صرف ایک سال کی اولیت سے ماہ لقا کو مات
" ڈاکٹر مہر جہاں صاحبہ نے بھی اپنے مقالہ " اسد علی خاں تمنا " میں امتیاز ہی کو
صاحب دیوان شاعرہ مانا ہے۔ لیکن آج بھی بعض دانشوران ادب ماہ لقا ہی کو پہلی
ب دیوان شاعرہ سمجھتے ہیں۔ فی الحال ان کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے۔
یہ بھی اعزاز کیا کم ہے کہ وہ اردو ادب کی دوسری صاحب دیوان شاعرہ ہے۔
آباد کے لئے یہ بھی بڑا افتخار ہے۔ پہلا صاحب دیوان شاعر اور پہلی اور دوسری
ب دیوان شاعرات اسی سرزمین دکن کی ہیں۔ ●●

(باقی آئندہ کے شمارہ میں)

ڈوگری ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے
پروفیسر آزاد کی عزت افزائی

جموں۔ ۲۳ جون (ڈاک سے)۔ اگلے دن جموں یونیورسٹی کے شعبہ ڈوگری کے زیرِ اہتمام یونیورسٹی میں "ڈوگری ماننا دن" کی تقریب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی زیرِ صدارت دھوم دھام سے منائی گئی۔ سابق وائس چانسلر پروفیسر ایم۔ آر۔ پوری کو بطورِ مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا۔

پروفیسر چمپا شرما صدر شعبۂ ڈوگری نے ابتدائی تقریر میں پروفیسر ایم' آر پوری اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج سے پندرہ سال قبل جموں یونیورسٹی میں جب شعبہ ڈوگری کی بنیاد رکھی گئی تو پوری صاحب وائس چانسلر اور آزاد ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ تھے۔ ان دونوں حضرات کی مدد اور توجہ کا نتیجہ یہ تھا کہ مہینوں کا کام ہفتوں میں ختم ہو گیا اور جموں یونیورسٹی میں شعبۂ ڈوگری قائم کر دیا گیا۔

پروفیسر چمپا شرما نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگرچہ پروفیسر آزاد شعبۂ اردو میں پروفیسر ایمرٹس ہیں لیکن شعبہ ڈوگری کے ساتھ اُن کا تعلق خاطر ایسا رہا ہے جیسے ان کا تعلق اسی شعبے سے ہو۔

پروفیسر آزاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اس بات کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ میں ڈوگری زبان سے اتنا واقف نہیں ہوں کہ اس میں تقریر کر سکوں۔ اس لئے میں اردو ہی میں تقریر کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ جو زبان تھوڑی بہت میں

جانتا ہوں 'یعنی اُردو' وہ تو میرا خزانہ ہے اور میرے پاس محفوظ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مَیں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ جو زبان مَیں نہیں جانتا وہ میرا ہی کھویا ہوا سرمایہ ہے۔ اور میری کوشش اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کھوئے ہوئے سرمایے سے جو کچھ بھی مجھے حاصل ہو جائے وہی غنیمت ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈوگری اور کشمیری میرے کھوئے ہوئے خزانے ہیں اور ان میں سے مجھے ابھی تک یہ حاصل ہوا ہے کہ میں یہ زبانیں کسی حد تک سمجھ تو لیتا ہوں لیکن بول نہیں سکتا۔ در اصل اُردو کے تعلق سے میری مصروفیات اتنی زیادہ رہی ہیں اور ہیں کہ کوئی بھی نئی زبان سیکھنے کے لئے مجھے فرصت نہیں مل سکی۔

جلسے کے خاتمے پر پروفیسر چمپا شرما نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور پروفیسر ایم' آر' پوری کو وہ تحفہ یادگار (MEMENTO) پیش کیا جو چند روز قبل ڈوگری سنستھا جموں نے اپنی گولڈن جوبلی کی تقریب کے موقعے پر تیار کرایا تھا۔ جلسے میں ڈوگری سنستھا جموں کے صدر پروفیسر نیلمبر دیو شرما بھی موجود تھے۔

(نامہ نگار)

اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیے

اگر اُردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم نہ دلوائیں تو
اُردو تعلیم کا انتظام گھر پر کیا جائے۔ ایسی صورت میں
اُردو نہ صرف قائم رہے گی۔ بلکہ
ترقی کر کے آگے بڑھے گی...

افکارِ تازہ

پروفیسر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد
صدر انجمن ترقی اردو ہند

آخری سانس سمجھتا ہوں ہر اِک سانس کو میں — میں کہ ہوں تیز قدم موجِ صبا کی مانند
مجھ کو یہ حکم ہے منزل تری منزل ہی نہیں — مجھ کو اب ان سے گذرنا ہے ہوا کی مانند
مری تاثیر معانی میں ہے لفظوں میں نہیں — کہ مرا شعر ہے اِک حرفِ دُعا کی مانند
دل کی گہرائی میں جب یاد اُترتی ہے تری
بھر کے آتی ہے وہ آنکھوں میں گھٹا کی مانند

شاعر! ترے کلام میں فن بھی ہے فکر بھی
لیکن یہ فاصلہ جو ہے فکر اور فن کے بیچ

نہ سہی جوڑ توڑ میں ماہر — ہم مگر اِس قدر بھی سادہ نہیں
جلوہ کو طور سے کہہ دو — آج بندے کا وہ ارادہ نہیں
اِس پہ تم اپنا عکس ڈال سکو — یہ ورق اِس قدر بھی سادہ نہیں

میں دل میں اُن کی یاد کے طوفان کو پال کر — لایا ہوں ایک موجِ تغزل نکال کر
پیمانہ طرب میں کہیں بال آگیا — میں گرچہ پی رہا تھا بہت ہی سنبھال کر
محفل جمی ہوئی ہے تری راہ میں کہیں
اے گردشِ زمانہ بس اتنا خیال کر

مدتوں کے بعد آخر دل نے راز یہ پایا
زندگی کی محرومی فکر و فن کا سرمایا

ہے خیالِ شاعر کا بُت شکن بھی بُت گر بھی
کچھ تو کہہ زمانے تو، تجھ کو کیا پسند آیا

صفحہ ۱۰

...ا کر پاتے، جب تک یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ...ن کی طرف لے جا رہا ہے، ایک مغرب کی طرف لے جا رہا ہے، اس گاڑی اور گاڑی کے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ تضاد سوسائٹی سے، ہمارے نظامِ تعلیم سے ہٹیے۔ ان الفاظ کے ساتھ اپنی گزارشات میں اقبال ہی کے اشعار پر ختم کرتا ہوں ۔

پیرِ حرم! رسم و رہِ خانقہی چھوڑ • مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
...رکھے تیرے جوانوں کو سلامت • دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
...ن کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے • مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
...توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی • دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

صفحہ ۲۷

...«البلاغ» کے خالق حیدر کرار کے «نطق کا شائبہ کثیر ہی قدرت نے ...یا تھا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کی فضاؤں میں اُن کی تقریروں کی گونج آج بھی ...۔ اندر کے طاق اور ایوان اُن کی تصویروں سے مزین ہیں۔ لیکن جدوجہد ...ریخ میں اُن کی خدمات طاقِ نسیان کی نذر ہو کے رہ گئی ہیں۔ گاندھی جی ...م آزاد، اور جواہر لعل نہرو جیسی قد آور شخصیتوں کے گہرے سایوں کی آنکھیں ...ت کی تصویر کا یہ رخ دھندلا گیا ہے۔ ناد سا ... پہلا ... ...نصیب ہوئی۔ غالباً یہ انسان کے حصے «جسرت» کی چھاپ ہے۔ اُردو ...ار خ میں غالب اور اقبال کے بعد حسرت کے حصے میں آئی ••

فہرست

غنی نعیم

رحمٰن جامی
فن اور شخصیت

لمحات کی رنگینی اور سنگینی کا احساس اُس وقت شدید ہوتا ہے جب کسی مہربان کا کرم بظاہر ستم محسوس ہو ۔ انداز پُرخلوص تحریک تحریر کے لئے ایسا عنوان تجویز کرے جو دلکش، پُرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ ہوشربا اور حواس باختہ ہو حسبِ معمول رات دیر گئے گھر پہنچا تو مجھے ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ انتہائی دیدہ زیب سلکِ گہر کی مانند ایک نشاطیہ الشائیہ میرے میز پر رکھا تھا۔ میرے عزیز مکرم عزیز بھارتی صاحب کی موہنی شخصیت کی طرح اُن کی تحریر کی مٹھاس روح پروری اور دلنوازی کا سبب بنی ۔ نجانے کیوں رحمٰن جامی کا شعر ذہن میں آگیا کہ :-

پھر کوئی ہونے لگا ہے مہرباں ● پھر ہمیں دینا پڑے گا امتحاں

اور وہ مہرباں بقولِ رحمٰن جامی جن کی تعریف ہو نہیں سکتی ۔ لوگ کچھ بے مثال ایسے ہیں۔ ایسے بے مثالوں کو جب امتحان لینا مقصود ہوا تو میں نے سوچا چلو موقع غنیمت ہے ۔ اس بازار مصر میں خریداروں کی فہرست میں اپنے نام کی شمولیت خوش بختی ہے۔

رحمٰن جامی قد آور، ممتاز شاعر ہیں لیکن میری کم نصیبی کہ میں شاعر رحمٰن جامی سے واقف نہیں ہوں البتہ صرف رحمٰن جامی سے شناسا ضرور ہوں۔ یہ برملا اظہار اعتراف حقیقت ہے کیونکہ اس میں میری عافیت ہے۔ شاعر رحمٰن جامی پر اظہار خیال میری کم علمی کا واضح ثبوت تو ضرور ہوگا لیکن رحمٰن جامی کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کی شاعری نے جغرافیائی حدیں توڑ دی ہیں۔ اس بات کا اُسے

احساس ہے کہ ؎ اہلِ دکن ہوں اُردو ہے جاتیؔ مری زباں
اب لکھنؤ و دہلی و لاہور مجھ میں ہے

وہ بذاتِ خود اُردو ہی اُردو ہے یعنی رحمٰن جاتیؔ کی شخصیت کو پیش کرتے ہوئے۔ میری اپنی عزت و توقیر کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ البتہ خیالِ خاطرِ حبیب احساس کے آبگینہ کی حفاظت ہتھیلی کے چھالے کی مانند کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

رحمٰن جاتی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ فنِ شعر تنقیدِ حیات ہی نہیں بلکہ معیارِ زندگی ہے۔ وہ فن کاری اور کاری گری کے اس نازک فرق کو محسوس کرتا ہے کہ ؎
بات میں وزن اگر ہو تو یقیناً جاتیؔ ● گُل کھلا جاتی ہے لفظوں کی بناوٹ کیا کیا

رحمٰن جاتیؔ کی شاعری جو اُسے اپنے ہمعصروں میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قدیم اور جدید کی اصطلاحات میں نہیں سوچتا ہے بلکہ ماضی کی کلاسیکی اقدار سے اپنا فکری رشتہ مضبوطی کے ساتھ استوار رکھے ہوئے وہ "حال" میں نمایاں طور پر "موجود" ہے اور مستقبل میں یقینی زندہ رہے گا جبکہ اس کے بہت سے ہمعصروں نے اپنا رشتہ ماضی سے توڑ لیا ہے۔ اسی لئے 'حال' میں ان کی 'موجودگی' کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ مستقبل کا مورخ 'ایسوں' کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ بدلتے ہوئے زمانے کے تیور' سماج کی بے چینی اور اس میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں ایک اچھے شاعر کی فکر پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ رواں دواں زندگی۔ ماضی' حال اور مستقبل کا ایک مسلسل سلسلہ ہے اسی لئے رحمٰن جاتیؔ جیسے باشعور شاعر نے کلاسکیت' ترقی پسند روایات اور جدید تجربوں کو ہم آمیز کرکے غزل کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ جدیدیت صرف نئی علامتوں' اشاریت' تجریت' وجودیت' ابہام یا تنہائی کے مرثیہ کا نام نہیں ہو سکتا ہے بلکہ بدلتی ہوئی زندگی اور تیز رفتار زمانہ کی نیرنگی کے تعلق سے شاعر کے اندازِ فکر اور نئی حسیت کا نام ہے۔ اور

یہی فن شعر ہے جو فنونِ لطیفہ میں بلند ترین مقام رکھتا ہے۔ شاعری سچائی کا اظہار ہے۔ یہ کسی دیوانے اور مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ بیدار مغز افراد کی تخلیق ہوتی ہے۔ بقول مجنون گورکھپوری "شاعری ہو یا کوئی فن ایک فکریاتی عمل یا حرکت ہے جس کے ذریعے متمدن انسان کے جذبات و خیالات جو اس خاص دور کے معاشرتی نظام کی نمائندگی اور آئندہ دور کی طرف اشارہ کرتے ہیں اپنے کو جمالیاتی تصویروں کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اجتماعی شعور کے اظہار کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقے کا نام شاعری ہے۔ یہ اظہار شعوری ہو یا غیر شعوری لیکن اضطراری یا میکانکی کبھی نہیں ہوتا۔" شاعری ایک شعوری عمل کا نتیجہ ہے۔ فنکاری اور کاریگری بقول جاتی لفظوں کی بناوٹ گُل کھلاتی ہے تو فنونِ لطیفہ اور حواسِ خمسہ کا ایک غیر محسوس باہمی ربط کا خیال آتا ہے۔ انسان کی نفسیات پر خارجی عمل اور ردِ عمل اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاریخی 'معاشی' سماجی اور تہذیبی روایات فنکار کی شخصیت کی تشکیل غیر محسوس طریقے پر کرتے ہیں۔ اس طرح کردار اور شخصیت سنورتے اور بگڑتے ہیں۔ سنور کر بگڑنے اور بگڑ کر سنورنے کے وقت کا تعین اور تغیر کا احاطہ وقت ہی کرسکتا ہے۔ بقول رحمٰن جاتی ؎

بنا ہوں بگڑ کر کچھ اس طرح جاتی ● اب اپنی جگہ ایک شہکار ہوں میں

تو کسی کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ؎

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے ● دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے

انسانی ذہن اور نفسیات کی نزاکتیں اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور شخصیتوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ شخصیت کی مقناطیسیت اور خوشبو بہتوں کو اپنی طرف رجوع کرلیتی ہے اور بسا اوقات شخصیت کی نقاہت وکثافت اور بدبو بھی اپنے ہم مزاجوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتی ہے۔ فطرت کا یہ فیاضانہ عطیہ بہ اعتبار فطرت اور ظرف حواس خمسہ کے عین مطابق کم و بیش فنونِ لطیفہ میں نظر آتا ہے۔ اسی لئے

جدّ نے کہا کہ " تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی " ایک غیر محسوس رشتہ فن کار کی شخصیت اور فنونِ لطیفہ میں استوار ہوتا ہے۔ بات فطرت کی فیاضی، انسانی ظرف کی ہے۔ سمندر سے پیاسے کو شبنم ہی ملتی ہے اور کبھی پیاس کی شدت کرنے سمندر تک ظرف میں سمیٹ لئے جاتے ہیں۔ رحمٰن جامی نے کہا " میں وہی پیاس ہوں ایک سانس میں دریا کھینچوں "۔ بات ظرف کی آئی تو خیال میں رحمٰن جامی کی ایک مختصر نظم آ گئی کہ

جھیل کا پانی ساکت ہو کر سوچ رہا تھا / میں بھی ہوں ایک گمبھیر سمندر / لیکن اک کنکر سے / اس کی خاموشی ٹوٹ گئی ہے / اُس کی وہ گمبھیرتا اُس سے چھن گئی ہے / اُس کو کیا معلوم / سمندر کیا ہوتا ہے

جھیل کے پانی کا یہ عالم اور سمندر کی یہ کیفیت قدرت کے ان مظاہر کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے اور جب قدرت کے شہکار حضرتِ انسان کی فطرت کو سمجھنے کی بات ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے عمرِ خضر بھی کم ہے۔ مشکل مرحلہ، دشوار جادہ اور نارسائی منزل کا احساس اس وقت شدید ہوتا ہے جب کسی فن کار بالخصوص کسی شاعر کے فن اور شخصیت پر اظہارِ خیال کیا جائے۔ علاوہ بریں جس طرح پھول کی خوشبو اپنا سفر از خود کرتی ہے اور اپنے وجود کا احساس دلا کر بالیدگی روح کا سامان فراہم کرتی ہے اسی طرح فن کار کی تخلیق از خود اُسے سماج میں معتبر اور مقبول بناتی ہے یا پھر بدبو کا احساس کراہیت پیدا کر کے حسیات کو متاثر کرتا ہے تو آج کے ادبی یا شاعرانہ ماحول کا تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ

گم ہو گئی ہے شاعری لفظوں کی بھیڑ میں
مفہوم کس سے پوچھے طوطوں کی بھیڑ میں

تو باذوق طبقہ اس فردوسِ گمشدہ کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس کی بازیابی نئی زمینوں میں غزل کہہ کر صلائے عام دینے والا شاعر جامی قدآوروں کی بھیڑ میں کھونے کے باوجود بھی اپنی قدآور بلند و بالا شخصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کے بہت ہی کلمات

شعروں نے سخن فہموں میں اس کو مقبول اس لئے بنایا ہے کہ اس نے مجروح شاعری کے زخموں پر نہ صرف اپنی فکر کا پھایا رکھا بلکہ اپنے تغزل اور تخیل سے مرہم بھی لگایا اور اس طرح غزل کی شان، وقار اور آبرو کی پاسبانی اپنی پوری دیانتداری سے کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جامی کی شاعرانہ فکر نے انسانی درد کو پہچان لیا۔ اُسی لئے کہنے میں وہ حق بجانب ہے کہ

شعر میں میرے ڈھل گیا جامی ● ایک احساس وہ جو سب کا تھا

شخصی درد و غم اور اجتماعی رنج و الم ایسے ہم آمیز ہوئے کہ ؎

شعر رحمٰن جامی نے جب بھی کہے ● شعروں میں خود بخود زندگی بول اُٹھی

غزل میں انسانی دل کے جذبات و احساسات اور سماجی کیفیات و حالات کی پیش کشی نے اُسے یہ احساس دلایا ہے کہ ؎ شعر تمہارے سُن سُن کر اسے جامی دُنیا جی اُٹھی

سُننے والوں کا کہنا ہے جان پڑی بے جانوں میں

جامی کا نظریہ شعر یہی ہے کہ " زندگی پیار ہے زندگی شاعری " اور جامی کا کہنا ہے کہ " کہتے ہیں لوگ اصل میں ہے شاعری غزل "۔ تو جب شاعری غزل ٹھہری تو جامی کی غزلوں میں جامی کی تلاش آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ مشکل کی آسانی یوں ممکن ہے کہ شاعر کی شخصیت اس کی غزلوں میں بکھری ہوئی ہے۔ وہ بھی اس پُر غضب انداز میں کہ

آئینہ ٹوٹ کر مجھے تقسیم کر گیا ● کتنا بٹا ہوا ہوں یہ تفہیم کر گیا

جمع و تقسیم کا یہ عمل از خود ہے۔ تفریق مشکل ہی نہیں محال ہے کیونکہ تجسیم کچھ اس انداز میں ہوئی کہ ؎ " اس آئینہ خانے میں آکر دیکھو ● ہر سمت عکسِ رُخِ یار ہوں میں "

یہ احساس اس کی شخصیت کی اساس ہے۔ میں نے اعتراف کیا ہے کہ میں صرف رحمٰن جامی سے شناسائی رکھتا ہوں۔ اور شاعر رحمٰن جامی سے واقف ہونے کے لئے مجھے رحمٰن جامی جیسی ہمالیائی شخصیت پر تتلی کی مانند یلغار کرنی پڑتی ہے تو مجھے ایک ایسی شخصیت کی قوس قزح ملتی ہے جس میں معصومی، محرومی، خود استغنائی، خودسری اور خود نمائی کے رنگ گہرے

جاتے ہیں۔ رحمٰن جامی حیدرآباد میں حیدرآباد سے باہر، جغرافیائی حد بندیوں سے پرے شہور بھی ہے بدنام بھی۔ رندی سے لیکر پارسائی تک۔ تمام تر استقامت کے ساتھ ں کی شرافتوں سے لے کر نفس کی شرارتوں کے ہمراہ۔ مصلحتوں سے کوسوں دور حق بات مُنھ سے دو ٹوک کہنے کا عادی۔ عصر حاضر کا وہ "سقراط جو زہر کا پیالہ اللہ شافی" کہہ کر لیتا ہے۔ صداقت بے ریائی اور بے باکی کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ۔ یاروں کا یار۔ لیکن خود اپنا دشمن طرفہ تماشا ع "سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی" کے مصداق خود کو بری الذمہ سمجھتا ہے کہ ؎ اُٹھا کر ناز اپنے دوستوں کے

میں خود اپنا ہی دشمن بن گیا ہوں

عر کا پہلا مصرعہ حقیقت کے قریب ضرور ہے لیکن مصرعۂ ثانی اس کی توجہ اور فکر کا محتاج ہے کیونکہ اس نے دوسروں کے ہاتھوں میں اپنا ریموٹ کنٹرول دے رکھا ہے۔ آج کل "نگاہ دل کی مسلمانی" کو اپنانے میں شدت کے ساتھ مصروف اور مشغول ہے۔ رحمٰن جامی شاعری کسی کا شاگرد نہیں ہے۔ البتہ اس کے شاگردوں کی طویل ترین فہرست ہے جس میں کئی ملنز دنیائے شعر و ادب میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس خصوص میں جامی بہت ہی نت گیر اور شدید ہے۔ وہ صرف ایسے افراد کو جن میں شاعرانہ صلاحیتیں اور جوہر محسوس رتا ہے۔ انھیں مشقِ سخن کی اجازت دے کر اُن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ فنِ شعر سے ہیں واقف کرا کر حوصلہ بڑھاتا ہے۔ وہ کبھی اپنی فکر کے اُجالے سے کسی کی "پہچان" شیت شاعر کرانا یا پھر اپنی "نوازش" سے کسی کو شاعر تسلیم کرانا ادبی بددیانتی ہی نہیں قابلِ سزا جرم اور گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔ اس کے کردار کا یہ روشن پہلو بہت سے تاریک ہنوں کو جو شاعری جیسے عظیم فن کو "کاروبار" سمجھتے ہیں۔ لمحہ فکر مہیا کرتا ہے۔ بات ن جامی کی شخصیت کے آئینہ کی ہے جس میں وہ بحیثیت شاعر جلوہ گر ہے۔ جلوؤں نیرنگی کے رنگ، معصومی، محرومی، خودنمائی، خود انتقامی اور خودسری ہیں۔ اس

اجمال کی تفصیل کے لئے کہ وہ اپنے وجود کے کرب کو جبر و اختیار کے آہنی سانچے میں خود انتقامی کے آتش دان میں جب ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو شعر کا شعلہ یوں بھڑک اٹھتا ہے اور ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے کہ ؎

یہ کیسی سزا میرے خدا مجھ کو ملی ہے ● دشمن ہے جو میری وہ انا مجھ کو ملی ہے

اس کے ساتھ ہی اس کی خود سری ملاحظہ کیجئے جو بغاوت کی سرحد چھو رہی ہے ؎

تو نے جس کو مری انا سمجھا ● تھی وہ تیری ہی برہمی مجھ میں

یہ اندازِ فکر شدید احساس محرومی کا غماز ہے جو اس کے مخفی جذبات دبی ہوئی احساسات قلبی کو لفظوں کا پیراہن یوں عطا کیا کہ ہر ہر لفظ میں درد و کرب کی شدت ہے اور ہر ہر لفظ کے ایک اک حرف میں برقی لہروں کی حدت پوشیدہ ہے۔ اپنی بازیافت کے لئے تشکیک و گمان سے گزر کر منزلِ یقین کے اس مسافر کو یہ عرفان ہوا کہ ؎

بس تمہارے اک تکلف کے سوا ● کون ہے مرے تمہارے درمیان

آگہی کا یہ درد سہنا دشوار ہو گیا۔ اس کے قدم بہکنے لگے۔ ہوش نے ساتھ چھوڑا مستی نے سہارا دیا۔ صحو نے بطلا دہ کہ ؎ تھا میکدہ کا بھی مسجد کا راستہ بھی وہی

یہ اور بات کہ رستے میں کھو گئے ہم بھی

اس گم کردہ راہی کے لئے مذہبی گھرانے کی سخت گیری اور پابندیوں نے اسے ظلمتِ شب میں نورِ سحر تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی سریع الحسی اور نزاکتِ نفسی کا سبب اس کے بزرگوں کا لاڈ پیار اس کی جا و بے جا ہر خواہش کی تکمیل اس کے دوستوں کی یہ کوشش کہ نازک آبگینہ کو مزید ٹھیس نہ لگے اسے دستکِ نیم شب کا عادی اور ضدی بنا دیا گیا۔ کریلا نیم چڑھا۔ گاؤں کی معصوم فضاؤں میں سانس لینے والا اس پاکیزہ ماحول میں از خود شعر موزوں کرنے لگا۔ اپنوں سے اپنے ناز اُٹھا اُٹھا کر اپنا دشمن آپ بن گیا۔ شہر کے مسموم ماحول میں گھٹن کے احساس کے ساتھ بے راہ روی کے لئے کھلا

یدان مل گیا۔ آج کی مطلب پرست خود غرض دُنیا جس میں سماجی، سیاسی، معاشی مذہبی
ر اخلاقی ناہمواریاں ہیں وہ جاتی جیسی حساس شخصیت کے لئے نہ ہی موزوں ہے اور نہ
زگار۔ اسی لئے جاتی اور شاعر جاتی میں شدید ٹکراؤ ہے۔ اس کی شاعری میں انسانیت
دسمٹا ہوا ہے۔ اُس نے محبت کی لیکن آج تک شاید اس کی محبوبہ کو بھی یہ علم نہیں کہ
اس کے لئے دیوانہ بھی ہے اور بیقرار بھی۔ محبت کی عزت، حسن کی عظمت اور اپنی
ا فطرت کے ساتھ خود ضبطی لئے وہ اپنی دُنیا میں مست اور مگن ہے۔ اس لئے اس
کر نے محبت سے محنت تک پرواز کی۔ شخصی محبت کے آنگن سے نکل کر انسانی
ت کے میدان میں جب وہ آیا تو غم جاناں کو غم جہاں میں سمو دیا۔ خود کو دُنیا کی نظروں
چھپانے اپنی فکر اور اپنے خیال کی وادی میں خود کو گم کر دیا اور پابندِ رسوم و قیود ہو گیا
ایک عالم کو حیرت ہوئی تو اُسے مجبوراً کہنا پڑا ؎

بات سُن کر مِرے سدھرنے کی
لوگ کتنے بگڑ گئے ہوں گے

میں اس بگڑے جاتی کو ڈھونڈھ رہا ہوں جس نے زمانے کو بتا دیا کہ استقامت
ہے۔ صداقت کسے کہتے ہیں۔ ارادہ کیا ہوتا ہے۔ خود اعتمادی کس چیز کا نام ہے
ور انانیت میں کیا فرق ہے۔ بے جگری کے کیا معنی ہیں۔ سناٹے کو کیسے آواز
جاتا ہے۔ میں اس جاتی کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ یہ میری سادہ لوحی ہے۔ کیونکہ
و ؎　مسجد میں بیٹھا ہے جا کر میں نے سُنا ہے رِندوں سے
میں ہی نادان ڈھونڈھ رہا تھا جاتی کو میخانوں میں

●●●

صلاح الدین نیّر
حیدرآباد۔

رحمٰن جامی

- کھرا انسان
- سچّا دوست
- بہترین شاعر

ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے بھی لمحے آتے ہیں جو خوشگوار روابط و تعلقات کے باوجود بھی موقتی فاصلوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یوں بھی تو ہوتا ہے کہ زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ سارے فاصلے سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ یہی بات میرے اور رحمٰن جامی کے درمیان ہوئی۔

جب کسی انسان سے نئی نئی ملاقات ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو سمجھنے کیلئے کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا۔ لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ برسوں ساتھ رہنے کے باوجود بھی ایک دوسرے کو سمجھنے کا عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ بعض لوگ پہلی ہی ملاقات میں سمجھ میں آجاتے ہیں اور بعض لوگوں کو سمجھنے کے لئے ایک عمر گزارنی پڑتی ہے۔ اگر انسان کو اپنی زندگی کے اولین سفر کے دوران اس بات کا احساس ہو کہ اپنے مدمقابل اپنے ہی قبیلہ کا آدمی ہے تو ایک پُرسکون اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ رحمٰن جامی کا تعلق بھی ایسے ہی ایک قبیلہ سے ہے جس کے تیور تلوار کی تیز دھار اور جس کی گفتگو پُرخلوص لب و لہجہ کی بے ساختگی اور والہانہ پن کی ضمانت دیتے ہیں اور جن لوگوں کی زندگی آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے۔ اُن کی زندگی کسی غیر مری مرحلہ پر یہ ممکن ہے کہ دھوکہ کھا جائے لیکن دھوکہ دے نہیں سکتی۔ اس قبیل کے سچے دوست اور سچے آدمی کم یاب ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن رحمٰن جامی کا وجود طمانیت کا باعث ہے۔

رحمٰن جامی سے میری دوستی کی اساس شعر و ادب کے اُن روز و شب سے
لق رکھتی ہے جس میں تخلیق کار اپنی معنوی اولاد کو بہترین سے بہترین شکل و صورت
ں دیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔

اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہر نیا شاعر اپنی شخصیت کے خدوخال میں
نگ بھرنے 'سنورنے' بنانے اور نکھارنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی یہ بھی خواہش
تی ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیت سے اپنے فن کا پُر اثر انداز میں مظاہرہ کرے
جبکہ ہم دونوں کی شاعری کا عنفوانِ شباب تھا)

کچھ شاعر دوست جہاں رحمٰن جامی کو ایک کہنہ مشق شاعر' ماہرِ علم عروض
بِ اسلوب' بالغ نظر نقاد اور بے باک مقرر سمجھتے ہیں وہیں کچھ شاعر دوست ایسے
ملیں گے جو رحمٰن جامی کی انسان دوستی' اُصول پسندی اور ادب نوازی کو بھی عزیز رکھتے
۔ ہر انسان میں جہاں مختلف قسم کی خوبیاں ہوتی ہیں وہیں اس میں کچھ خامیاں بھی ہوتی
۔ لیکن مجھے روابط کے اِس طویل سفر میں رحمٰن جامی کی صرف خوبیوں سے واسطہ رہا۔
جامی کی بلا نوشی ایک طویل عرصہ تک اُن کی خامیوں کا لبادہ اوڑھے اُن کی شخصیت کو
ح کرتی رہی۔ شراب نوشی نے محفلِ شعر و ادب اور معاشرہ کے کچھ قابلِ احترام حصوں کو
متاثر کیا تھا لیکن آخر کب تک ؟ ہر چیز بالآخر اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے چنانچہ
کا ایسا کرم ہوا کہ رحمٰن جامی کی دُنیا ہی بدل گئی۔ پھر وہ دینِ دُنیا کی تمام راحتوں اور
سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ ترکِ مئے نوشی نے جامی کے طرزِ حیات کو قابلِ احترام بنادیا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں نے جامی کو اُن کے ہر روپ میں پسند کیا ہے۔ ہر
سان جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو مجھے اچھا لگتا ہے اور جب کوئی ساتھی میرے اُصول کی
پر پورا اُترتا ہے تو میں دوستی کے ہر مرحلہ پر اُس کا استقبال کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں
ہے کہ جامی سے میری ملاقات کی بنیاد مشاعروں کی معرفت سے ہوئی۔ مجھے یہ بات

پسند نہیں تھی کہ اپنے ہی قبیلہ کا ایک اچھا آدمی جام و مینا سے اِس حد تک دوستی کرے کہ آگہی اور بے خودی کا فرق ہی مٹ جائے۔ ان دنوں جاؔمی کے دوست و احباب اُن سے گفتگو کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ میرے شہر کا ایک بہترین شاعر اپنی مقبولیت کھوتا جارہا ہے۔ وہ رحمٰن جاؔمی جس کی رومانی نظمیں ہر سطح کے صاحب ذوق خواتین وحضرات کو متاثر کرتی رہی ہوں۔ وہ رحمٰن جاؔمی جس کا کلام ہند وپاک کے ہر معیاری رسالے میں چھپتا ہو' وہ رحمٰن جاؔمی جس کو اپنی ابتدائی شاعری کے اولین مراحل پر ہی مقبولیت کا اعزاز حاصل ہوا ہو' جب معاشرے سے کٹتا جارہا تھا تو مجھے بے حد دکھ ہوتا تھا۔ جاؔمی کا جام و مینا سے رشتہ ٹوٹتے ہی گویا ان کی حیات طویل ہوگئی۔ میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ جاؔمی حیدرآباد کے کُل ہند مشاعروں میں کلام سُناتے رہیں۔ جاؔمی ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی مشاعروں میں کلام سُناتے ہوئے اپنی ذی وقار شاعرانہ حیثیت کے ساتھ اپنے منصب پر فائز رہیں۔

دور حاضر کے ممتاز اساتذہ سخن میں رحمٰن جاؔمی کا بھی ایک منفرد مقام ہے۔ ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان میں " قدیر انصاری ' اَن پڑھ جہانگیری 'نسیم اعجاز نسیم ' زیادہ نمایاں ہیں۔ رحمٰن جاؔمی کو ہر صنف سخن میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔ شعری ادب میں جدّت طرازی کے ساتھ نئے نئے تجربات کرتے رہنے کے عادی ہیں لیکن وہ اپنی بنیادی روش سے انحراف نہیں کرتے یعنی غزل کے علاوہ پابند نظم کو دلی کیفیات' تجربات مشاہدات اور تخیلات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جاؔمی بنیادی طور پر ایک ایسے شاعر ہیں جو کلاسیکی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عصری آگہی کے ترجمان بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں جیتی جاگتی 'چلتی پھرتی زندگی کی وہ تمام دھڑکنیں ملتی ہیں جو حیاتِ جاوداں کی طرح فرحت افزاء ہے۔ موضوعاتی شاعری میں جاؔمی اپنی آپ مثال ہیں۔ مختلف موضوعات پر اُنھوں نے بے شمار نظمیں کہی ہیں۔ ہر موضوع پر اپنا تاثر قبول کرنے والے شاعروں میں جاؔمی کچھ زیادہ ہی رواں دواں ہیں۔

رحمٰن جامی کی مشاعروں میں آمد یہ احساس دلاتی ہے کہ ایک قد آور شاعر موجود
ز سُناتے کا انداز فاتحانہ رہتا ہے۔ طرزِ تخاطب پُر اثر ہونے کے علاوہ مخاطب کو مزید
جاری رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جامی ایک کُھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ جو بھی اُن سے
وہ اُن کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ جامی جس محفل میں بھی رہتے ہیں۔ شعراء کے علاوہ
محفل بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ جامی محفل میں موجود ہیں۔ ان کی نشست و برخواست'
تگو' بار بار مسکرا دینا' کبھی دھیمے لہجے میں اور کبھی اُونچی آواز میں مصروف تکلم رہنا اور کوئی
بات دورانِ گفتگو وقوع پذیر ہو تو بڑھ کر مصافحہ کرنا' اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ جامی
ت کے پہلو ہیں۔ جن کا بے ساختہ اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جامی کی زندگی میں وہ بیزمری ساعتیں
ا زندگی کا حاصل ہیں اپنی تنہائی میں صبح کی پہلی کرنوں کی طرح ان کی شخصیت کو
نے میں مصروف ہیں۔

دو سال قبل جامی کا پہلا مجموعہ کلام " جام انا " شائع ہوا ہے' جس کی ادبی
میں کافی پذیرائی ہوئی۔ جامی کے غیر مطبوعہ سرمایہ سخن کو اگر کتابی شکل دی جائے تو
ں بہ یک وقت ۱۷' ۱۸ مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔

جامی وعدہ کے پابند' اُصول کے پاسدار' روابط کے استحکام اور مراسم کے
ں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جذباتی انسان بھی ہیں۔ کوئی بات اگر مرضی کے خلاف
آگ ہو جاتے ہیں۔ جب سنجیدہ ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعت موم بن جاتی ہے'
ا نرم گفتاری فاصلوں کو گھٹانے کی ترغیب دیتی ہے۔

رحمٰن جامی ہمارے شہر کے اُن اہم شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا
ادب کے حلقوں میں ہر دور میں توقیر کی نگاہوں سے پڑھا جائے گا۔

صادق نوید
صدر ادارہ عصری ادب
مکان نمبر ۷-۴-۳-۱۱
نیو ملے پلی۔ حیدرآباد۔۱

دکن کا البیلا شاعر

رحمٰن جامی

محبوب نگر کی زرخیز زمین پر جنم لینے والے شاعر کو بچپن ہی میں محبوب کے نگر سے جدا ہونا پڑا۔ لڑکپن میں عشق و محبت کا سبق رائچور میں ازبر کرتا رہا۔ اور اس سبق کو عام کرنے کے لئے اہلِ رائچور کے دلوں کو چور چور کرتا ہوا شہرِ محبت حیدرآباد تک پہنچا جس کو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ بھاگ متی (حیدر محل) کے نام پر آباد کیا تھا۔ جامی کے عشق کا حسین سفر محبوب کے نگر سے محبوبہ کے نگر تک محیط ہے۔ عشق کے اس طویل سفر نے اسے ایک محبوب شاعر بنا دیا ہے رحمٰن جامی حیدرآباد نہیں آیا بلکہ جواں سال یار جامی آیا تھا۔ شہرِ نگاراں کی کشش اسے یہاں کھینچ لائی۔ پہلے پہل یاروں کا یار' یار جامی کے نام سے ادبی دنیا میں متعارف ہوا۔ حیدرآباد میں اسے اپنی مرادوں کا نگر یعنی مرادنگر مل گیا۔

یادش بخیر میری جامی سے پہلی ملاقات مرادنگر میں منعقدہ ایک مشاعرے میں ہوئی جس میں ملے پلی سے برق یوسفی اور راقم الحروف نے شرکت کی تھی (ان دنوں ملے پلی کے رہنے والے شاعروں میں عزیز عارفی، شفیع اقبال اور مومن خاں شوق نے شعر گوئی کا آغاز نہیں کیا تھا) جہاں ہر دو شاعروں نے تغزل کا رنگ

جمایا۔ وہاں اس البیلے شاعر رحمٰن جامی نے تیکھے انداز کی ایک رومانی نظم سُنا کر محفل کو گرما دیا۔ غالباً فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کی طرح یار جامی نے نظم گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ اس لحاظ سے میری دانست میں جامی بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہے تاہم بہترین غزل گو بھی۔

یار جامی کو ایک نہ ایک دن رحمٰن جامی ہونا تھا سو وہ یاروں کے مخلصانہ مشوروں سے تخمیناً اٹھائیس[۲۸] سال قبل رحمٰن جامی ہو گیا۔ یار جامی سے رحمٰن جامی ہونے تک شاعری کے مسلسل سفر نے اس کے فکر و فن میں نکھار پیدا کیا۔ یار جامی اور رحمٰن جامی کے فرق کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی کی سرحدوں کو چھونے لگا۔ جامی کے مجموعۂ کلام " جامِ انا " کے پیش لفظ میں' جامی کے برادرِ محترم قاری محمد عبدالعلیم نے لکھا ہے " چونکہ والدِ مکرم سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک سالک تھے اور حضرت جامی علیہ الرحمہ کے نعتیہ' فارسی اور عربی کلام سے بے حد متاثر تھے اور اُنھوں کا نعتیہ کلام مزے لطف کے ساتھ دُہرایا کرتے تھے۔ حضرت جامی علیہ الرحمہ سے اپنی غیر معمولی محبت و عقیدت کی بنا پر اپنے نومولود کی عرفیت بھی جامی رکھی۔ بس یہ عرفیت اور نام کے ساتھ مشابہت بہر حال رنگ لے آئی اور یہ نام ہی کی نسبت اور برکت کا ظہور ہے کہ رحمٰن جامی کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقبول اور معروف شاعر کی حیثیت بخشی " چنانچہ میں بھی قاری عبدالعلیم صاحب کے اس اقتباس سے حرف بہ حرف متفق ہوں۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ والد کی دُعائیں اولاد کے حق میں پیغمبروں کی دُعاؤں جیسی ہوتی ہیں جو رد نہیں کی جاتیں۔ نتیجتاً رحمٰن جامی اپنے والدِ بزرگوار کے خواب کی مکمل تعبیر نظر آتا ہے۔ جہاں اُس نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے' وہیں حمد و نعت کہنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ چنانچہ اس کی نعتیں مقبولِ بارگاہ ہو کر کیسٹ کے رُوپ میں مکہ مدینہ پہنچ بھی چکی ہیں جو یقیناً رحمٰن جامی کی نجات کا وسیلہ ہیں۔

رحمٰن جامی حقیقتاً (A SELF MADE MAN) ہے۔ اس کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ فارسی اور عربی کی استعداد بھی حضرت عبد الرحمٰن جامی علیہ الرحمہ کے نام کا فیضان ہے۔ الفاظ کے صحیح استعمال اور تلفظ کی صحت پر وہ بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے اپنے عثمانیہ یونیورسٹی کے اُستاد ڈاکٹر حمید الدین شطاری مرحوم اکثر یاد آجاتے ہیں جو اپنے شاگردوں کو اکثر الفاظ کے صحیح تلفظ سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ برسوں سے رحمٰن جامی میرا نہایت پُر خلوص، بے تکلف، قریبی دوست ہے۔ حق گوئی اور بے باکی اس کی پہچان ہے۔ گفتار کا غازی تو پہلے ہی سے تھا اب کردار کا بھی غازی بن گیا ہے۔ بلا جھجک مُنہ پر کھری کھری کہنے سے نہیں رُکتا۔ کھلے ذہن اور بڑے ظرف کا مالک ہے اُسی کی طرح کوئی قریبی مخلص دوست اُس کے مُنہ پر بھی اس کے بارے میں کھری کھری سُنا دے تو بغور سُنتا ہے۔ اور فراخ دلی کے ساتھ برداشت کرجاتا ہے۔ دل میں کینہ نہیں پالتا۔ اس کے غصّے کی مثال بادل جیسی ہے۔ اُمڈ اُمڈ کر آیا برسا اور کُھل گیا۔ پھر مطلع صاف۔ ادارۂ مرکز ادب کی ابتداء اور اس کے بعد ادارہ اقلیم ادب کی تمام تر ادبی سرگرمیوں میں میرے دوست رحمٰن جامی نے مجھے اپنا رفیقِ کار بنائے رکھا۔ اسی دلی محبت کے دیرینہ رشتے نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا آئینہ بنا دیا ہے۔

میں نے اس کی زندگی کے دونوں رُخ دیکھے ہیں۔ میں اِس کی رِندی اور پارسائی کا چشم دید گواہ ہوں۔ چند برس پہلے وہ مجھ سے تقریباً روز ملا کرتا تھا یا پھر ملنے پر مجبور تھا۔ گویا میں اس کے آنے جانے کے راستے میں حائل تھا۔ بڑا زود گو شاعر ہے۔ رحمٰن جامی ہر روز تازہ کلام کہہ لاتا اور مجھے اپنے کلام کا پہلا سامع ہونے کا اعزاز بخشتا مجھ سے بے ساختہ داد پاتا اور جواباً مجھ سے اپنا کلام سُنانے کی فرمائش بھی کرتا اور فراخ دلی سے داد دیتا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ غالب نے کہا تھا۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر ● ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

غالب کی اس کمزوری کو حیدرآباد کے اکثر شعرا نے فیشن کے طور پر اپنا لیا تھا۔ رحمٰن جامی بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اپنے پیارے دوست رحمٰن جامی کو شغلِ غالب میں مبتلا دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا اور اس کے اس عمل کی مذمت میں چند قطعات میں نے کہے تھے جنہیں سن کر جامی پہلے تو بڑا چراغ پا ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ جامی کی پارسائی رندی پر غالب آگئی اور اس نے رندی کو شکستِ فاش دے دی۔

میں نے آتشِ سیال کی مذمت میں جو قطعات کہے تھے ان میں سے ایک ملاحظہ ہو۔

کچھ لوگ کھلونوں سے بہل جاتے ہیں • کس شئے پہ مچلتے ہیں پگھل جاتے ہیں
حالات کی تلخی جو نہیں پی سکتے • پیتے ہیں بہت دور نکل جاتے ہیں

نہ صرف مئے نوشی بلکہ جامی کے غیر معمولی (WILL POWER) نے سگریٹ کو بھی طلاق دیدیا ہے۔ رحمٰن جامی دھن کا پکا اور وعدے کا سچا ہے۔ جو کہتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا یہی وصف اپنے ہم عصر ساتھیوں میں اسے باعث توقیر بنا دیتا ہے

جگر مرادآبادی نے کہا تھا "جو اچھا انسان نہیں وہ میری نظر میں اچھا شاعر نہیں"

رحمٰن جامی اچھا شاعر بھی ہے اور اچھا انسان بھی۔ اس نے اپنی دونوں حیثیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ رحمٰن جامی کا کلام برسوں سے ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی ممتاز شاعر رحمٰن جامی کا کلام قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جامی حیدرآباد اور اضلاع کے کئی کل ہند مشاعرے پڑھ چکا ہے۔ شنکر جی اور ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں برسوں سے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں میں وقتاً فوقتاً حصہ لے کر سامعین اور ناظرین سے داد پاتا رہا ہے۔ ٹی وی کے قومی پروگرام نٹ ورک کے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جاتا رہا ہے۔

رحمٰن جامی کی ہشت پہلو ادبی شخصیت میں شاعر، فلمی گیت کار، کہانی کار،

نثرنگار، افسانہ نگار، تبصرہ نگار، تنقید نگار اور جادو بیان مقرر شامل ہے۔ اس کی زیرِ اشاعت کتابوں کی فہرست بھی بڑی طویل ہے۔ اس کے شاگردوں کا صحیح حساب وہی بہتر جانتا ہے۔ زیادہ تر قدیر انصاری اور کبھی کبھی نسیم اعجاز ہمارے ساتھ شریکِ مشاعرہ رہتے ہیں۔

پچھلے سال ۹ مئی ۱۹۹۳ء بزمِ شمعِ ادب اردو (منرل) کے زیرِ اہتمام "ایک شام رحمٰن جامی کے نام" منائی گئی جس میں راقم الحروف نے بھی حصہ لیا۔ اور مندرجہ ذیل قطعات ممتاز شاعر رحمٰن جامی کی نذر کیے۔

قطعہ : (۱)

نہیں اس حقیقت سے انکار جامی
کہ جامِ انا سے ہے سرشار جامی
بصد شوق رحمٰن جامی سے ملیے
لڑکپن سے یاروں کا ہے یار جامی

قطعہ : (۲)

ادب کا پرستار رحمٰن جامی
طبیعت کا خوددار رحمٰن جامی
جھلکتا ہے عکس اس کا جامِ انا میں
قد آور ہے فنکار رحمٰن جامی

"جامِ انا" سے چند اشعار منتخب کرکے میں نے رحمٰن جامی کی عشقیہ شاعری کا مختصر خاکہ ترتیب دیا ہے۔ امید کہ پسند کیا جائے گا۔

— جامی کی خداپرستی کا حال خود اس کی زبانی سنیے۔

تیری چاہت سے ہر اک جذبہ جواں ٹھہرا ہے
ہر نفس میری محبت کی زباں ٹھہرا ہے

عقیدتِ رسول ملاحظہ ہو۔

تیری رحمت علاجِ دردِ دل
تو زمانے کا چارہ ساز بھی ہے

شاعر اپنی اَنا پر نازاں نہیں ہے بلکہ خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے

یہ کیسی سزا میرے خدا مجھ کو ملی ہے
دشمن ہے جو میری وہ اَنا مجھ کو ملی ہے

"جامِ اَنا" سے سرشار شاعر اپنی "اَنا" کے تحفظ کا حوصلہ لئے ہوئے یوں چیلنج کرتا ہے۔

پھول پھینکے کہ مری راہ میں پتھر پھینکے
جس کو جو پھینکنا ہے سوچ سمجھ کر پھینکے

حسرت موہانی اپنے محبوب کو اُس کے حُسن و جمال کا احساس دلاکر نادم ہوئے اور یوں کہا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

جاؔمی نے بھی اپنے محبوب کے آگے ایسی ہی جذباتی غلطی کی۔ اور پیش گوئی کے طور پر کہا۔

حسنِ یکتا جو کہہ دیا میں نے
آپ ہوں گے اور آئینہ ہوگا

دل دینے کے بعد محبوب کے عشق نے جاؔمی کا کیا حال بنا رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وحشتِ دل ہے کہ دیوانہ بنا دیتی ہے
سر پٹکنے کو مگر اب تیری چوکھٹ بھی نہیں

فیض احمد فیؔض نے کہا تھا

وہ تو وہ تم کو بھی ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

جاتی کا محبوب بھی کچھ ایسا ہی لاکھوں میں ایک ہے جس سے وہ مخاطب ہو کر کہتا ہے:

آپ کو جس نے اک نظر دیکھا
وہ فقط دیکھتا رہا ہوگا

امیر خسروؒ عشق کی آخری منزل پر پہنچ کر کہتے ہیں۔

تو من شدم من تو شدی
من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں
من دیگرم تو دیگری

اسی طرح جاتی بھی عشق کے ہاتھوں بالکلیہ محبوب کے حوالے ہو کر کہنے لگتا ہے۔

یہ تڑپ یہ کسک تمہاری ہے
دل کی آواز تک تمہاری ہے
ایک شعلہ ہے زندگی گویا
اس کی ساری لپک تمہاری ہے

کبھی کبھی جاتی اکیلے پن سے اُکتا کر خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے۔

اپنی تنہائیوں سے گھبرا کر
بزم میں اُس حسین کی جایا کر

البیلا عاشق رحمٰن جاتی نازنینوں کے ہجوم میں گھِر کر خود کو مثلِ یوسفؑ سخت آزمائش میں گرفتار پاتا ہے۔ اس کیفیت کو یوسفؑ کے دامن کی خوبصورت تلمیح کے ساتھ شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

زلیخاؤں میں اے رحمٰن جاتی
کسی یوسف کا دامن ہو گیا ہوں

دیدارِ یار عام ہونے کے باوجود اہلِ نظر کی شکایت معنی خیز ہے۔

دیدارِ حُسن عام ہے اس طرح آج کل
اہلِ نظر جو ہیں وہی محتاجِ دید ہیں

کسی کو اپنا بنانے یا کسی کے ہو کر رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اِس آئینہ خانے میں آکر تو دیکھو
ہر سمت عکسِ رُخِ یار ہوں میں

جاؔمی ایک سچے عاشق کے رُوپ میں اپنی وفا پر یوں نازاں ہے۔

فریبِ حُسن اگر ہے ستم شعار تو کیا
وفا کے کشف و کرامات اور بھی کچھ ہیں

مسلسل وفا کی راہ پر گامزن رہتے ہوئے بےخودی میں جھلا کر کہتا ہے۔

حُسن کے ساتھ وفا کیجئے مگر کیوں کیجئے
کیجئے اک یہ بھی خطا کیجئے مگر کیوں کیجئے

پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا ہے۔

یہ تو اپنے ہیں جو غیروں کی طرح ملتے ہیں
خود کو اپنوں سے جُدا کیجئے مگر کیوں کیجئے

غزل جاؔمی کے خیال میں عکسِ جمالِ یار ہے اور دلی جذبات کے اظہار کا وسیلہ جسے وہ اپنی زندگی کا جزِ لاینفک سمجھتا ہے۔

عکسِ جمالِ یار ہے یا چاندنی غزل
جذباتِ دل کا نام ہے یا زندگی غزل

جاؔمی کا عشق اس مقام کو چھُو رہا ہے جہاں ہر سانس محبوب کے نام سے آتی جاتی ہے اور یہی عشق کی معراج ہے۔

اب تو ہر سانس میں ہے تیرا نام
زندگی تیرا نام ہے جیسے

جامی عشاق کے اُس گروہ میں شامل ہو گیا ہے جن پر سعدی علیہ الرحمہ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دِلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

"جامِ انا" کا شاعر اپنے مقام کی خود ہی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

جامی اب اُس مقام پہ پہنچے ہیں دیکھئے
کرنے لگے ہیں آپ ہی اپنا طواف ہم

رحمٰن جامی کی غزل کا ایک اور مقطعہ دکن کی بے مثال اُردو خدمات، زبان و ادب کی شاہانہ سرپرستی، ہندوستانی مشترکہ تہذیب و تمدن کے دلدادہ حیدرآبادی شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی نمائندگی کے لئے کافی ہے۔

رحمٰن جامی کی عشقیہ شاعری کی تان اُس کی دوسری محبوبہ کے والہانہ عشق پر ٹوٹتی ہے اور اس کی یہ دوسری محبوبہ "اُردو" ہے۔

اہلِ دکن ہوں اُردو ہے جامی مری زباں
اب لکھنؤ و دہلی و لاہور مجھ میں ہے

جمیل شیدائی

جامِ انا' ایک جائزہ

رحمٰن جامی صاحب کا شمار اردو کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں اور شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ کامیاب شعراء کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خود کو بہتر ڈھنگ سے پہچانتے ہیں اور اپنی فکر کی ایمان داری سے ترجمانی کرتے ہیں، وہ اپنے وقت کی پکار ہوتے ہیں اور وہ ماضی کی صدائے بازگشت نہیں بنتے۔ یہ ساری باتیں رحمٰن جامی صاحب پر صادق آتی ہیں۔ ان کا اپنا خاص لہجہ ہے جو انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے ان کے یہاں اسلوبِ بیان، لفظیات، فصاحت و بلاغت، وزن و قافیہ صرف ذاتی ادراک اور شخصی بینش کے اظہار کا وسیلہ ہیں اور شعر کی اصل بنیاد ان کا اپنا احساس ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔

بہت کچھ چاہ کر رحمٰن جامی ۔ وہ لکھتا ہوں جو بہتر سوچتا ہوں

سچائی بے پناہ ہے ہر ہر مقام پر ۔ جامی کی شاعری کی یہی تو ہے خاص بات

شعر میں لانے ہے تاثیر تو جامی صاحب دل کے جذبات کو لفظوں میں سمونا ہوگا

اس شعر سے ڈرائی ڈن DRYDEN اور ورڈز ورتھ WORDS WORTH کی کی ہوئی شاعری کی تعریف کی تصدیق ہو جاتی ہے جس کے بارے میں انہوں نے علی الترتیب یہ کہا تھا کہ شاعری جذبے اور تصور کے باہمی اتصال سے پیدا ہوتی ہے اور شاعری حالتِ سکون میں جذبات کی

بازیافت ہے۔ یہ شعر ایک قدم اور آگے بڑھ کر تاثیر کی بات بھی کرتا ہے۔ تاثیر اُسی وقت کی جاسکتی ہے جب جذبے کی شدت کی ترسیل لفظوں کے پیکروں سے پڑھنے والے کے ذہن منتقل کی جائے۔

پھر اِسی ضمن میں وہ آگے کہتے ہیں۔

لفظ اپنی جگہ ہیں پرانے مگر ہم نے کی ہے انہی سے نئی شاعری
دل کا پیغام ہو حسن کے نام ہو تو سمجھ لیجئے ہے وہی شاعری

وہ اِس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا میں حسن کے مقابل اتنی ہی اہم اور طاقت بدصورتی بھی ہے اور آج کی دنیا باہم اپنی تمام تر رعنائیوں کے' ایک صنعتی دنیا بھی ہے جس کے کار شبنم افشانی نہیں کرتے اور نہ ان سے طائرانہ خوش رنگ نکلتے ہیں جن کی سبک اڑانیں فضا کو رنگین بنا کر عاشق و معشوق کے لیے طلسماتی ماحول پیدا کرتیں ہیں بلکہ ان کی چمنیوں سے زہریلا دھواں پھیلتا ہے اور کانوں پر گراں گزرنے والی کرخت آوازیں نکلتی ہیں دھوئیں اور آوازوں کے بیچ انسان کو زندگی گزارنی ہے۔ یہی ایک حقیقت ہے' اِس تلخ حقیقت کے مقابل جامی صاحب شاعری میں ILLUSION کچھ اِس خوبی سے پیدا کرتے ہیں کہ زندگی کی زشت روی حسن وفید سے مبدّل ہو جاتی ہے وہ قدما کی طرح چیزوں کا جائزہ نہیں لیتے بلکہ حسن و جمال کے منعطف کرتے وہ اپنی عصری حسیت کو بھی شامل کرتے جاتے ہیں ان کا کلام ابروؤں کی کمان اور چشمانِ آہو کے تذکرے سے عبارت نہیں ہوتا جیسا کہ بہت سے شاعر ابھی تک ان ہی تذکروں کے جال میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اِن شعراء کا حال اُن مزدوروں کا سا ہے جو کسی بوسیدہ دیوار کی داغ دوزی میں لگے رہیں۔ جامی صاحب کے یہاں ان مزدور شعراء کی طرح دیوار کی مرمت کا کوئی تصور نہیں ہے وہ تعمیر نو کے امکانی جائزے پر اپنی شاعری کی اساس رکھتے ہیں۔ دوسری طرف وہ شعراء ہیں تجدد کے خبط میں تمثیلی شاعری سے ایسے شعری پیکر تراشتے ہیں جن کے مطالب و مفاہیم دور!

ہوتے ہیں۔ اور جو شعر میں ناگزیر قواعد و ضوابط کو پامال کرنا ہی محاسنِ شعری سمجھتے ہیں۔
دوسری اہم بات ان شعرا کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ حسن، سچائی یا زشت روی کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے نہیں کرتے بلکہ اپنی آنکھوں پر وہ عینک چڑھا لیتے ہیں جو انہیں وقتاً فوقتاً ادب میں ہونے والی تحریکیں دیتی رہتی ہیں۔
چناں چہ جامی صاحب کہتے ہیں۔

گم ہوگئی ہے شاعری لفظوں کی بھیڑ میں ۔ مفہوم کس سے پوچھیے طوطوں کی بھیڑ میں

اس صورت حال سے آگاہی کے بعد وہ آگے کہتے ہیں۔

بہتر ہے کوئی راہ بنا کر نکل چلو ۔ بھٹکوگے تا بکے یونہی اندھوں کی بھیڑ میں

شاعر جام انا کے یہاں راہ بنا کر نکل چلنے کا عمل ان کے شعری سفر ہی سے شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔
جام انا کی غزلوں کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قدیم غزل سے جدید غزل کے ارتقائی مرحلوں میں وہ صالح قدریں جو کسی تبدیلی و تغیر کے بغیر غزل کے ساتھ ساتھ رہی ہیں۔ ان کی پاس داری آج کی زندگی کی واقعیت، اظہارِ بیان کی تازگی اور بے ساختگی کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ غزلیں موجودہ نسل کی پریشانیوں، سرگردانیوں اور ہیجانات کے تذکروں سے گراں اور بوجھل نہیں ہوتیں۔

جام انا کی شاعری کو جانچنے کی خاطر میں نے تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ شعر ہیں جو واحد متکلم یا اسی کے ضمائر میں کہے گئے ہیں۔ دوسرے زمرے میں واحد متکلم کے ساتھ صیغہ حاضر کو شامل کیا گیا ہے اور تیسرا زمرہ شعرہائے دیگر کا ہے۔

پہلے زمرے کے شعروں میں واحد متکلم سامعین ہی اپنی طرف شدومد سے متوجہ کرتا ہے۔ اس میں شاعر کا وہ احساس وجود ہے جو ہر تجربے کی زد پر لکا وتنہا ہے۔ وہ اپنی ذات اور شخصیت کے ہر ہنگامہ پہلوؤں پر سے پردے ہٹاتا جاتا ہے یا ان کے بارے میں غور و فکر میں منہمک دکھائی دیتا ہے۔

شخصیت کے العباد ے گانہ کا تعین خود کی پہچان یا شناخت کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کہے گئے شعروں میں علامتی یا ایہامی انداز بیان اختیار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ جو بھی کہنا ہوتا ہے وہ بالراست کہنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کچھ شعر ملاحظہ کیجئے۔

دشتِ تنہائی کا ہم سفر میں ہوں ۔ گویا سورج کے برابر میں ہوں
پتہ چلتا کہ اکثر سوچتا رہتا ہوں میں کیا کیا ۔ مری ہر سوچ کو اب کاش کمپوٹر بنا سکتا
میں وہی پیاس ہوں اک سانس میں دریا کھینچوں ۔ اور بڑھ جاؤں تو دنیائے تمنا کھینچوں
میں اپنے گھر میں ہوں محفوظ کب تک ۔ یہی اک بات اکثر سوچتا ہوں
سارا احوال بند ہے جس میں ۔ میں وہ مکتوب نارسیدہ ہوں
اس سے جب بچھڑا تو یہ احساس ہی غالب رہا ۔ اس کو پانے کے لیے میں نے اسے کھویا بہت

جام انا کی وہ غزلیں جس میں شاعر اپنی ذات کو شعروں کا محور بناتا ہے بڑا لطف دے جاتی ہیں۔ کلیم الدین احمد مطلع سے مقطع تک کے تسلسل کو غزل کا جوہر مانتے تھے چناں چہ جام انا کی وہ غزلیں جس میں شاعر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ایسا تسلسل رکھتی ہیں اور واقعی ایسے تسلسل سے غزل کی مکمل ترسیل بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جام انا کی یہ غزلیں جن کے مطلعے نیچے دیے گئے ہیں کلیم الدین احمد کے بیان کا بیّن ثبوت ہیں۔

تمناؤں کا مسکن ہو گیا ہوں ۔ غموں کا اک گلشن ہو گیا ہوں
پتھراؤ بھی انا کا ہر طرف مجھ میں ہے ۔ اب ٹوٹ ہی نہ جائے جو بلّور مجھ میں ہے
دل بدسلیقہ سے بے زار ہوں میں ۔ مگر پھر بھی اسی کا طرفدار ہوں میں
میں اگرچہ کہ آب دیدہ ہوں ۔ زندگانی تیرا قصیدہ ہوں
احساس کے حدود میں در آگیا ہوں میں ۔ شاید پلٹ کے اپنے ہی گھر آگیا ہوں میں

دوسرے زمرے کے شعروں میں شاعر اور اس کا مخاطب نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

شاعر کا مخاطب یا تو اس کی اپنی محبوبہ ہے۔ یا دنیا ہے یا پھر زندگی ہے۔ ایسے شعر جن میں عشق و محبت
باب میں لطیف اشارے کیے گیے ہیں خالص غزل کے شعر ہیں یہ شعر اپنی تازگی اور نیے انداز بیان
وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

نظر میں رکھ کے مجھے تیری گفتگو سب سے ۔ یہ بے رُخی بھی تری التفات جیسی ہے
جو ہو سکے تو تمہیں آشنا بنا لوں گا ۔ چلو ملو تو سہی مجھ سے اجنبی کی طرح
اس لیے ہم کو ملی بینائی ۔ زندگی بھر ترا رستہ دیکھیں

یہاں وجہ بینائی کو ایک بالکل نئی جہت دی گئی ہے۔ بظاہر انتظار کا موضوع گھسا پٹا اور پامال
اس پہ ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے مگر اس شعر میں جس زاویہ سے انتظار کی کیفیت کو نمایاں
کیا ہے وہ قابل تعریف ہے جاَمی صاحب کا یہی خاص وصف ہے کہ وہ اپنے احساسات و نتایج فکر
پیش کرنے کے لیے جن وسایل کا انتخاب کرتے ہیں ان میں جدت ہوتی ہے اور یہی چیز قدیم و جدید
شاعری میں نمایاں فرق کا سبب بنتی ہے۔ انداز بیان کی ندرت کے حامل کچھ اور شعر ملاحظہ کیجیے۔

میری آنکھوں میں تھی نیند ادھر ۔ تو مگر اس سے بے خبر نکلا
دل کو میرے پتہ نہ چلے تیرے درد کا ۔ کچھ اتنی احتیاط سے زخموں کے بند کھول
تیرے میرے وجود کی ہر بات کھل گئی ۔ میں گم ہوا تو مجھ پہ تری ذات کھل گئی
صبح کا دوپہر کا شب کا تھا ۔ تیرا وعدہ بھی کس غضب کا تھا
تیری ہر بات پہ سر خم کرنا ۔ یہ ہنر ہے تو کیا آتا ہے مجھے
میں جیسے بھول چکا تھا وہ کہانی پھر سے ۔ تیری آنکھوں کی چمک یاد دلاتی ہے مجھے

شعر ہائے دیگر کے زمرے میں دنیا کے تعلق سے شاعر کے محسوسات ہیں۔ ان شعروں کا
انداز نہایت بلند ہے۔ مسرت و انبساط، حزن و ملال اور اسی قسم کے دیگر جذبات کو دنیا کے
منظر میں دیکھا گیا ہے اور بطور خاص زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس زمرے کے شعروں میں

علامتوں کا استعمال بھی ہمیں ملتا ہے
کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہم بھی کچھ کر دکھائیں گے جانی ۔ اس خرابے میں زندگی ہے شرط
کاروبار زندگی میں دیکھتے ہی دیکھتے ۔ مجھکو تنہا کر کے چپکے سے نکل جاتا ہے دل
خرچ ہو جاتا ہے ہاتھوں ہاتھ سکے کی طرح ۔ گرمیٔ بازار بڑھتی ہے تو چل جاتا ہے دل
یوں سایہ دار پیڑ تھا گھر میں ہرا بھرا ۔ تعمیرِ نو کے نام سے کاٹا گیا مجھے
کھوکھلا ہو چکا ہے اندر سے ۔ بھاری بھرکم ہے پیڑ باہر سے
اپنے جنگل میں تو دنیا تھے پرندے سارے ۔ شہر میں آئے تو تنہا تھے پرندے سارے
شب میں سورج کو چمکتا دیکھیں ۔ آداب کے یہی سپنا دیکھیں

اس قسم کے اشعار کی ایک لمبی فہرست ترتیب دی جا سکتی ہے۔
ایک سو اکسٹھ غزلوں پر مشتمل اس شعری مجموعہ کی ادبی اہمیت یوں بھی زیادہ ہے کہ اس کا مطالعہ ہمیں بصارت سے بصیرت کی طرف لے جاتا ہے۔ سرورق نہایت ہی دیدہ زیب ہے اور کتاب کے ٹائیٹل کی جامع تعبیر لگتا ہے۔ اس سلسلے میں سعادت صاحب جو ایک ممتاز آرٹسٹ ہیں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

تمن جاجی

مناجات

اُس کے سینے میں جو ہے سنگ اُسے دل کر دے
اَئے خدا پھر اُسے تو میرے مقابل کر دے

اب تو آسان مِرے واسطے مشکل کر دے
طے محبّت کے ابھی سارے مراحل کر دے

عُمر بھر ساتھ نبھانا ہے مجھے دُنیا کا!
اسلئے غم کو مِرے لُطف کا حامل کر دے

آج تک جس کے نصیبے میں رہی محرومی!
اب اسی شخص کو اِس زیست کا حاصل کر دے

نام لیوا ترا باقی نہ رہے گا کوئی!
ڈوبتی کشتی کو میری لبِ ساحل کر دے

اُس کا دعویٰ ہے مٹا دے گا جہاں سے مجھ کو
اُس کے دعوؤں کو مِرے سامنے باطل کر دے

میں کہ آوارۂ و ناکارۂ دُنیا ہوں مگر
اے خدا بندۂ ناچیز ہوں قابل کر دے

میرے مولا میں ترا بندۂ عاصی ہوں مگر
نیک جو لوگ ہیں ان میں مجھے شامل کر دے

جس کی خاطر میں بھٹکتا رہا دَر دَر جاجی
اب دُعا ہے کہ اسی کو مِری منزل کر دے

وحشی جاجی

نعتیں

(۱)

مرحبا مرحبا حضور مرے ہیں رسول خدا حضور مرے
نور کا آئینہ حضور مرے صورت کبریا حضور مرے
جن کے آنے سے ہیں رحمت عالم سب کے ہیں رہنما حضور مرے
دونوں عالم ہیں آپ کی خاطر مالک دوسرا حضور مرے
گھپ اندھیرے کو جو مٹاتی ہے آپ کی ہے ضیاء حضور مرے
ہر زمانہ ہے آپ کا محتاج آپ خیر الوریٰ حضور مرے
آپ کے پاس ہے جہاں بھر میں ہر مرض کی دوا حضور مرے
نام جس کا ہے جاجی مشہور ہے غلام آپ کا حضور مرے

(۲)

احمد مجتبیٰ حضور مرے سید الاصفیا حضور مرے
آپ کی دید کیلئے کب سے ہے خدا سے دعا حضور مرے
جو مریض آیا آپ کے در پر ہوئی اس کو شفا حضور مرے
آپ کے نقش پا کے صدقے میں میں ہوں حق آشنا حضور مرے
میں نے پہچانا آپ سے اسکو ہے جو میرا خدا حضور مرے
بے سہاروں کا ساری دنیا میں آپ ہیں آسرا حضور مرے
پا کے جنت میں جائیگا جاجی آپ کا راستہ حضور مرے

رحمن جامی

غزل

جو لوگ راہِ وفا میں ہمارے ساتھ ہوئے
ہمیں لگا کہ وہ سب صورتِ حیات ہوئے

دماغ و دل میں کوئی فیصلہ نہ ہو پایا
ہمارے ان کے کئی دن مذاکرات ہوئے

کوئی بھی حادثہ ہم پر کبھی نہیں گزرا
ہمارے دم سے زمانے میں حادثات ہوئے

یہ بات اور ہے ہوتی ہے گفتگو تم سے
زمانہ بیت گیا تم سے دل کی بات ہوئے

شکست کھا کے مرا دل نہیں رہا وہ دل
اُسے زمانہ ہوا زیرِ خواہشات ہوئے

تمہارے وعدے جو ہیں آج بھی اُدھورے سے
ہمارے واسطے وہ حاصلِ حیات ہوئے

اسی کی طرح کسک اب بھی اُٹھتی رہتی ہے
زمانہ بیت گیا گرچہ دل کو مات ہوئے

خیال و تجربے آج نذر کے جب کبھی جامی
جو شعر ہم نے کہے حسنِ کائنات ہوئے

رُباعیات

رحمٰن جامی

●

حالات بھی کہنے کیلئے ہوتے ہیں
جذبات بھی بہنے کیلئے ہوتے ہیں
ہر بات میں رہتی ہے بڑی گنجائش
عادات بھی سہنے کیلئے ہوتے ہیں

●

تدبیر تو ہم لوگ بہت کرتے ہیں
تشہیر تو ہم لوگ بہت کرتے ہیں
اے کاش کہ تعمیر بھی ہوتی ہم سے
تقریر تو ہم لوگ بہت کرتے ہیں

●

اخبار میں حالات پڑھا کرتے ہو
حالات تو دن رات پڑھا کرتے ہو
ماحول کا اندازہ بھی کرلو لوگو
پڑھنے کو تو ہر بات پڑھا کرتے ہو

●

مخلوق کو ممتاز بنا دیتے ہیں
ممتاز کو بھی راز بنا دیتے ہیں
ہم لوگ بھی ہیں ماہرِ فن کچھ ایسے
سناٹے کو آواز بنا دیتے ہیں

●

رحمٰن جامی

دوہے

ـ لوگ سبھی تھے باورے، لوگوں کا کیا دوش
تم سے پریتم آس تھی، تم ہی تھے خاموش

● ڈرے ڈرے جب تک رہے، رہے بڑے کمزور
ساتھ ترا جو ہو گیا، دل بھی ہوا کٹھور

● نربل نربل ہی سبھی، اس میں بھی ہے زور
گلے لگے پھانسی پڑے، دھاگے کی اک ڈور

ـ تو ہے میرے ساتھ تو، جیون ہے بھونچال
اس کو ٹھوکر مار دوں، دنیا ہے نٹ بال

● اردو کا کیا پوچھنا، اس کے میٹھے بول
تو بھی اردو بول کر، کانوں میں رس گھول

● لفظ لفظ اس کا حسیں، حرف حرف انمول
جامی اردو بول کر، ہیرے موتی رول

ـ میری آنکھوں میں ترا، اک سندر آکار
آنکھ کھلی تو لٹ گیا، سپنوں کا سنسار

● نیک بڑی ہے آپ میں، فارح عورت ذلت
[illegible] کھاتی ہے مات

● جاہل کے بیچ [illegible] کرے زندگی بات
گدھ کے نخرے [illegible] رات

رحمن جامی

(سانیٹ)

گویائی

کتابِ حُسن کے ہر باب سے میں گزرا تھا
تمہارے چہرے کی تحریر پڑھ چکا تھا میں
تمہارے دل کی ہر اک بات جانتا تھا میں
تمہاری آنکھوں کا پیغام مجھ کو پہنچا تھا
مگر زباں سے کبھی آج تک نہ تم نے کہا
جو تم نے کچھ نہ کہا آج اس کی قیمت ہے
قریب و دور وہی آج تک بھی عزت ہے
جو میں نے تم سے کہا سب خموش تم نے سنا

۰

اور اب یہ سوچ رہا ہوں کہ تم نے ٹھیک کیا
ہر ایک بات کہی پر زباں سے کچھ نہ کہا
مجھے ہی جرأتِ اظہار نے کیا رسوا
تمہاری خامشی لیکن تمہارے کام آئی
مری ہی جنبشِ لب سے ہوئی ہے رسوائی
ہوئی ہے باعثِ رسوائی میری گویائی

ترائیلے

رحمٰن جامی

ہندوستان میں اُردو

یہاں سے ہے وہاں تک قصرِ اُردو
مگر اب اس کو ڈھایا جا رہا ہے
حقیقت رو رہی ہے خوں کے آنسو
یہاں سے ہے وہاں تک قصرِ اُردو
ابھی اُترا نہیں ہے اُس کا جادو
نیا فتنہ جگایا جا رہا ہے
یہاں سے ہے وہاں تک قصرِ اُردو
مگر اب اس کو ڈھایا جا رہا ہے

TOM - A - HAWK

مرے ہاتھوں میں کلہاڑی نہیں ہے
مجھے یہ سارا جنگل کاٹنا ہے
گھنا جنگل ہے یہ جھاڑی نہیں ہے
مرے ہاتھوں میں کلہاڑی نہیں ہے
سفر کرنا ہے جلد گاڑی نہیں ہے
حنظلہ ہے اسے کل سنانا ہے
مرے ہاتھوں میں کلہاڑی نہیں ہے
مجھے یہ سارا جنگل کاٹنا ہے

وطن جامی

ہائیکو

(لانگ سیلیبل)

پیار

بھٹک رہا ہے آدمی ابھی
جہاں کے کام چل رہے ہیں آج بھی مگر
یہاں ہے پیار کی کمی ابھی

آگہی

ہے مختصر یہ زندگی سنو
حقیقتاً یہی تو ہے وہ آگہی سنو
کہ دل کی بھی کبھی کبھی سنو

وطن کی یاد

نظر نظر کی بات ہے میاں
وطن کی یاد بھی چمکتی رات ہے میاں
اُجالا اک حیات ہے میاں

ہائیکو

رحمٰن جامی

(شارٹ سلیبل)

محنت

ئے جامی صاحب
نت کرنے والے کو
ہمدم چاہے سب

ناگزیر

مزدوری کر یار
مزدوروں کے دم سے ہی
چلتا ہے سنسار

ناداں

جامی میرا نام
اُس کو اب کیا بتلاؤں
شہرت کا انجام

شاداب

جون ۹۴ء

بہتر (۷۲) ماتراؤں پر مشتمل ایک نئی صنف

رحمٰن جامی

جامی مجھ کو راس ہے
خوشبو کا احساس ہے، اُردو کا احساس
اُردو کے گلزار میں، ہے پھولوں کی باس
جینے کی ہے آس

ہر لمحہ تنہا رہے
گھڑی گھڑی گھنٹہ بجے، گھنٹے کا کیا دوش
وہ آکر بھی جاچکا، اب آیا ہے ہوش
خالی ہے آغوش

آپ وہاں ہیں اجنبی
لوگ یہاں ہیں اجنبی، کس سے کیجے بات
دن تو دن تھا کٹ گیا، کیسے کاٹوں رات
ڈستے ہیں لمحات

بن کر خود ہی ناخدا
دھکا دیں اس کو ذرا، ذرا لگائیں زور
گاڑی ہے یہ زندگی، چلے فیج کی اور
ہندے اس کی ڈور

دل اپنا لگتا نہیں
آؤ مل بیٹھیں کہیں، کرلیں دل کی بات
پھر جانے کب ہو ملن، کب ہو ایسی رات
جانے کب ہو سات

رحمٰن جامی

مذاکرہ مرکزِ ادب

رحمٰن جامی حیدرآباد کے ان صاحب فکر و دانش اہلِ قلم میں سے ایک ہیں جن کی شاعرانہ عظمت و شہرت تمام اردو دنیا میں توقیر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ رحمٰن جامی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے لب و لہجہ میں کلاسیکی ادب کی اعلیٰ خوبیوں کے ساتھ ساتھ ترقی پسند بلند بامی اور عصری آگہی کی روشن خیالی نمایاں ہے۔ رحمٰن جامی ایک کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر ہیں۔ خود اعتمادی ان کی شاعری کا وصف ہے جس نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو باوقار بنا دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار صدر ادبی اجلاس مشاورہ ڈاکٹر مصلح احمد جلیلی نے مرکز ادب کے زیرِ اہتمام ۱۲۔ مئی کو بمقام مکتبہ شاداب بیڈ پاہز منعقدہ ایک ادبی اجلاس و مشاعرہ میں کیا۔ رحمٰن جامی فن اور شخصیت کے زیرِ عنوان اس خصوصی اجلاس کے مہمانانِ خصوصی مسرز صلاح الدین نیر، غنی نعیم لکچرر انوار العلوم کالج اور صدر عصری ادب صادق نوید تھے۔ ابتدا میں جناب قمرالدین صابری نائب صدر نے خیر مقدمی تقریر کی اور ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی۔ اور جناب مومن خاں شوق معتمد عمومی نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ اس اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے جناب غنی نعیم نے اپنے پرمغز مقالہ رحمٰن جامی فن اور شخصیت میں کہا کہ رحمٰن جامی کی شاعری جو ان کے اپنے ہم عصروں میں منفرد و ممتاز بناتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم جدید کی اصطلاحات میں نہیں سمجھتا ہے بلکہ ماضی کی کلاسیکی اقدار سے اپنا فکری

رشتہ مضبوطی کے ساتھ استوار رکھے ہوئے ہے حال میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ رحمٰن جامی ایک ممتاز شاعر ہیں، اس کی شاعری نے جغرافیائی حدیں توڑ دی ہیں۔ رحمٰن جامی اس حقیقت سے سے ہے کہ فن شعر تنقید حیات ہی نہیں بلکہ معمار زندگی ہے۔ جناب صلاح الدین نیر نے اپنے مضمون کھرا انسان سچا دوست۔ بہترین شاعر میں کہا کہ جامی ایک کھلے دل دماغ کے مالک ہیں۔ وعدہ کے پابند ماحول کے پاسدار روابط کے استحکام اور [illegible] شناس ہونے کے ساتھ ایک جذباتی انسان بھی ہیں۔ شعری ادب میں جدت طرازی کے ساتھ ساتھ نئے تجربات کر رہنے کے عادی ہیں۔ بنیادی طور پر ایک ایسے شاعر ہیں جو کلاسیکی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ ا کی شاعری میں جیتی جاگتی چلتی پھرتی ہماری تمام [illegible] ملتی ہیں جو حیات جاویداں کی طرح فرحت افزا ہیں۔ رحمٰن جامی کو ہر صنف سخن میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔ جناب صادق نے اپنے طویل مضمون "دکن کا البیلا شاعر" رحمٰن جامی۔ میں کہا کہ جامی بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہے۔ تاہم بہترین غزل گو بھی ہے۔ جامی نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ جناب رحمٰن جامی کی نعتوں کا کیسٹ مقبول ہو چکا ہے۔ رحمٰن جامی پر خلوص دوست ہے۔ حق گوئی اور بے باکی اس کی پہچان ہے۔ گفتار اور کردار کا غازی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی رحمٰن جامی کا کلام قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جامی کی ہشت پہلو ادبی شخصیت میں شاعر فلمی گیت نگار۔ کہانی کار۔ افسانہ نگار۔ تبصرہ نگار۔ اور جادو بیاں مقرر شامل ہے۔ ادبی اجلاس کے فوری بعد غیر طرحی مشاعرہ ہوا۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے مسز رئیس اختر اور رحمٰن جامی نے شرکت کی صدر مشاعرہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے علاوہ صلاح الدین نیر، رئیس اختر، رحمٰن جامی، منظور احمد منظور، صادق نوید۔ نیپال سنگھ وفا۔ عزیز بھارتی، حسن فرخ، لطیف خان شوق، اثر غوری، قمر الدین صابری۔ قدیر انصاری۔ ڈاکٹر سید حسن، نسیم اعجاز نسیم انا، شاہد بجنوری۔ سلام شاہین (کرنول)، جلال شاہ جلال اور علی ہاشمی نے کلام سنایا۔ یہ کامیاب ادبی محفل و مشاعرہ جناب عزیز بھارتی کے شکریہ پر بہ اختتام کو پہنچی۔

ٹر سیّد حسن

رحمٰن جامی کے ساتھ ایک شام

یہ رنگیں شام یہ محفل نہ اس جا کوئی خامی ہے
ہیں خوشیوں سے بھرے دل اور خمارِ شادکامی ہے

وہ شاعر ہوں کہ سامع ہیں انا کے جام ہونٹوں پر
یہی تو خاص لطفِ صحبتِ رحمٰن جامی ہے

سخن میں نعت لکھی نظم لکھی اور رباعی بھی
کہ ہائیکو اور سانیٹ نے بھی کی اُن کی غلامی ہے

چمکتا ہے کمالِ فکر و فن اشعار میں اُن کے
کہ ہر مصرع میں ان کے زورِ تانشہ دوامی ہے

حسنؔ تو مختصر کر دے بیانِ ناتمام اس پر
جو سچے شعر کہتے ہیں خُدا بھی اُن کا حامی ہے

اُردو اکیڈیمی کی جانب سے

مالی اعانت

شاعری میں جہاندار افسر اور ڈاکٹر غیاث صدیقی، افسانوں میں صغرا حسین اور عاتق شاہ
طنز و مزاح میں پاگل عادل آبادی شامل

اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے ریاست کے (۵۶) مصنفین کے مسودات کو اشاعت کے لیے مالی اعانت منظور کی ہے اُردو اکیڈمی نے شاعری کے (۲۶) فکشن کے (۱۰) تنقید و تحقیق کے (۶) طنز و مزاح کے (۵) بچوں کا ادب کے (۲) سائنسی و سماجی علوم کے (۱) اور متفرق (۶) مسودات کو جاریہ سال کے دوران مالی اعانت کا فیصلہ کیا ہے منظورہ مسودات کی فہرست درج ذیل ہے۔

شاعری

۱۔	مجموعۂ کلام	ناصر کرنولی
۲۔	مجھے صدا دے۔	مصحف اقبال توصیفی
۳۔	اشکوں کے پھول	رئیس اختر
۴۔	اشہب جذبات	خورشید جنیدی
۵۔	خد و خال	صادق نوید
۶۔	ایک بات اور	فاطمہ تاج
۷۔	دیدہ تر	نان منظور
۸۔	سلسلہ۔	سویتا کرن

۹۔ کھلی آنکھوں کے خواب	جہاندار افسر
۱۰۔ نقوشِ حیات	ریاست علی تاج
۱۱۔ کہکشاں	سردار الہام
۱۲۔ صدف سمندر آئینہ	محسن جلگانوی
۱۳۔ نقش ناتمام	وحید مرزا
۱۴۔ سمندر نادمیں	غیاث صدیقی
۱۵۔ متاعِ سخن	سلیم عابدی
۱۶۔ پتھر پتھر لاوا	غلام خواجہ معین ا
۱۷۔ لفظوں کا اجالا	مسعود عابد
۱۸۔ گونگی دعا	یوسف یکتا
۱۹۔ کوہ نور	ضیاء جیل پوری
۲۰۔ نشاط دل	یحییٰ اجمیل
۲۱۔ غزل کی سرحدیں	پی وی دھمیجہ
۲۲۔ ارض بے پیمبر	منظر مہدی
۲۳۔ دکھ کا سمندر سکھوں کا جزیرہ	شاغل ادیب
۲۴۔ پرواز تخیل	محمود شریف محمود
۲۵۔ زخم زخم زندگی	عبدالکریم
۲۶۔ گھر گھر دھواں دھواں	محمد مجیب اللہ صدیقی

فکشن

۱۔ پستی کے مکیں	عارف مجاہد

۲۔ افسانوں کا مجموعہ — فریدہ زین
۳۔ نایاب — افروز سعیدہ
۴۔ آخری داستان گو — مظہر الزماں خاں
۵۔ پھر توری یاد آئی — انجم منظور
۶۔ الو اور کنول — صفدر حسین
۷۔ ریت کی دیوار — ضامن علی حسرت
۸۔ ریزہ ریزہ چاندنی — محمد انیس فاروقی
۹۔ میں چیخوں گا — عاتق شاہ
۱۰۔ بولتے رنگ — ملک فیاض

تنقید و تحقیق

۱۔ بین السطور — رحمت یوسف زئی
۲۔ مہک اور مہک — سیدہ جعفر
۳۔ تحقیق تنقید اور صحافت — محمد انور الدین
۴۔ آئینہ گفتار — محمد کلیم الحق قریشی
۵۔ حیدرآباد اسے فقر ماضی کے عنوان — سید داود اشرف
۶۔ دکنی کی شاعری اصناف اور دوسرے مضامین — حبیب نثار

طنز و مزاح

۱۔ بے کار کی باتیں۔ — میر فارق علی
۲۔ اعمال نامہ — ممتاز مہدی
۳۔ رہنما و رہبر — برہان حسین
۴۔ بسم اللہ کے لڈو — قیسی قمر نگری
۵۔ اوٹ پٹانگ — پاگل عادل آبادی

بچوں کا ادب

۱۔ سب رنگ — زبیدہ رضا
۲۔ آب حیات۔ تذکرہ شعراء — صغرا ماہر

سائنسی و سماجی علوم

۱۔ روبوٹ کی دنیا — جنید احمد

مکتبۂ شاداب میں کتب برائے فروخت

نمبر	کتاب (مصنف)	قیمت
۱	مواعظِ ہادی (سید محی الدین قادری ہادی)	15=00
۲	صوت ہادی (" ")	20=00
۳	مختصر تاریخ ادب عربی (" ")	10=00
۴	مختصر احوال علماء و اولیائے حیدرآباد (" ")	25=00
۵	تذکرۂ اجداد ہادی (" ")	35=00
۶	چشمِ معتبر (عزیز بھارتی)	30=00
۷	یہ کیسا رشتہ ہے (صلاح الدین نیرؔ)	50=00
۸	سلسلہ پھولوں کا (" ")	30=00
۹	قافلہ چلتا رہے گا (" ")	30=00
۱	پھر وہی پرچھائیاں (" ")	25=00
۱	خوشبو کا سفر (" ")	16=00
۱۱	شکن در شکن (" ")	12=00
۱۲	عظمت خیاباں (" ")	40=00
۱۴	حیدرآباد کے علمی اور ادبی ادارے (شفیع قادری)	20=00
۱۱	تعارف (" ")	12=00
	لب کے برس (فاطمہ تاج)	20=00
۱	[illegible] (" ")	25=00
۱	امانت (" ")	40=00

۱۹	دلاسا (" ")	30=00
	مولانا عبدالماجد دریابادی (حیات وخدمات) ڈاکٹر عتیق الرحمن عثمانی	60=00
۲۱	خیال پارہ (رشید الدین)	15=00
۲۲	آب دیدہ (راشد آزر)	10=00
۲۳	جمع و خرچ وفا (" ")	16=00
۲۴	منزلِ شوق (" ")	25=00
۲۵	خاکِ انا (" ")	10=00
۲۶	پہچان (کویتا کرن)	15=00
۲۷	سوغات (" ")	30=00
۲۸	حیدرآباد میں افسانہ نگاری (انیس قیوم فیاض)	8=00
۲۹	شجرِ صدا (سریندر شجر)	40=00
۳۰	شعلۂ مینا (متین سروش)	15=00
۳۱	جمالیات (بدرالحسن بدر جمالی)	60=00
۳۲	ضربِ آگہی (محمد آفاق صدیقی)	48=00
۳۳	رات کے ہزار ہاتھ (علی ظہیر)	15=00
۳۴	برگِ روانِ وادی (ایم اے وحید)	18=00
۳۵	زخمِ آگہی (محمد اعظم اثر)	10=00
۳۶	دیوانِ مسعود (محمد مسعود صدیقی مسعود)	30=00
۳۷	بہارِ غزل (اقبال حسین اقبال)	8=00
۳۸	گھر کی دیوار (انیس قیوم فیاض)	8=00

۳۹۔	کیف و سرور	(غلام محی الدین خان کیف)	15=00
۴۰۔	شہ لب	(رؤف خیر)	40=00
۴۱۔	سونے چاندی کے بت	(خواجہ احمد عباس)	45=00
۴۲۔	چار شہر ایک کہانی	(وحید انور)	20=00
۴۳۔	ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات	(محمد عبدالرزاق فاروقی)	30=00
۴۴۔	نذرِ رزاق فاروقی	(” ”)	75=00
۴۵۔	مشورے	(” ”)	50=00
۴۶۔	ہارا ہوا پرندہ	(مظہر الزماں خاں)	10=00
۴۷۔	آخری زمین	(” ”)	30=00
۴۸۔	تصویرِ حیات	(د۔ بشیر امجد)	50=00
۴۹۔	کنواں آدمی اور سمندر	(عوض سعید)	50=00
۵۰۔	دین و دنیا (دوم)	(امیر چند بہار)	20=00
۵۱۔	سازِ مغرب (چہارم تا دہم)	(حسن الدین احمد)	20=00
۵۲۔	مفہوم القرآن (پارہ ۲ تا ۹)	(” ”)	4=00
۵۳۔	محفل	(حسن الدین احمد)	20=00
۵۴۔	زبان زد اشعار	(” ”)	20=00
۵۵۔	قرآن فہمی (آسان راستہ)	(” ”)	15=00
۵۶۔	انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	(” ”)	50=00
۵۷۔	وہ دین جس کی تعبیر قرآن کرتا ہے	(ڈاکٹر سید عبداللطیف)	50=00
۵۸۔	سازِ مشرق (اول)	(حسن الدین احمد)	20=00
۵۹۔	” ” (دوم)	(” ”)	20=00

۶۰۔	ملت اسلامیہ کی تاریخ اول	(میر محمود علی قیصر)	25=00
۶۱۔	" " (دوم)	(" ")	25=00
۶۲۔	سکندرآباد کی ادبی دستاویز	(محسن جلگانوی)	50=00
۶۳۔	رقصِ مرگ	(سلطان نقشبندی)	10=00
۶۴۔	انسان سائنس اور ماحول	(محمد یوسف مرکی)	60=00
۶۵۔	فرہنگ غلط العلوم	(ادیب حیدرآبادی)	25=00
۶۶۔	گاندھی جی کے اقوال	(" ")	14=00
۶۷۔	تاثرات (منظوم پیشکش)	(سعادت نظیر)	20=00
۶۸۔	پھول ہی پھول	(" ")	15=00
۶۹۔	آب و رنگ	(" ")	15=00
۷۰۔	تعلیمی مسائل	(محمد اسحاق)	50=00
۷۱۔	تلاشِ نارسا	(شفیع اقبال)	30=00
۷۲۔	وابستگی	(حلیم بابر)	35=00
۷۳۔	نشاطِ آرزو	(مومن خان شوق)	40=00
۷۴۔	میں کہتا سنتا ہوں	(حاتم شاہ)	35=00
۷۵۔	تحقیقی نقوش	(ڈاکٹر محمد علی اثر)	75=00
۷۶۔	کلیاتِ ایمان	(" " ")	40=00
۷۷۔	مدحِ ساقی کوثر	(محسن خیالی [illegible])	10=00
۷۸۔	چمک اٹھی لفظوں کی چھاگل	(وزیر آغا)	300=00
۷۹۔	مسلک باقیات	(ظہیر احمد [illegible])	10=00

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

جولائی : ۱۹۹۴ء

جلد : (۱۱) شمارہ : (۷)

قیمت : ۶ روپے

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	" ۲۰۰ "	" ۳۶۰ "	" ۳۲۰۰ "
امریکہ	" ۴۰ ڈالر	" ۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	" ۲۵ پونڈ	" ۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	" ۱۷۵ پاکستانی روپے	" ۳۰۰ روپے	" ۲۰۰۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز۔ حیدرآباد۔۱

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے "پبلک پرنٹرس" تربانال میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

محمد قمر الدین صابری
ایڈیٹر "شاداب"

گذارش

مغرب کے ایک فرد فرید (سابق لیوپولڈ ایس) محمد اسد جن دنوں مغرب کی مصنوعی اور بے کیف زندگی سے گھبرا کر تلاش حقیقت میں سرگرداں اور اسلامی تعلیمات کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ اور مختلف اسلامی ملکوں میں جاکر مسلمانوں کی زندگی کے شب و روز، ان کے آپسی میل جول، نماز کے رکوع و سجود کا منظر اور دیگر بہت سی محبانہ و برادرانہ خصوصیات و صفات کو دیکھ کر مائل بہ اسلام ہو رہے تھے انہی دنوں کی بات ہے کہ انہوں نے ٹرین کے ایک سفر میں جرمنی کے مرفہ الحال طبقہ اور کامیاب تاجروں اور خوش باش اور تندرست آدمیوں کی ایک جماعت دیکھی۔ جن کی وضع قطع اور ساز و سامان، خوش حالی اور معاشی بلندی کا پتہ دے رہے تھے لیکن ان کے مغموم اور اُداس چہرے، ان کی پھیکی اور بناوٹی مسکراہٹ اس کا پتہ دیتی تھی کہ ان کو اندر سے کوئی غم کھائے جا رہا ہے اور وہ کسی ایسے روحانی کرب میں مبتلا ہیں جس کا ان کی تجارتی ترقی، سامانِ عشرت کی فراہمی اور مال و زر کی زیادتی کے پاس بھی کوئی علاج نہیں۔

یہی سوچتے وہ اپنے گھر پہنچے اور قرآن مجید کو بلا ارادہ کہیں سے کھول کر پڑھنے لگے۔ اور انہیں اس مسئلہ کا ایسا واضح اور قطعی جواب ملا کہ ان کے سارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے۔ اپنی کتاب "روڈ ٹو مکہ" میں وہ لکھتے ہیں

"میں ایک لمحہ کے لئے گم سم سا ہو گیا۔ پھر میں نے اپنی بیوی سے کہا' دیکھو! کیا یہ اس کا جواب نہیں ہے جو رات ہم نے ٹرین پر دیکھا تھا۔ اب میں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ یہ کتاب خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہے۔ وہ اگرچہ آج سے تیرہ سو برس پہلے اک انسان کو عطا کی گئی تھی لیکن اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایک ایسی چیز کی پیشن گوئی تھی جو ہمارے اس پیچیدہ اور مشینی دور سے زیادہ واضح طور پر کسی اور دور میں سامنے نہ آئی تھی۔ " تکاثر " یعنی مال و دولت کی حرص و ہوس اور مسابقت تاریخ کے ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے لیکن اتنی کبھی نہیں کہ وہ محض اشیاء کو جمع کرنے کا شوق بن جائے اور ایک ایسا کھلونا اور بہلاوا بن جائے جو کسی اور حقیقت کی طرف دیکھنے ہی نہ دیتا ہو' دولت اور اقتدار کا حصول اور اس کا روز افزوں عشق جس کا کوئی علاج نہیں۔ کل سے زیادہ آج اور آج سے زیادہ کل۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں۔ یہ انسان لاکھ سمجھدار' حکیم اور دانا سہی' پھر بھی وہ اس عذاب کی پیشن گوئی نہیں کر سکتا تھا جو بیسویں صدی کی خصوصیت ہے۔"

محمد اسد نے اُس سفر سے واپس گھر آکر سورۂ تکاثر پڑھا تھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۝

(تکاثر نے تمہیں غافل کر رکھا ہے)

اَلْھٰکُمْ۔ لَھْو سے ہے۔ ' غفلت ' یہ لفظ ہر اس شغل کے لئے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں مشغول ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ " تکاثر " کثرت سے ہے۔ اس کے تین معنی ہیں۔

...یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ
...کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک
... کے مقابلہ میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انھوں دوسرے سے زیادہ کثرت حاصل
...ے۔ تکاثر میں دنیا کے تمام نوادر و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذت اور وسائل قوت
...تدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و کوشش کرنا، اس میں ایک دوسرے
...بڑھنے کی کوشش کرنا اور ان کی کثرت پر فخر کرنا شامل ہے۔ اَلْھٰکُم کے مفہوم میں بھی
...ی وسعت ہے۔ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُر کے معنٰی یہ ہوئے کہ اس تکاثر کی دھن
...ہر اس چیز سے غافل کر دیا جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے۔
...قبت سے غافل ہو گئے، اخلاقی حدود، اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے۔ انھیں
...ادہ سے زیادہ توجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے۔ ایک دوسرے سے
...نے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے۔ انھیں اس بات کی فکر نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی
...ین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا ساز و سامان ہے۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۞

(یہاں تک کہ تم قبروں تک پہنچ جاتے ہو)

...عنی تم اپنی ساری عمر اسی کوشش میں کھپا دیتے ہو اور مرتے دم تک یہ فکر تمھارا پیچھا
...یں چھوڑتی۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۞ ہرگز نہیں، تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا)
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۞ (پھر سن لو کہ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا)

...نی تمھیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دنیا کی یہ کثرت اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا
...رقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ اس تاکید کو دہرا کر

جان لوگے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝

(ہرگز نہیں، اگر تم یقینی طور پر جان لیتے)

یقین، حق اور سچائی قطعی ہے مگر اس کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ علم الیقین وہ ہے جو انسان اپنے غور و فکر سے نتائج اخذ کرکے فیصلہ کرتا ہے اور فن کا علم حاصل کرتا ہے۔ دوسرا درجہ عین الیقین وہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مزید مطمئن ہوجاتا ہے۔ تیسرا درجہ حق الیقین وہ ہے جو علم الیقین اور عین الیقین کے بعد کے درجے میں ہی حق کو پاتا ہے جو قطعی اور ناقابل تبدیل ہوتا ہے اس میں نہ عقلی دلیل و توجیہہ کی غلطی کا امکان ہے، نہ نظر کے دھوکے کا شائبہ ممکن ہے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یقین کے بالکل ابتدائی درجے علم الیقین میں بھی اگر اس روش کے انجام کو جان لیتے تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝

(تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لوگے)

شروع میں بتادیا گیا کہ "تکاثر" نے تمہیں اللہ سے غافل کردیا، اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے سے غافل کردیا۔ ذرا غور و فکر کرتے تو "علم الیقین" حاصل کر لیتے، اور غفلت سے باز آتے مگر عمر بھر غفلت میں رہے حتّٰی کہ موت آگئی۔ اس وقت جہنم بتادی جائے گی اور سر کی ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر "عین الیقین" حاصل کرلوگے مگر اس وقت کچھ تلافی نہ ہو سکے گی اور غفلت کو دور کرکے سیدھا راستہ اختیار کرنے کا موقعہ جاتا رہے گا۔

ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

(پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا)

تکاثر نے غفلت میں مبتلا رکھا اور غور و فکر کر کے علم الیقین حاصل نہ کیا۔ پوری عمر رائیگاں گئی تو موت کے بعد جہنم کو آنکھوں سے دکھا کر "عین الیقین" دلا دیا جائے گا۔ اور "پھر" اُس روز یعنی حشر کے روز نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ خدا کی نعمتیں لامحدود ہیں۔ ان میں سے بے حد و حساب نعمتیں تو وہ ہیں جو انسان کو اس کے اپنے کسب کے ذریعہ سے ہی جاتی ہیں۔ انسان کے کسب سے حاصل ہونے والی نعمتوں کے متعلق اس کو جواب دہی کرنی پڑے گی کہ اس نے ان کو کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں اُسے حساب دینا ہوگا کہ اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا اور مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے متعلق اس کو بتانا پڑے گا۔ کہ آیا اس نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ یہ نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور ان پر دل، زبان اور عمل سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا؟ یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے اتفاقاً مل گیا تھا۔ اور یا یہ خیال کیا تھا کہ بہت سے خدا اُن کے عطا کرنے والے ہیں؟ یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے اتفاقاً مل گیا تھا اور یا یہ خیال تھا کہ بہت سے خدا ان کے عطا کرنے والے ہیں؟ یا یہ عقیدہ رکھا تھا کہ یہ ہیں تو خدا ہی کی نعمتیں مگر ان کے عطا کرنے میں بہت سی دوسری ہستیوں کا بھی دخل ہے اور اس بناء پر انہیں معبود ٹھیرا لیا تھا اور انہی کے شکریے ادا کیے تھے۔

سورہ مریم (۱۹) کے رکوع (۵) میں ذکر ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو زندہ اُٹھایا جائے گا اور جہنم سے گذارا جائے گا۔ ایمان والے اس سے گذر جائیں گے اور کافر وہیں رہ جائیں گے۔ گویا جہنم کے "عین الیقین" کے ذریعہ غور و فکر کر کے سیدھا راستہ اختیار کرنے کا موقعہ باقی نہ رہے گا۔ قبروں تک پہنچنے سے پہلے اِس دُنیا کی زندگی میں اس کا موقعہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل عطا کی ہے۔ غور و فکر کر کے نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے اور "علم الیقین" کی مدد سے "تکاثر" کی غفلت سے چھٹکارا حاصل

کرنا چاہئیے ۔ ورنہ یہ غفلت ہمیں برباد کر دے گی ۔ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بے مثال نعمت ہے ۔ غور و فکر کرنے اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت سے کام لے کر "علم الیقین" حاصل کرنا اور "تکاثر" کی غفلت سے چھٹکارہ حاصل کر کے "صراط مستقیم" اختیار کرنے میں ہماری بھلائی اور بہتری ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرنے سے پہلے انسان کو "صراط مستقیم" کی ہدایت عطا فرما دے ۔ آمین ۔ ●●

سلسلہ ص ۱۴

کر سکتے ہیں جنہوں نے بنگلور سے آکر ۱۲ اپریل اتوار کی شام میں مدینہ ہال میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا اور اس کی نہایت عمدہ کاروائی چلا کر دوستی کا حق ادا کر دیا ۔ اس جلسہ میں دلی سے خاص طور پر ابوالفیض سحرؔ ، جی ڈی چندن اور فدا علی فوٹو گرافر نے شرکت کی ۔

بہترین مضمون لکھنے کا فریضہ احمد جلیس کو سونپ کر میں وقار خلیل کے کے یہ دو شعر جسے میں نے محمود انصاری پر لکھی گئی ان کی نظم سے لئے ہیں ، اپنا مضمون ختم کرتا ہوں ۔

حقیقت تھا ، فسانہ ہو گیا ہے ● دکن سے دور تھک کر سو گیا ہے
صحیفہ اس کا تابندہ رہے گا ● قلم نے جو لکھا ، زندہ رہے گا

رشید الدین
سنتوش نگر کالونی۔ جہدی پٹنم
حیدرآباد

محمود انصاری مرحوم

۵ اپریل ۱۹۹۴ء کو محمود انصاری اڈیٹر روزنامہ "منصف" حیدرآباد کا ریاض سعودی عرب میں رات دیر گئے کنگ فہد ہاسپٹل میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۵۴ سال تھی اور یہ عمر مرنے کی نہیں تھی۔ لیکن گذشتہ چھ سال سے وہ بلڈ کینسر میں مبتلا تھے۔ اور موت کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ انھوں نے کبھی کوئی پرہیز نہیں کیا اور اپنے دوست و احباب اور ملنے والوں کو جن کا ایک وسیع حلقہ تھا، کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ دن بدن موت کی طرف بڑھ رہے ہیں یا موت ان کی طرف آرہی ہے۔ دفتر "منصف" میں ان کی ذہنی زندہ دلی، بذلہ سنجی، شگفتگی اور کام کی رفتار ان کے ۱۳ ر جنوری کو ریاض جانے تک قائم رہی۔

وہ ہر چار چھ مہینہ میں چند دن کے لئے ریاض جاتے اور کنگ فہد ہاسپٹل میں خون تبدیل کرکے آتے۔ آنے کے بعد وہ پھر اسی طرح ہشاش بشاش اور چاق و چوبند ہوجاتے دو دو بجے رات تک اخبار کے دفتر میں کام کرتے اور جو بھی ملنے والے آتے ان سے اسی خندہ پیشانی سے ملتے جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ وہ ترجمہ اتنی تیزی سے کرتے کہ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی اردو عبارت کی نقل کر رہے ہیں۔ ان میں صحافت کی صلاحیت خداداد تھی اور وہ ایک پیدائشی صحافی تھے۔ آپ سے باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور کاتب کو

فیڈ بھی کرتے جا رہے ہیں۔ ایسی خداداد صلاحیت رکھنے والے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

وہ ایک شفیق، ملنسار، زندہ دل، ہمدرد اور کارکرد انسان تھے۔ اُردو زبان سے انھیں ایک خاص رغبت بلکہ محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو کا اخبار نکال کر بظاہر گھاٹے کا سودا مول لیا۔ ورنہ وہ ایک انگریزی اخبار بھی نکال سکتے تھے۔ ذہانت اور وسائل کی ان کے پاس کمی نہیں تھی۔ پھر وہ حیدرآباد کے ایک مشہور انگریزی ذریعہ تعلیم کے ہائی اسکول میتھوڈسٹ ہائی اسکول کے طالب علم تھے اور میٹرک فرسٹ کلاس کامیاب کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا اور بی ٹیک میں داخلہ لیا۔ لیکن ان کا ذہنی جھکاؤ ادھر نہیں تھا۔ اسلئے اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ اُردو کی جماعتوں میں پائے جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے بی ٹیک نامکمل ہی چھوڑ دیا۔

محمود انصاری ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اہلِ انصار میں سے تھے اور ان کے اجداد مدینہ سے دکن آئے تھے۔ دکن میں وہ گلبرگہ کے ایک تعلقہ الند میں بس گئے تھے۔ جہاں آج بھی ان کے خاندان کے ایک صوفی اور ماہر روحانیت بزرگ شاہ محمود الدین انصاری کا مزار مرجع خلائق ہے۔ انہی بزرگ کے نام پر ان کا نام محمود الدین انصاری رکھا گیا جسے انھوں نے بعد میں مختصر کرکے محمود انصاری کر دیا تھا۔ ان کی پیدائش الند ہی کی ہے اس کے بعد یہ خاندان گلبرگہ منتقل ہو گیا جہاں ان کے والد علی الدین انصاری دیوانی کے مشہور وکیل تھے۔ ان کے والد مرحوم نے بہت نام اور دولت کمائی اور پھر ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد منتقل ہو گئے۔

محمود انصاری کا خاندان ایک پڑھا لکھا خاندان ہے۔ ان کے بڑے بھائی مسعود انصاری قانون کے گریجویٹ ہیں۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ اُنھوں نے والد کی طرح کبھی وکالت نہیں کی۔ ان کی دو بہنیں ایک بڑی اور ایک چھوٹی ڈاکٹر (میڈیسن) ہیں جن میں بڑی بہن مسز عطیہ [illegible]

شامل ہیں اور سعودی شہریت رکھتی ہیں۔ انہی کی وجہ سے محمود انصاری کا شاہ کے خصوصی نرسان پر چھ سال تک مفت علاج ہوتا رہا اور ان کی زندگی میں چھ سال کا اضافہ ہوا۔

محمود انصاری کو شروع سے اُردو زبان اور صحافت سے دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ۱۳ سال کی عمر میں انھوں نے حیدرآباد سے بچوں کا رسالہ "گلشن" نکالا۔ جو ماہنامہ تھا جس کے ٹائیٹل پر بحیثیت اڈیٹر انہی کا نام ہوتا۔ جب لوگ (خصوصاً لڑکے) ان سے ملنے جاتے اور ایڈیٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے تو وہ خود ایڈیٹر کی میز پر خاکی نیکر اور سفید ہاف شرٹ پہنے بیٹھے رہتے اور سب سے کہتے کہ محمود انصاری ان کے بڑے بھائی ہیں۔ وہ کسی سے نہیں ملتے۔ آپ کو جو کہنا ہے کہہ دیں۔ سب آپ کے خیالات ان تک پہنچا دوں گا۔ یہ رسالہ چند شمارے وہ بھی لمبے لمبے وقفوں کے بعد نکل کر بند ہوگیا اور ان کے گھر والوں نے بھی سکون کی سانس لی کہ چلو بچہ کا شوق پورا ہوگیا۔ اب وہ تعلیم پر توجہ دے گا۔

بی ٹیک کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر محمود انصاری "پیکر" گروپ سے وابستہ ہوگئے جسے نکالتے تو اعظم راہی تھے لیکن ان کے مشیروں میں حسن فرخ، رؤف خلش، اکمل حیدرآبادی اور احمد جلیس وغیرہ شامل تھے۔ ان ہی دنوں ایک بار احمد جلیس (جو علامہ حیرت بدایونی کے فرزند اور جیلانی بانو کے بھائی ہیں اور جو ان دنوں بنگلور دوردرشن پر ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں) کے دیوان خانہ میں محمود انصاری سے میری پہلی ملاقات بلکہ تعارف جلیس کے توسط سے ہوا اور پھر اس وقت سے لے کر مرنے تک برابر محمود انصاری سے میرا ربط رہا۔ میں "پیکر" کے پہلے شمارہ سے مستقل لکھنے والوں میں شامل تھا اس طرح اس ٹولی میں بھی شریک ہوگیا۔ "پیکر" وہ پہلا رسالہ ہے جس نے ہندوستان میں ڈائجسٹوں کے لئے راہ ہموار کی یا راستہ دکھایا کیونکہ یہ ایک خالص ادبی پرچہ نہیں تھا۔ بلکہ اس میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو ... [illegible]

چند سال اعظم راہی "پیکر" ناساعد حالات میں بھی پابندی سے نکالتے رہے لیکن بالآخر یہ بھی بند ہوگیا۔ اس کے کچھ دن بعد محمود انصاری کے شوق نے انھیں شوق نے انھیں خاموش نہیں بیٹھنے دیا اور انھوں نے "کاکل" کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا۔ جس میں میرے مضامین بھی چھپے۔ اسی زمانہ میں محمود انصاری کے دماغ میں ایک سوال آیا کہ حیدرآباد سے اردو کا ایک روزنامہ نکالنا چاہئے۔ انھوں نے گھر والوں سے تذکرہ کیا تو ان کے بڑے بھائی مسعود انصاری صاحب نے (جو "منصف" کے مینیجنگ ایڈیٹر تھے) ان سے کہا کہ وہ پہلے کسی روزنامہ میں رہ کر تربیت حاصل کریں اور اس کے بعد یہ قدم اٹھائیں کیوں کہ روزنامہ نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ دھن کے پکے محمود انصاری نے دس سال تک حیدرآباد کے سب سے بڑے اور معیاری روزنامہ "سیاست" میں سب ایڈیٹری کی اور صحافت کی عملی تربیت حاصل کی۔ اب تو ان کے گھر والوں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہا اور انھیں اجازت دینی ہی پڑی۔

اس زمانے میں حیدرآباد سے "منصف" نامی اردو کا ایک ہفت روزہ نکلتا تھا۔ انھوں نے نیا ڈیکلریشن لینے کی بجائے اسے ہی خرید لیا اور روزنامہ بنا دیا۔ اس طرح روزنامہ "منصف" معظم جاہی مارکیٹ کے ایک گیرج سے نکلنا شروع ہوا۔ اور چونکہ محمود انصاری کے پاس ذہانت اور وسائل کی کمی نہیں تھی۔ اسلئے جلد ہی یہ قلب شہر کی دو منزلہ عمارت میں جسے "منصف" کے لئے ہی خریدا گیا تھا، منتقل ہوگیا۔ نیچے پریس نصب کیا گیا اور اوپر اخبار کا دفتر تھا۔ محمود انصاری یہیں خاموش نہیں ہوگئے بلکہ انھوں نے "منصف" کے لئے آفسٹ پریس خریدا اور اسے کمپیوٹر سے لیس کیا۔ اب یہ حیدرآباد کا تیسرا بڑا اردو اخبار تھا جسے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ بیوپاریوں اور قارئین کا بھی تعاون حاصل ہوگیا۔ ہر سنڈے وہ "منصف" کا خصوصی اڈیشن آٹھ صفحات پر بڑے اہتمام سے نکالتے تھے۔

محمود انصاری کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے نوجوان صحافیوں کی ایک ٹیم تیار کی ۔ گو وہ معاوضہ کم دیتے تھے لیکن اپنے اسٹاف کو ایک خاندان کی طرح رکھتے تھے ۔ رات کا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا اور تمام اسٹاف، سب ایڈیٹروں اور کاتبوں سے لے کر چپراسی تک سب ایک ساتھ کھاتے تھے ۔ بہت سے اُردو کے نوجوان "منصف" میں کام سیکھ کر دوسرے اخبارات میں چلے گئے یا اچھی نوکریاں ڈھونڈ لیں ۔ "منصف" کے سنڈے ایڈیشن میں چھپنے والوں میں میں بھی شامل تھا ۔ محمود انصاری کے انتقال کے بعد ان کے فوٹو گرافر مقصود حسن نے مجھے بتایا کہ جب بھی کسی تقریب میں میری تصویر آتی تو کہتے "بھئی یہ تصویر ضرور دے دو ۔ رشید الدین ہمارے خاص دوستوں میں شامل ہیں"

محمود انصاری جس طرح ایک بے باک انسان تھے اسی طرح وہ ایک بیباک صحافی بھی تھے ۔ انھوں نے اپنے اخبار کی ہمیشہ بے لوث پالیسی رکھی ۔ ان کے اخبار نے ہمیشہ مظلوموں کی تائید کی خواہ انھیں اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانی پڑی ہو ۔ حیدرآباد میں جب بھی فسادات ہوتے وہ اپنے خاص نمائندہ کے ذریعہ ایسی خبریں چھاپتے جو کسی اور اخبار میں نہیں ہوتی تھی اور کسی مصلحت کے شکار نہیں ہوتے تھے ۔ چنانچہ ایک موقع پر فسادات کے زمانہ میں پولیس نے ایک دن کے لئے ان کے اخبار کے دفتر اور پریس کو مہر بند بھی کر دیا تھا لیکن وہ فوری عدالت سے رجوع ہو گئے اور تالہ بندی ختم کرائی ۔ اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی پالیسی نہیں بدلی اور اسی طرح صحیح واقعات لکھتے رہے ۔

محمود انصاری کو اُردو کے مسائل سے ہمیشہ دل چسپی اور ہمدردی رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انجمن ترقی اُردو شاخ آندھرا پردیش کی مجلس عاملہ کے رکن تھے ۔ ترقی اُردو بورڈ دلّی میں بھی ایک کمیٹی میں وہ شامل تھے ۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) جناب خلیق انجم سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور وہ ہر روز انھیں دلّی "منصف" کی ایک کاپی بھیجتے ۔ "ہماری زبان" میں اُردو کے تعلق سے مختلف اخبارات سے نقل کر کے جو

خبریں شائع ہوتیں ان میں زیادہ تر حیدرآباد سے "منصف" کی خبریں ہی ہوتیں۔ ان کا اخبار اُردو کے کاز کا ایک بہت بڑا حامی تھا۔ انھوں نے اُردو پر جو کچھ گزرتی تھی اسے اپنے کالموں میں جگہ دی۔ انھوں نے بہت سے اداریے اُردو کی تائید میں لکھے اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی نشاندہی کی۔

محمود انصاری کو شاید دُنیا سے جلد گزر جانا تھا اسلئے انھوں نے سب کام جلدی جلدی نبٹائے۔ انھوں نے ۵۴ سال میں وہ سب کچھ کر لیا جو لوگ ایک عمر کو پہنچ کر بھی نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو گئے تھے۔ ان کی طبیعت میں تیزی بہت زیادہ تھی۔ ان کی معلومات بے حد وسیع تھیں اور مطالعہ بہت عمیق۔ بیماری کے زمانہ میں بیماری کے زمانہ میں وہ جب ریاض میں رہتے تو ان کے بہنوئی صفدر حسین صاحب کے بقول بس کتابیں ہوتیں اور وہ ہوتے۔ دُنیا جہاں کی کتابیں وہ پڑھ ڈالتے اور حیدرآباد واپس آکر اس مطالعہ کی دولت کو "منصف" کے قارئین میں لُٹاتے۔ ان کے اجداد مدینہ سے آئے تھے اور وہ ریاض ہی میں پیوند خاک ہو گئے۔

محمود انصاری بے حد خلیق، ملنسار، خوش اخلاق اور بہادر انسان تھے کوئی بھی واقعہ انھیں پریشان نہیں کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ انھیں موت بھی خوفزدہ نہیں کرسکی۔ اور وہ ان کی شگفتگی اور زندہ دلی کو متاثر نہ کرسکی۔ انھیں معلوم تھا کہ انھیں بلڈ کینسر ہے اور وہ چند سال کے مہمان ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنے کام میں لگے رہے۔

ان کے قریبی دوست احمد جلیس نے مجھے بتایا کہ باوجود یہ کہ انھیں اپنی بیماری کا پتا چل گیا تھا لیکن انھوں نے کبھی پرہیز نہیں کیا۔ خدا جانے دوائیں بھی استعمال کرتے تھے یا نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ آخر بیماری نے بھی ان کے پائے استقلال میں کوئی لرزہ پیدا نہیں کیا۔ ان پر مضمون لکھنے کا حق تو احمد جلیس ہی ادا

ب

ت عوفی

ماہ لقا چندا

(قسط دوم)

ماہ لقا کی زبان سادہ، صاف اور سلیس ہے۔ بقول ڈاکٹر لئیق صلاح صاحبہ ا کے اشعار میں ما حول کی زندگی کا عکس موجود ہے۔ اس کی شاعری میں شعریت ت، پاکیزگی اور لطافت نمایاں ہے"۔

ماہ لقا نے اپنی غزلوں میں ایک خاص التزام رکھا ہے جو کسی اور شاعر کے یں پایا جاتا۔ ہر غزل مطلع و مقطع سمیت پانچ اشعار پر مشتمل ہے اور ہر مقطعہ ے اور حضرت علیؓ کی مدح میں ہے یا ان سے کوئی نہ کوئی استدعا ہے۔ وہ ذیل میں نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا حاضر ہیں ہم بھی گر ہو ارادہ نباہ کا

—

تو دنگ ہوئے تیرے رقص پر عاشق ہو نیم جان نئی اٹھے سے تان بھر

—

کے نہیں ہے غیر سے ہرگز توقع کچھ مگر دنیا میں مجھے ہے پیار سے مطلب

—

ہنے کی توقع میں جیسے بیٹھی ہے ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے

—

ے گھر میں وہ رشک ماہ آئے رہتا ہوں اس بیٹھے میں امید وار ہو شب

آہ و نالہ پر میرے کیا داد دی ہے مہرباں — وائے قسمت سن کے بولے قصہ خوانی ہے عبث

سج کے اس طرح سے نکلا وہ طرحدار کہ بس — جان و دل ہو ہی گیا دیکھ گرفتار کہ بس

میں پوچھتا ہوں دن کی تو کہتا ہے رات کی — معلوم یوں ہوا کہ تیرا دل لگا کہیں

ہلال مہ نو کو کم دیکھتے ہیں — وہ ابرو کا تیرے جو خم دیکھتے ہیں

چندا کے مقطعے ملاحظہ ہوں جن میں حضرت علیؓ کی مدح میں التجا ہے

گر بھی وہ ہو وے حسن میں چندا کے یا علیؓ — جلوے کو اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق
چندا کو بخش یا علی اپنی جناب سے — رتبہ جو دو جہان میں ہو افتخار کا
مثل بلبل جو اسے دیکھے غزل خواں کیوں نہ ہو — یا علیؓ چندا تیرے گلشن سے پاتی ہے بہار

جناب رمن راج سکسینہ نے لکھا ہے کہ

"چندا حضرت ایمان سے اصلاح سخن لیا کرتی تھی لیکن اس کی شاعری میں ایمان کا رنگ حاوی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چندا کی شاعرانہ عظمت نے اس کے عہد کے بعض شعرا اور امرا پر خاص اثر ڈالا۔"

چندا کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام میں نسوانی جھلک موجود ہے۔ زیادہ ضمیریں تانیث میں ہیں لیکن مذکر الفاظ بھی اس نے استعمال کئے ہیں جیسے

شاید کہ میرے گھر میں وہ رشک ماہ آئے ○ رہتا ہوں اس لئے میں امیدوار ہر شب

ماہ لقا کے ہم عصر شعرا میں وہ سب شاعر ہیں جو مہاراجہ چندو لعل شاداں کے دربار سے وابستہ رہے ہیں جن کی تعداد تین سو سے کم نہیں ہے۔ لیکن ان میں

ں ہم عصر شعرا ذیل کے اساتذہ سخن ہیں:

بشیر محمد خاں ایمان (ماہ لقا کے اُستاد) شیخ محمد حفیظ حفیظؔ ۔ میرزا ذوالفقار علی خاں
۔ غلام مصطفیٰ سخنؔ ۔ مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ ۔ شاہ کمالؔ ۔ میر شمس الدین فیض
مدنی قیسؔ ۔ شاہ نصیرؔ ۔ احمد علی خاں شہید ۔ سجاد علی خاں سجادؔ ۔ عباس علی خاں
ماںؔ ۔ احسن اللہ خاں بیاںؔ ۔ شاہ تجلی علی شاہ تجلیؔ وغیرہم ۔

ماہ لقا نے مجرد زندگی بسر کی ۔ اس کے تجرد کی وجوہات کا علم تو کسی کو
ں ہے ۔ اس بارے میں جو بھی سوچا جائے گا وہ قیاس ہوگا ۔ راقم الحروف کا خیال
۔ اس کو فن موسیقی سے اتنی شدید محبت تھی کہ اس کی آنکھ کسی اور سے نہیں لڑ سکتی
ایسی خواتین آج بھی ہیں جو اس فن میں گم ہو گئی ہیں اور ان کو دُنیا سے کوئی
روکار نہیں ہے ۔

ماہ لقا کے تمول کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ۔ اس کے کئی مواضعات جیسے سید پلی'
ڑہ' چنداپیٹھ' اڈیکمیٹ اس کی جاگیریں تھیں ۔ اس کے کئی مکانات اور
ت تھے ۔ وہ لاکھوں کے زیورات اور جواہرات کی مالک تھی ۔ بڑے آرام و آسائش کی
ا بسر کرتی تھی ۔ بقول جناب سکینہ اور جناب گوہر " مکلف لباس سے آراستہ
بستہ " رہتی تھی ۔ ایک امیرزادی کی سی پُر تکلف زندگی بسر کرتی تھی لیکن [illegible]
ت کرنا بھی اس کی فطرت میں تھا ۔

[illegible] کے نہیں ہے غیر سے ہرگز توقع کچھ ○ مگر دُنیا کے لوگوں سے عجب ہے پیارے مطلب

نہ بے حد کھلے ہاتھ کی تھی ۔ اہل کمال کی قدر کرتی تھی ۔ نہ صرف خود دیتی
۔ سی کے روزگار کا بندوبست کرنے کیلیے اپنے اثر و رسوخ کے استعمال میں بھی
ملی واقع ہوئی تھی ۔ حافظ تاج [illegible] کو آگے آ [illegible] چنانچہ [illegible]
ر کھا ۔ اس کے بعد مہاراجہ چندو لعل شاداں [illegible] کی خدمت

دلوا دی ۔

ماہ لقا کی خیر خیرات کو تقریبوں کے موقع پر دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کے عرس، عشرہ محرم، کھٹ سن کے میلے، یاز دہم اور جشن حیدری کے موقعو اس کی بے اندازہ داد و دہش کو پڑھ کر آج بھی بخیل کا سینہ پھٹ جاتا ہے۔ خیر خاتون کے بارے میں حیرت ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت صاحبہ نے کیسے لکھ دیا کو دولت کی ہوس تھی۔ وہ لکھتی ہیں ۔

" آصف جاہ ثانی اور آصف جاہ ثالث کی عنایات سے ماہ لقا کے پاس دولت کی کمی نہ تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فنکارانہ جبلت پر کبھی کبھی پیشہ ورانہ مزاج اور ماحول غالب آجاتا تھا۔ چنانچہ دولت کی ہوس جاگیر اور منصب کی چاہ مہ لقا کے دل میں شاہوں کی سرپرستی کے باوجود باقی رہی۔ اس نے ایک غزل میں ارسطو جاہ سے جاگیر عطا کرنے کی استدعا مدعا چندا کا ہے یہ اب ارسطو جاہ سے ○ فیل و نذر بخشش تو کی جاگیر کا ہو

دولت، عزت، شہرت انسان کی کبھی نہ ختم ہونے والی خواہش ہے ایسی خواہش ہے جو انتہائی بے نیازی کے مظاہرے کے باوجود بھی دل کے کسی ایک میں موجود رہتی ہے۔ اس خواہش کا تسلسل شاید مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ غالب نے کہا تھا کہ " شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن " ایک ما کیا ہے۔ شاہ و گدا، امیر اور فقیر سب اس کے اسیر ہیں۔ ماہ لقا نے یہ خواہش جاہ سے کی تھی۔ ارسطو جاہ وہ مدار المہام تھے جنھوں نے اس کے عقیقہ کی تقر کے اہتمام پر شخصی دلچسپی لی تھی۔ گویا ماہ لقا ان کے گودوں میں کھیلی تھی۔ اؤ خود بھی ماہ لقا کو ... تھے۔ ماہ لقا ان کو مربیانہ شفقتوں کی احسان پر ان ... کی ... طلب میں تو بڑا ناز معلوم ہوتا ہے۔ اس میں پیشہ ورانہ مز

ماحول کا کیا دخل ہو سکتا ہے اور پھر ہوس تو تخئیل ہوتی ہے وہ تو بڑی خیر خیرات کرنے والی خاتون تھی۔ اس کے مانگنے میں یہ پہلو بھی ہو کہ زیادہ سے زیادہ دولت آئے وہ بے دریغ بانٹے۔

ماہ لقا پیشہ ور کب تھی۔ اس کے فن کے مظاہرے فنکار کے مظاہرے تھے پیشہ ور تو وہ ہوتی ہے جس کا کوٹھا ہو، روزانہ عیاش لوگ جمع ہوتے ہوں۔ ناچ گانا ہوتا ہو۔ بائی جی کے پان گردش میں آتے ہوں۔ پان کا تھال چھن چھنا چھنا چھن چھن تال دیتا رہتا ہو۔ گھناونی اور مبتذل فقرے بازی ہوتی ہو۔

ماہ لقا کے گھر کی شعری محفل ہو یا بزم طرب، کسی کو آداب مجلس سے سر مو انحراف کی مجال نہ تھی۔ اور پھر شرکائے محفل وہ جن میں امیر ہوتے تھے، رئیس ہوتے تھے ذی حیثیت شخصیتیں ہوتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ ماہ لقا کے فنی مظاہرے چند مخصوص درباروں کی حد تک محدود تھے۔ جیسے شاہی دربار یا مہاراجہ چندو لعل شاداں کا دربار وغیرہ۔

ماہ لقا کی داد و دہش بے حساب تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کئی رفاہی کام بھی کئے۔ کوہ مولا کے راستہ پر ایک حوض بنام "سبیل اللہ" تعمیر کروایا۔ اسی کوہ مولا کے قدم پر چہل چراغ بنوایا جو آج تک ہے۔ چلہ میں خیمہ گاہ عزا پختہ دالان تعمیر کروائے جہاں آج بھی زائرین بھی ٹھیرتے ہیں۔ حیدرآباد کو جانے والی سڑک پر درگاہ حضرت موسیٰ قادری کے قریب ایک مسجد "ثانی بیت الحرام" تعمیر کروائی۔ اس مسجد کا سنہ تعمیر ۱۲۰۳ھ ہے۔ اس سے ماہ لقا کے ذوق تعمیر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور رفاہی کاموں کا بھی۔

ماہ لقا کی حویلی لوچی بیگ کی کمان (قریب منڈی میر عالم) کے اندر تھی اور قریب ہی اس کا عاشور خانہ تھا جس کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ ماہ لقا کی

عملہ ایک امیر کا عملہ تھا۔ پانچ سو سوار، تین سو کنیزیں، کئی شاگرد پیشہ، دفتر کا عملہ، جاگیروں کی نگرانی کا عملہ، مختلف علوم و فنون کے قابل اساتذہ اس کے پاس ملازم تھے۔ وہ جب باہر نکلتی تو ایک امیر زادی کی طرح نکلتی۔

ماہ لقا کا انتقال ایک وبائی مرض سے ہوا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے انتقال کے وقت اس کی عمر (۵۶) سال بتائی ہے اور سنہ وفات ۱۲۳۶ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ ماہ لقا کا انتقال (۷۰) سال کی عمر میں ۱۲۴۰ھ میں ہوا۔ مرنے کے بعد اس کو یہ اعزاز بھی ملا کہ اس کی لاش کو امرائے دکن نے قبر میں اتارا۔ وہ اپنی ماں کے پہلو میں ابدی نیند سو رہی ہے۔ ذیل کے شعر سے اس کا سنہ وفات برآمد ہوتا ہے۔

ہاتف غیبی ندا داد بتاریخ او ۵ راہی جنت شدہ ماہ لقائے دکن
۱۲۴۰ھ

دکن کی اس مخیر خاتون نے مرنے کے بعد اپنے عملہ کی آسائش کے لئے منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے علاوہ ایک کروڑ روپیہ چھوڑے تھے۔ ایسی نیک باکردار خاتون کو زمانہ نے طوائف کے لفظ سے نواز کر اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جو خاتون مدار المہاموں کی گود میں پلی ہو، محلوں میں پروان چڑھی ہو جس کے لیل و نہار میں پاکیزگی ہو وہ اور طوائف کہلائے۔ کیا اہل دانش کے لئے حیرانی کی بات نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں خود ماہ لقا اپنے نام کے ساتھ "بائی" کے اضافہ پر طنزاً ضرور ہنستی ہوگی۔ اس کا اصلی نام تو چندابی بی تھا۔ چندا بائی نہیں تھا۔

ماہ لقا بڑی حساس خاتون تھی۔ جو خاتون ایسے ویسوں کو اپنی گرد پاسنگ نہ آنے دیتی ہو وہ کسی گرے ہوئے لفظ کو اپنے نام سے مربوط پاکر اسے کیسے برداشت کرسکتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بیدار مغز خاتون کی بیرونی زندگی

ے عہد کے معاشرے پر مسلسل طنز تھی اور داخلی زندگی مسلسل کرب سے بھری ہوئی تھی
کے تجرد کا یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے۔

تاریخ اور تذکروں کا حال حال تک یہ رویہ تھا کہ خارجی حالات کے تواتر کی
د پر نتیجہ اخذ کر کے فیصلہ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ عہد
ید میں تاریخ نے فلسفیانہ روش اختیار کر لی ہے۔ وہ حالات و واقعات کی چھان بین
دوران داخلی تنقید کو زیادہ اہمیت دینے لگی ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر صادق نقوی نے
ہے کہ توریث کے اصول کو تاریخ اب بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے اور اس سے
مدد لیتی ہے کیونکہ یہ بات طے ہے کہ کسی شخصیت میں (۶۵) فی صد آثار توریثی
تے ہیں۔

تاریخ اور تذکروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کے
فات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج کے دور میں کسی حقیقت تک پہنچنے کیلئے
ا تنقید ضروری ہو گئی ہے۔

ماہ لقا کی زندگی پر تاریخ کے رائج الوقت اصولوں کی روشنی میں غور کرنے
ضرورت ہے کیونکہ اس کی زندگی کے کئی موڑ ایسے ہیں جو داخلی تنقید کی کسوٹی پر آکر
دئے جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے بجا فرمایا کہ

" شاید بعض اہل قلم ماہ لقا کی سوانح حیات پر قلم اٹھانے والے پر آنکھیں
چڑھائیں کیونکہ ایک طوائف کی فہرست میں اس کا نام آتا ہے اور ایک
طوائف شاعرہ ہستیوں میں کیسے جگہ پا سکتی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ
ماہ لقا کی ادبی اور سماجی زندگی کو دیکھ کر اس کو طوائف کہتے ہوئے قلم
رکتا ہے یا اس کا ایک [illegible] مرتبہ ہے کہ اس کے [illegible]
سے زیادہ ہیں۔ اور ان پر کیونکہ پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ اصل تو یہ کہ وہ

توں کی طوائف نہیں تھا۔ اور اگر سچ مچ طوائف تھی تو اس بات کو تاریخ کا کرشمہ سمجھنا چاہیئے
ایک طوائف اپنی چند اخلاقی کمزوریوں کے باوجود مشاہیر ملک کی صف میں جگہ
لی ہے۔"

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ ماہ لقا طوائف
یں تھی۔ جاگیردارانہ نظام میں کسی طوائف کی مجال نہ تھی کہ وہ کسی امیر کی مسند کے
بیٹھ سکے۔ ماہ لقا امرا کے پہلو بہ پہلو بیٹھتی تھی۔ شاہی اس کا ادب کرتی تھی
زانہ مزاج پرسی کے لئے چوبدار بھیجا کرتی تھی۔

ماہ لقا کی سوانح حیات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ غور کرنے
بات ہے کہ اردو ادب کے اساتذہ سخن کی شراب نوشیوں اور اس سے بڑھ کر
کی امرا پرستیوں کو نظر انداز کرکے انھیں سماج میں بلند مرتبہ دیا جاسکتا ہے اور خدائے
ن تک کہا جاسکتا ہے۔ ماہ لقا تو ایک فنکار خاتون تھی۔ طوائف نہیں تھی۔ "بائی"
نہیں تھی۔ کوٹھے کا لفظ جس کی حویلی کے اخلاق کو دیکھ اپنی تیرگی سے شرمندہ
ہاتا ہے۔ تو کیا عہد حاضر ماہ لقا کے نام کے ساتھ منسوب ان لفظوں کو زمانہ کا
مان کر انھیں محو نہیں کرسکتا۔

نصیر الدین ہاشمی نے پروفیسر عبد المجید صدیقی سے ایک قدم آگے بڑھ
ماہ لقا کے طوائف ہونے کی صاف صاف لفظوں میں تردید کردی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔
طوائف کے نام سے ممکن ہے کہ ذہن آجکل کی طوائف کی طرف منتقل ہو مگر
ایسا نہیں تھا۔ چندا ایک خاندانی خاتون تھی اور پیشہ ور طوائف نہیں تھی۔"

ماہ لقا کی سوانح حیات کا ایک ایک واقعہ عہد جدید کی علمی دنیا سے خواہش
ہا ہے کہ وہ اس خاتون کی زندگی کو تحقیق کے جدید اصولوں کی رہبری میں دیکھے۔ اس
قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر اس کو سمجھا جائے جس کے بعد جن پر قلم اٹھایا

...الرحمٰن فاروقی

روزی روٹی اور مکان

ابھی حال ہی میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکومت اتر پردیش نے اردو [illegible]
اردو کو روٹی سے جوڑنے کے لئے ایک کثیر رکنی کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو حکومت کو [illegible]
مشورہ دے گی۔ بعض احباب اس خبر سے خوش بھی ہوں گے اور [illegible]
حکومت نے اردو کے سلسلے میں کچھ اور سوچا تو سہی، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی کمیٹیاں [illegible]
رہی ہے جن کی سفارشات بھی آتی ہیں۔ بعض پر عمل درآمد بھی ہوتا ہے اور کچھ کی سفارشات [illegible]
کی بدولت سرد خانے میں پڑی رہتی ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں کسی اندیشے میں [illegible]
ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو کی حق تلفی کے باوجود بھی حکومت کی طرف سے [illegible]
سلسلے میں بہت سے اقدامات کئے گئے ہیں۔ بہت سے اداروں کو اتنی گرانٹ [illegible]
ہیں جن کا وہ صحیح استعمال بھی نہیں کر سکے۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اردو کا مسئلہ دراصل سرکار اور اردو کے درمیان نہیں ہے [illegible]
یہ سمجھتے ہیں کہ سرکاری رویے کی بدولت آج اردو بے بس ہو گئی ہے یا وہ [illegible]
سکتا ہے، ان کا خیال یہ صحیح ہو۔ ہو سکتا ہے ہماری سمجھ غلط۔ لیکن ہمارے خیال میں [illegible]
اردو والوں کی بے حسی اور عدم توجہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کیونکہ سرکار کسی زبان کو [illegible]
بانت کے بل بوتے پر نہ تو زندہ رکھ سکتی ہے اور نہ عوام میں مقبول بنا سکتی ہے [illegible]
والوں کے جذبۂ ایثار، خلوص اور محبت کی بنا پر [illegible]
سفارشات آ جائیں اور ان پر عمل درآمد کرتے ہوئے سرکار ایسے اقدامات بھی کرے [illegible]

اُردو کا دامن براہِ راست روزی روٹی سے جڑ جائے تو کیا ہماری وہ اکثریت جو اپنے بچوں کو پبلک اسکولس میں پڑھا رہی ہے، انھیں وہاں سے نکال کر ان اسکولس میں داخل کرے گی جہاں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے ؟

اخباروں میں اُردو کے سلسلے میں اُٹھائی جانے والی بحثوں میں اس بات کا تذکرہ کیا جاتا رہا ہے کہ اُردو ایک زمانے میں نہ صرف رابطے کی زبان رہی ہے بلکہ نچلی سطح پر سرکاری کام کاج کی زبان بھی رہی ہے اور اب چونکہ زمین کا کھسرہ، تحصیل کے ریکارڈ، پولیس تھانوں میں رپورٹیں اور عدالتوں کے فیصلے اُردو میں نہیں لکھے جاتے۔ اس لئے یہ ایک مردہ زبان ہو گئی ہے۔ کیونکہ سرکاری دفتروں میں کسی بھی سطح پر اس زبان کا استعمال بند کیا جا چکا ہے اس لئے اس کی افادیت ختم ہو گئی ہے۔ اس کا روزی روٹی سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے اسے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اسلئے بہتر ہو کہ اس کی تکفین و تدفین بھی جلد ہی کر دی جائے۔ جن لوگوں نے پچھلے چالیس سالوں سے اس طرح کی باتیں کی ہیں اور اُردو پڑھنے والوں کے ارادوں کو متزلزل کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ وہ سبھی حضرات اپنے کو اُردو کا بہی خواہ سمجھتے اور سمجھاتے رہے ہیں۔ اُردو کی افادیت کے سلسلے میں اس منفی فکر اور منفی کردار نے اردو کے مسئلے کو جتنا پیچیدہ بنا دیا ہے اور اس سے اردو کو جتنا عظیم ترین نقصان پہنچا ہے اس کا بیان لفظوں کی گرفت سے باہر ہے۔ جب کوئی قوم اپنی زبان کے بارے میں اس طرح کا منفی رویہ اپنا لے اور اس زبان کی زندگی کی ضمانت سرکار سے مانگے تو یہ صورتِ حال افسوس ناک اور مضحکہ خیز لگتی ہے۔ سارا عرصہ ہم نے سرکار سے مطالبہ کرنے میں ضائع کر دیا۔ اگر اس کوشش کا ایک چوتھائی حصہ بھی ہم نے اس زبان کی زندگی کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانے میں صرف کیا ہوتا تو شاید اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے۔ اگرچہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قومیں بنائی نہیں جاتیں، قومیں اپنے [illegible]

ہمارے محبانِ اُردو تو اُردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے سلسلے میں بلند بانگ نعرے لگاتے رہے ہیں لیکن اس بات پر غور کرنے کی زحمت کسی نے بھی گوارا نہیں کی کہ اُردو یا کسی اور زبان کا روزی روٹی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ روزی روٹی پیدا کرنے کے اسباب و وسائل کیا ہوتے ہیں اور ان اسباب و وسائل کو فراہم کرنے میں کلاسوں میں پڑھائی جانے والی زبانیں کس حد تک مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ کیا اُردو کی جگہ پر ہندی انگریزی، تامل یا جرمن یا دیگر علوم جیسے تاریخ، سماجیات، عمرانیات پڑھنے سے روزی روٹی سے سیدھا تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں پانچ لاکھ انجینئرنگ کے گریجویٹ بے روزگار ہیں اور جہاں آج بھی ستر فی صد سے زیادہ آبادی کا واحد پیشہ زراعت ہے اس ملک کے بارے میں یہ سوچنا کہ زبان یا لسانیات سے متعلق مضامین جیسے تاریخ جغرافیہ، سماجیات وغیرہ پڑھنے سے روزی روٹی کا سیدھا وسیلہ پیدا ہوجائے گا۔ اسے خام خیالی نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ اُردو کے مقابلے میں انگریزی، نیز ہندی کے علاقے کافی بڑے ہیں۔ لہذا انھیں پڑھنے سے روزگار کے وسائل بھی کچھ وسیع ہوجاتے ہیں۔ لیکن آج ہندی یا انگریزی یا دیگر علوم حاصل کرنے کے بعد بھی روزگار کے سلسلے میں مواقع اتنے ہی محدود ہیں جتنا کہ اردو میں۔ اگر غور کیا جائے تو آبادی کے تناسب اور یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اُردو کے علاوہ دیگر زبانیں اور مضامین پڑھنے والوں کی تعداد کو مدِنظر رکھا جائے تو اُردو کا پہلو اتنا تاریک نظر نہیں آئے گا جتنا کہ بتایا جارہا ہے۔ کیونکہ زبانیں یا دیگر علوم کو حاصل کرنے سے روزگار کے مواقع محدود ہوجاتے ہیں۔ اسلئے اُردو کو بھی اس ملک میں وہی حیثیت حاصل ہے جو دیگر زبانوں اور علوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کی ہے۔

جب ہم زبان کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کرتے ہیں تو ہم ایک بنیادی

کرنے کے اسباب و وسائل کیا ہو سکتے ہیں اور کیا ہیں؟ ہمارے ذہن میں روزی روٹی کا نام لیتے ہی نوکریوں خصوصاً سرکاری نوکریوں کا تصور ابھرتا ہے۔ جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس ملک یا کسی بھی ملک میں روزی روٹی کے سلسلے میں آمدنی پیدا کرنے یا بڑھانے کے ذرائع اسباب و وسائل، محنت، لگن، اور صلاحیت پر منحصر ہوتے ہیں۔

ہمارے خیال میں روزگار حاصل کرنے کے تین خاص ذرائع ہو سکتے ہیں۔ پہلا نوکریاں سرکاری یا نجی زمرے میں، دوم خود اختیاری پیشے جس میں سبزی بیچنے سے لے کر سائیکل مرمت اور سائیکل مرمت سے لے کر ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے سبھی شامل ہیں۔ اور تیسرا ذریعہ محنت اور مزدوری کا ہے۔ اگر ہم اس ملک کی آبادی کو مدنظر رکھیں تو ہمیں اتنا معلوم ہے کہ آبادی کے تناسب میں دس سے بیس فیصد لوگ سرکاری دفتروں، نجی صنعتوں اور تعلیمی اداروں میں ملازمت کرتے ہیں۔ اس آبادی کا ایک بڑا حصہ جسے اندازاً چالیس سے پچاس فیصد کہہ لیں، محنت مزدوری کے کام میں لگا ہوا ہے۔ باقی پچیس سے چالیس فیصد ان لوگوں کا ہے جو اپنے ذاتی پیشوں اور صنعت اور تجارت میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاں تک محنت کش طبقے کا سوال ہے جیسے رکشہ چلانے والے، کاشت کاری سے متعلق مزدور طبقہ، معمار، تعمیری کاموں میں لگے ہوئے مزدور، آٹو رکشا اور ٹیکسی چلانے والے، ...راز، زرگری، بڑھئی، نائی یا اسی طرح کے خاندانی پیشوں میں لگے لوگ، سبزی بیچنے والے ...ان میں کام کرنے والے مزدور یا ایسے تمام پیشے جن کے لئے کسی خاص تکنیکی علم کی ضرورت نہیں اور ان حضرات کی روٹی روزی کا مسئلہ سوائے مقامی زبان کے کسی مکتبی زبان سے وابستہ نہیں۔ اسی طرح تجارت یا صنعت و حرفت میں لگے لوگوں کو بھی اپنے پیشے سے متعلق علم یا معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی ہندی، اردو، تامل یا ملیالم ایک حد تک معاون ہو سکتی ہیں، اس سے آگے نہیں۔ کیونکہ تجارت اور صنعت و حرفت کے لئے ...ب خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے ...

ہاں اس ملک میں تکنیکی علوم کو حاصل کرنے کے لئے آج بھی انگریزی کی لیاقت
کو حاصل کرنے کے لئے نہ تو پبلک اسکولوں میں پڑھنا ضروری ہے اور نہ ہی انگریزی
ے کرنا۔ آج بھی اس ملک میں تکنیکی اور سائنسی علوم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ انگریزی
ہندی، تامل، ملیالم یا اُردو کے ذریعے ان علوم تک آسانی سے رسائی حاصل نہیں
لیکن سائنسی علوم حاصل کرنے کے لئے انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو اور ہندی لے کر
درجہ یا ہائی اسکول کے امتحانات آسانی سے پاس کر سکتے ہیں۔ اس طرح ابھی
کہ روزگار کے دو بڑے ذرائع ہیں۔ ان میں سوائے انگریزی کے دیگر کوئی بھی
مدد یا مددگار نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں
حاصل کرنے کے جو اسّی فیصد سے زیادہ ذرائع ہیں، ان کا تعلق اُردو، ہندی
علاقوں کی کتنی زبانوں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب رہ گیا بیس فیصد حصہ جو
سرکاری نوکریوں یا درس و تدریس کے پیشوں سے متعلق ہے۔ جب ہم اس بیس
یا نوکریوں کی بات کرتے ہیں اور جب اس سلسلے میں یہ بات اُٹھاتے ہیں کہ اُردو کا
ہے تقریباً ختم سا ہو گیا ہے اور اس کا رشتہ سرکاری نوکریوں سے جڑنا چاہیئے
اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ اب سرکاری نوکریاں کس
حاصل ہوتی ہیں۔ انھیں پانے کے لئے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے مثلاً ہم نے
پولیس تھانوں سے اُردو ختم ہو گئی ہے یا ڈاک خانے میں اُردو داں طبقے کو
ملتی ہیں لیکن ہم اس بات پر غور کرنا بھول گئے کہ اب ڈاک خانے میں ملازمت
کے کیا طریقے ہیں۔ یا پولیس میں بھرتی ہونے کا کیا طریقہ مروج ہے یعنی ذمے
میں کون سی اسامیاں خالی ہوتی ہیں اور تکنیکی ماہرین کے علاوہ اور کونسی
عام آدمیوں سے پُر کیا جاتا ہے۔ سرکار میں تیسرے، دوسرے یا اوّل
اب کیسے ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہلکی سی وضاحت کرنا چاہتی ہوں

پولیس میں نوکریاں ہندی پڑھنے سے بھی نہیں ملتیں۔ اس کے لئے کانسٹیبل کی سطح پر ہائی اسکول پاس ہونا ضروری ہے۔ ہندی علاقوں میں ہندی کی لیاقت بھی ضروری ہے لیکن اگر ہائی اسکول میں ہندی کے ساتھ اُردو بھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے لی گئی ہے تو یہ ایک اضافی قابلیت مانی جاتی ہے۔ پولیس کی نوکریوں کے لئے جسمانی طور پر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ واحد شرط ہائی اسکول کے علاوہ صرف یہ ہے کہ آپ جسمانی طور پر ضروری اُمور کو پورا کر سکیں اور دوڑ بھاگ، کود اور محنت و مشقت کے لئے ضروری نشانوں پر پورا اُتر سکیں۔ ڈاک خانوں میں ملازمت کے لئے ہائی اسکول میں جن کا سب سے زیادہ نمبر ہوتا ہے، ان کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ اس میں اگر طالب علم نے اردو، فارسی یا عربی زبانیں اختیار کی ہیں تو اس بات کا امکان قوی ہو جاتا ہے کہ اس کا نمبر دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ رہ گئی بات تیسرے، دوسرے اور اول درجے کی ملازمتوں کی۔ یہ سبھی ملازمتیں مقابلہ جاتی امتحانوں میں کامیاب ہونے والے لوگوں کو ہی ملتی ہیں اور ان مقابلہ جاتی امتحانوں میں اُردو بھی اسی طرح معاون ہو سکتی ہے جیسے ہندی یا دیگر زبانیں۔ مقابلہ جاتی امتحانوں کے لئے اولین شرط ہے۔ آپ کی قابلیت، لیاقت، صلاحیت اور محنت۔ اگر ان چاروں چیزوں کا فقدان ہے تو آپ ہندی سے ایم اے کر کے یا انگریزی سے ایم اے کر کے یا اُردو سے ایم اے کر کے بھی اب کلرک نہیں بن سکتے۔ جہاں تک درس و تدریس کا سوال ہے آزادی کے بعد سے لگاتار اُردو کے سلسلے میں بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے علاوہ اُردو میڈیم اسکولوں، اقلیتی اداروں اور دیگر ایسے تعلیمی اداروں میں جہاں اُردو بحیثیت مضمون پڑھائی جا رہی ہے اور جنھیں پڑھانے کے لئے اُردو داں حضرات رکھے جاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایسے تعلیمی اداروں کی تعداد زیادہ ہو جہاں ہندی اور انگریزی ہر سطح پر پڑھائی جاتی ہو۔ لیکن اس میدان میں بھی آسامی، کنڑ، تامل ملیالم، راجستھانی، ڈوگری، کشمیری اور دیگر زبانوں کے مقابلے میں ایسے اداروں کی تعداد

ذریعہ ہے جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ جہاں تک اول درجے کی ملازمتوں کا سوال
مرکز میں آئی۔ اے۔ ایس اور متعلقہ سروسز اور صوبائی سطح پر صوبائی سول سروسز
ت میں دونوں مقابلہ جاتی امتحانات ہیں۔ اور ان میں انہی لوگوں کا انتخاب کیا جاتا
مقابلے کی دوڑ میں آگے نکل جاتے ہیں لیکن مرکز میں بھی اور ریاستی سطح پر بھی ان
ت کے لئے دیگر زبانوں اور مضامین کے ساتھ اُردو بھی ایک اختیاری مضمون کی
سے لی جا سکتی ہے۔ اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ان مقابلہ جاتی امتحانوں میں
اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے والے لوگوں کے انتخاب کے امکانات بھی قوی
ہیں۔ اس طرح مقابلہ جاتی امتحانوں میں یا درجہ اول کی ملازمتوں میں اُردو ایک
یعہ بن جاتی ہے جسے اختیار کرنے کے بعد ان امتحانوں میں کامیابی تقریباً یقینی
ہے۔ بشرطیکہ محنت و صلاحیت کی بدولت دوسرے مضامین میں بھی اچھے نمبر
سکیں۔ اس ملک میں ایسے بھی لوگ ہیں جنھوں نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان اُردو
ے ذریعہ دیا ہے۔ اور نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ سہولت صرف
ستان میں حاصل ہے۔ اس سے آگے دیکھئے ہندوستان میں ہندی کے بعد سب سے
خبارات و رسائل اُردو میں شائع ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صحافت
ایسا ذریعہ ہے جو براہ راست اُردو سے یا اُردو کے ذریعے روزی روٹی سے
ہے۔ اُردو میں روزگار حاصل کرنے کا ایک خاص ذریعہ اور ہے جو کسی بھی
حاصل نہیں اور وہ ہے خوش نویسی اور کتابت جس سے آج ہزاروں کی تعداد
حصول آمدنی کر رہے ہیں۔ اس طرح دیگر زبانوں کے مقابلے میں اُردو میں روزگار
کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔ اُردو کا معاملہ تو کچھ یوں بھی ہے کہ سرکاری سطح پر
ے محکمے ہیں جہاں اسامیاں صرف اُردو والوں کے لئے مخصوص ہیں اور ہمیں یہ کہتے
افسوس ہو رہا ہے کہ بعض محکموں میں اب بھی اُردو کی کئی ایسی جگہیں خالی ہیں جو

یو۔پی۔ ایس۔سی سے بھری جاتی ہیں لیکن جن کے لئے یو۔پی۔ ایس۔سی کو ایم
رکھنے والا کوئی اُردو داں نہیں مل سکا۔ اس طرح اگر غور و فکر سے کام لیا جائے
نتیجے پر پہنچ سکیں گے کہ مکتبوں میں پڑھائی جانے والی زبان کا براہ راست روزی
سے تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہماری یہ مانگ بھی کہ روزی روٹی سے اُردو کو جوڑا جا
بے وقعت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حقیقی صورتِ حال ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔
سرکاری ملازمتوں میں اب بھی اُردو کا سلسلہ روزی روٹی سے اور زبانوں کے مقا
زیادہ ہی جڑا ہوا ہے۔

میرے کہنے کا بس یہی مدعا ہے کہ اُردو کی صورتِ حال اتنی تاریک نہیں
کہ ہمیں دکھائی جاتی ہے۔ آج بھی اُردو میں روزی روٹی کے امکانات زیادہ روشن
ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے احساسِ کمتری کو دُور کریں۔ محنت او
پیدا کریں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان میں اضافہ کریں۔ یاد
اب ریلوے میں کلرک کی ملازمت بھی مقابلہ جاتی امتحانوں کے ذریعہ ہی ملتی ہے۔ ا
بھی صرف ایک امتحان نہیں۔ پہلے ابتدائی امتحان پاس کیجئے" پھر فائنل امتحان پا
اور پھر انٹرویو دیجئے۔ اس کے بعد ہی کہیں انتخاب کا معاملہ آتا ہے۔ یہ دور مقا
ہے اور مقابلے میں آپ صرف لگن، خلوص اور محنت و صلاحیت کے بل پر ہی آگے بڑ
ہیں۔ خدارا اپنی کم علمی اور صلاحیت کے فقدان کا الزام اپنی مادری زبان پر نہیں
دیکھئے زمین بہت وسیع ہے۔ اور تاحدِ نگاہ آسمان پھیلا ہوا ہے۔ زمین سے لے کر
تک ہر جگہ روزی روٹی کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ بشرطیکہ آپ ان پہ کمند ڈالا
اور اس کے لئے سعی ہے شرط۔

یادِ عظمت عبدالقیوم

مذاکرہ

میرا شہر میرے لوگ

حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ شخصیت ممتاز شاعرہ نامور اہل قلم باشعور ادیب و م[illegible] خاتون محترمہ عظمت عبدالقیوم کا سب سے عظیم کارنامہ محفل خواتین کا قیام ہے۔ محترمہ عظمت عبدالق[illegible] نے یہ بات شدت سے محسوس کی تھی کہ حیدرآباد میں پڑھی لکھی خواتین کے لیے ایک ایسا مرکز قائم کیا چاہیے جہاں خواتین بے تکلفانہ ادبی و علمی ماحول میں اپنی تخلیقات پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر [illegible] محفل خواتین ان کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔ پروقار معتبر وضع دار سنجیدہ اور حیدرآبادی تہذیب ایک مکمل شخصیت نے حیدرآبادی تہذیبی روایات کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر جعفر نظام وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی نے شاداں کالج کے آڈیٹوریم (عظمت عبدالقیوم آڈیٹوریم) میں [illegible] کی شام منعقدہ جلسہ یادِ عظمت عبدالقیوم میں کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر احمد اللہ خاں شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ، محترمہ قادری بیگم سابق پرنسپل ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ، مسٹر غلام محمد خان صدر نشین شاداں ایجوکیشنل سوسائٹی، ڈاکٹر [illegible] رسول خان سابق ایم ایل سی اور محترمہ شاداں تہنیت بیگم ڈاکٹر [illegible] رسول خان [illegible] سکریٹری شاداں ایجوکیشنل سوسائٹی نے شرکت کی۔ مقرر[illegible]

[illegible]

اور جناب نیپال سنگھ ورما صدر شعبہ ہندی انوارالعلوم کالج شامل تھے۔ معتمد نشر و اشاعت محفل خواتین محترمہ فاطمہ تاج نے عظمت آپا کے نام کے زیرِ عنوان ایک پُراثر نظم سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ ابتداء میں کنوینر جلسہ جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر میں کہا کہ ممتاز شاعرہ عظمت عبدالقیوم کا انتقال ۲۱ رمئی ۱۹۸۸ء کو ہوا تھا۔ عظمت آپا کی چھٹی برسی کے موقع پر ان کی علمی ادبی شعری و تہذیبی خدمات کو یاد کرنے کے لئے آج کی محفل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ عظمت عبدالقیوم نے اپنی چہیتی بیٹی شاداں تہنیت کے نام شاداں کالج قائم کیا۔ محفل خواتین کا قیام ان کی دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ عظمت آپا کی شاعرانہ خدمات اور ان کی عظمت کا حیدرآباد کی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ اندراج کیا جاتا رہے گا۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان نے کہا کہ عظمت عبدالقیوم ایک ایسی صاحب فکر و نظر نفیس خاتون تھیں جن سے مل کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم حیدرآباد کی ایک نمائندہ اور باوقار معتبر خاتون سے مل رہے ہیں۔ عظمت عبدالقیوم کی نرم گفتاری ان کا شائستہ لب و لہجہ اور پُراثر انداز تخاطب بھلایا نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر منان نے کہا کہ جناب صلاح الدین نیر نے اس عظیم خاتون کی خدمات کے اعتراف میں گذشتہ (۶) سال سے ان کی برسی کے موقع پر جلسہ یاد عظمت عبدالقیوم کے انعقاد سے اپنے دیرینہ اور برادرانہ روابط اور ان کی خدمات کا ثبوت دیتے آرہے ہیں۔ میں جناب صلاح الدین نیر کا اس مخلصانہ رویہ کو خراج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر احمداللہ خاں نے کہا کہ عظمت عبدالقیوم نہ صرف ایک ممتاز شاعرہ نامور نثر نگار رہی تھیں بلکہ ایک ایسی باصلاحیت اور دور اندیش معزز خاتون تھیں جنہوں نے محفل خواتین کے قیام کے ذریعہ حیدرآبادی خواتین اور خاص طور پر ایسی خواتین جو پردہ کرتی ہیں ان کی ادبی و شعری صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ شاداں کالج کا قیام بھی ایک فیض رواں کی طرح دانش کدوں کی صفوں میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ عظمت عبدالقیوم کی پُرکشش شخصیت کا حیدرآباد ایک اہم اثاثہ کی طرح احترام کیا جاتا ہے گو محترمہ قادری بیگم نے کہا کہ محفل خواتین کے قیام سے عظمت عبدالقیوم نے خواتین کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ عظمت عبدالقیوم ہماری تہذیب کی نمائندہ خاتون تھیں پُرکشش شخصیت ہونے کے علاوہ سلیقہ شعاری ان کی فطرت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے عظمت عبدالقیوم کی شخصیت پر

مضمون سناتے ہوئے کہا کہ محفل خواتین عظمت عبدالقیوم کی منفرد فکر اور سوچ کی پاسداری کرتے ہوئے کام انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر طیب انصاری نے کہا کہ وہ حیدرآباد کی ایک عظیم خاتون تھیں۔ جن کی گفتگو طرزِ عمل اور مخلصانہ رویہ سے حیدرآبادی تہذیب کی مکمل نمائندگی ہوتی تھی۔ عظمت عبدالقیوم ممتاز شاعرہ ہونے کے علاوہ بہترین نثر نگار تھیں ایسی وضع دار اور باوقار شخصیتیں ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ جناب نہال سنگھ ورما نے عظمت عبدالقیوم کو عظمت دکن کہتے ہوئے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ جناب وزارت رسول خاں سابق ایم ایل اے نے شاداں کالج کے قیام اور اسکی سرگرمیوں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شاداں کالج ان ہی عظمتوں اور نیک تمناؤں کا مرکز ہے۔ جناب غلام محمد خاں نے کہا کہ عظمت عبدالقیوم نے شاداں کالج کے قیام کے سلسلے میں انتھک جدوجہد کی وہ اس کی پہلی صدر نشین تھیں یہ کالج ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ادبی اجلاس کے بعد جناب امیر احمد خسرو کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مشاعرہ کا آغاز محترمہ عظمت عبدالقیوم کی غزل سے ہوا۔ ممتاز افسانہ نگار محترمہ فریدہ زین نے ترنم سے یہ غزل سنا کر سماں باندھ دیا۔ مشاعرہ میں امیر احمد خسرو۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی۔ صلاح الدین نیر۔ پرنس شجاعت علی زندہ حضرت معظم جاہ شجیع۔ نہال سنگھ ورما۔ منظور احمد منظور۔ صادق نوید۔ عزیز بھارتی۔ محسن فرخ۔ مومن خاں شوق۔ قمرالدین صابری۔ عزیز النساء صبا اور مظفر النساء ناز نے کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اور شکریہ ادا کیا۔

سلسلہ ص ۲۲

جائے کیونکہ وہ ایسی نہیں تھی جس طرح تذکروں اور تاریخ میں اسے دکھایا گیا ہے۔ حُسن کی نعمت تو اس کو خدا نے عطا کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی سیرت کا حُسن اس کی مکمل خوش لباسی اس کا سنگھار سب اخلاقی دائرے میں تھے۔ وہ اعلیٰ اخلاقی اور سماجی اقدار سے آراستہ تھی۔ آج بھی ماہ لقا کی قبر پر جائیے۔ تو وہ آپ سے یہی کہتی دکھائی دے گی۔ بعد و آپ کے … دیکھئے یہ ماہ لقا ہے … تب تجھے سمجھے کہ کیسے بیتی تھا

چراغ تلے اندھیرا

(مذاکرہ عصری ادب)

غیروں کو فائدہ پہنچاتا اور اپنوں کو محروم رکھتا چراغ تلے اندھیرا کے لغوی معنی ہیں لیکن مرادی معنوں میں وسعت اور گہرائی کے خیال سے معاشرہ کے خدوخال کو سنوارنے اور نکھارنے میں اس کہاوت نے کامیاب نمائندگی کی ہے جو لوگ اجالوں سے ہمکنار رہتے ہیں اور مقتدر ہو جاتے ہیں وہ اُجالوں کو یا تو اپنی حد تک محدود رکھتے ہیں یا پھر اپنی مرضی سے کم سواد اور غیر مستحق لوگوں کو یا محض اور باہنر لوگوں کی موجودگی کے باوجود نوازتے رہتے ہیں۔ کچھ اس طرح کا مجموعی تاثر دانشوران شعر و ادب کا ہے جو ادارہ عصری ادب کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرے "چراغ تلے اندھیرا" کے زیر عنوان ۲۹ مئی کی شام مکتبہ شاداب بیڈ ہنر میں پیش کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر صادق نقوی ہیڈ شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب یعقوب میراں مجتہدی مؤلف ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ ترجمہ حکومت آندھرا پردیش نے شرکت کی۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے کہا کہ میں چراغ تلے اندھیرا کے مرادی معنی کے پس منظر میں اپنی گفتگو جاری رکھوں گا۔ فرقہ پرستی بہت پھیلی اور مذہبی حد کے غیر مستحق لوگوں کو بھی ہم نے حوصلہ دیا ہے۔ اپنی پاکیزہ زندگی یا احسان فراموش لوگوں کے قدم جمائے تھے۔ صدر ادارہ عصری ادب جناب صادق نوید نے چراغ تلے اندھیرا کے زیر عنوان اپنے کلیدی نوٹ میں کہا کہ اکثر ادبی، علمی، تہذیبی اداروں اور دیگر ثقافتی اداروں کے مرکزوں میں چند مفاد حاصلہ

تحت کم نظر کم قامت کارندوں نے اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ باہمی انتشار پھیلاتے ہوئے
پرصحت مند سرگرمیوں میں نہمک رہنا اپنا شعار بنا لیا ہے اور وہ اپنی تنگ نظری کے دائرے سے
ہرگز نہیں نکلنا چاہیئے۔ ہر اچھے کام کرنے والے پر کیچڑ اچھالنے کی فکر میں خود اپنے ہاتھوں اپنا معیار
گھٹا رہے ہیں۔ جناب صلاح الدین نیر نے چراغ تلے اندھیرا کی روشنی میں چند ایسی مثالیں پیش کیں
ہمارے اندر گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ محفل کے مہمان خصوصی جناب یعقوب میراں نے کہا کہ چراغ تلے اندھیرا
واضح مثال "ترقی اردو بورڈ" کی ہے چونکہ میرا تعلق اردو لغت کی تدوین و ترتیب سے رہا ہے
اس لئے میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ اردو کے مختلف پروجیکٹس پر لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہائے
جا رہے ہیں اور یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی مثبت و منفی ہر دو قسم کی سرگرمیوں
اہل اردو واقف ہیں ایسے اداروں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہر اہل قلم محبان اردو کے لئے ضروری ہے
بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ اس منظورہ بجٹ کا استعمال کس حد تک صحیح انداز میں کیا جا رہا ہے۔ جانتے بوجھتے
بھی کسی عمل کی پردہ پوشی اردو زبان کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ چراغ تلے اندھیرا جہاں کہیں ہے دور
کیا جانا چاہیے۔ جناب عزیز بھارتی نے کہا کہ چراغ تلے اندھیرا کہاں کہاں ہے وہ آپ بھی جانتے ہیں
اور میں بھی جانتا ہوں۔ ایوارڈوں کی تقسیم کا عمل غیر مستحق لوگوں کی جھولیاں بھرنے کا رجحان آپنے ہی مستحق
اور باصلاحیت لوگوں کو محروم رکھ رہا ہے۔ جس طرح اردو تعلیم کی ایک تو سکو ار اہم مرحلہ پڑی اسی طرح تحفظ
تحفظ کی یا زبانی کے لیے ہمیں اقدام کرنا ہوگا جناب قمرالدین صابری نے کہا کہ یہ موضوع مختلف امور کی
نشاندہی کرتا ہے ایوارڈوں اور اندھیروں کا مسئلہ از سر نو جائزے کا متقاضی ہے۔ مذاکرے کے بعد جناب
صلاح الدین نیر کی صدارت میں مشاعرہ ہوا مسز مومن خاں شوق اور اثر غوری نے مہمان خصوصی کی
حیثیت سے شرکت کی صدر مشاعرہ جناب صلاح الدین نیر کے علاوہ مہمانان خصوصی مسز مومن خاں شوق،
غوری اور ڈاکٹر صادق نقوی، صادق نوید، عزیز بھارتی، سلطانہ شرف الدین، ڈاکٹر حسن
الدین عباسی، محمد یوسف نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ صدر محفل ادب جناب صادق نوید
نظامت کے فرائض انجام دینے اور شکریہ ادا کیا۔

"مادری زبان میں تعلیم"

مکتبہ شاداب کا مذاکرہ

اُردو والوں کے لیے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کا قیام ایک قدرتی عطیہ ہے جسکے بارے میں جتنا غور کیا جائے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا روشن چراغ ہے جسکی روشنی دل و دماغ کو منور کرتی ہوئی احساس کمتری کے ماحول کو احساسِ برتری کے ماحول میں بدلتی جاتی ہے۔ ہر گھر ہر محفل میں آج اُردو مادری تعلیم کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اُردو والے اپنی مادری زبان کے تحفظ کے لئے جسقدر پریشان تھے آج ان میں توانائی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ اُردو مادری زبان اپنے اسلاف کے اس عظیم سرمایے کی ضمانت دیتی ہے جسکے لئے ایک غیر یقینی سی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ میں ادارہ سیاست اور جناب زاہد علی خاں کو مبارکباد دیتی ہوں کہ انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لئے بیڑہ اُٹھایا ہے اور وہ کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

ان خیالات کا اظہار پدماشری محترمہ ارجمند وہاب الدین نے مکتبہ شاداب کے زیر اہتمام یکم جولائی ۹۴ء کو ۷ بجے شام مکتبہ شاداب ریڈ ہلز میں منعقد مذاکرہ "مادری زبان میں تعلیم" کے زیر عنوان اپنے صدارتی ارشادات میں کہا۔ اس مذاکرہ میں جناب محمد اسحاق سابق پرنسپل مفخم جاہ کالج نے سیر حاصل کلیدی نوٹ پیش کیا۔ محترمہ عائشہ بیگم رباب اور محمد اسحاق مہمان خصوصی کے علاوہ مسز صلاح الدین نیر، عزیز بھارتی اور محمد قمر الدین صابری نے مذاکرہ میں حصہ لیا۔ ڈائرکٹر مکتبہ شاداب جناب مومن خاں شوق نے مکتبہ شاداب کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ صدر نشین

شاداب جناب محمد قمرالدین صابری نے مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے سرمایہ کا نہ صرف تحفظ کریں بلکہ اس سرمایے پوری طرح استفادہ کرتے ہوئے نئی نسل کے لئے آداب گفتگو، زندگی کا چلن اور دینی اقی تعلیم کی روشنی سے باخبر کرائیں۔ جناب محمد اسحاق نے اپنے تجربات کی روشنی میں اردو مادری کی اہمیت پر بھرپور اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہم اردو والوں کی بے اعتنائی نے ہمیں کافی ان پہونچایا ہے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری نسل اپنے تہذیبی ورثے سے دور ہوتی جا رہی ہے تہذیبی اقدار کی خاطر خواہ پاسداری سے منہ موڑ رہی ہے جس کی مثالیں معاشرہ سرگرمیوں سے دی جا سکتی ہیں۔ جناب محمد اسحاق نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بھی چھوٹی عمر کے بچوں کو کس درجہ میں کس زبان میں تعلیم دی جانی چاہیئے۔ جناب صلاح الدین نیر کہ آج ساری ریاست آندھرا پردیش میں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی وجہ سے

مادری زبان کا تحفظ، ارتقاء کے لیئے ایک ایسی طاقتور لہر چل پڑی ہے جس کی روشنی گلیوں سے لے کر شاہراہوں اور ایوانوں تک پہنچ رہی ہے۔ والدین کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اردو مادری زبان کا مستقبل کیا ہوگا۔ آج اس ٹرسٹ کی وجہ سے ہزاروں بچے اردو تعلیم دلچسپی لے رہے ہیں۔ اردو والے حکومت کے رویوں سے مایوس ہو چکے تھے مسلسل ناانصافی ایک پُر اثر انقلاب کی راہ فراہم کی ہے آج یوپی میں اردو کی لہر چل پڑی ہے۔ محترمہ عائشہ بیگم نے کہا کہ اگر اردو مادری تعلیم سے اپنے اولاد کو بے بہرہ رکھا گیا تو وہ اولاد بے راہ روی مکار ہو جاتی ہے اور وہ سارے اقدار جو نسلاً منتقل ہوتے رہتے ہیں بکھرنے لگ جاتے ہیں۔ کو اردو مادری تعلیم میں دلچسپی لینے پر زور دیا جناب عزیز بھارتی نے کہا کہ جس طرح رسم الخط سے دلچسپی ہے اسطرح اردو مادری زبان سے بھی دلچسپی نہیں چاہیئے یہ خیال درست نہیں ہے کہ اردو زبان کے فروغ سے ایک فرد کا سوسائٹی میں مرتبہ گھٹ جاتا ہے۔ اردو کی ہر جس انداز سے

اُردو تعلیم کی بازگشت

مذاکرہ مرکزِ ادب

اردو تعلیم کی بازگشت نے اُردو تہذیب زبان وادب کا تحفظ ارتقاء و بقا کیلئے ایک ایسے وقت انقلاب بپا کر دیا ہے جب اُردو والوں کو ایوانِ حکومت کے پاسبانوں لسانی ہم آہنگی کے طرفداروں اور حکومت کی ادنیٰ سطح سے لیکر اعلیٰ سطح کے ذمہ داروں نے مایوسی کی آخری منزل پہ پہنچا دیا تھا ہر قوم جب وہ اپنے تہذیبی اقدار کے ٹوٹنے اور بکھیرنے سے مایوس ہو جاتی ہے تو انتہائی مایوسی بن کر سارے معاشرے کو اخلاقوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ اُردو گرامر کلاسس کے لیے ایک ایسا خاموش انقلاب لایا جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی کل تک جو لوگ اُردو کے بارے میں تحقیر آمیز رویہ رکھتے تھے آج وہی لوگ اپنے اسلاف کے ورثہ کے تحفظ کیلئے سرگرداں ہیں۔ اس نئی روشنی سے استفادہ حاصل نہ کرنا اپنی تہذیبی روایات سے مونہہ موڑ لیتا ہے ایسے بھی لوگ معاشرہ میں مل جائینگے جو اُردو زبان و تہذیب سے وابستگی کے باوجود انتشار ذہنی اور اپنی مجہول ذہن و فکر سے اُردو تہذیب کے لیے انگشت شستم بنے ہوئے ہیں اُردو زبان کا رشتہ تہذیب سے ہم آہنگ رہی لیکن ذہن و فکر کی کم تامی مجہول و مکروہ تفکر و خیال اور ذہنی معذوری تہذیبی ورثہ کو اپنے کم مائیگی اور نحوست زدہ حرکات و سکنات اور نقصان رسانی سے ہمکنار کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ ناپختہ انتشار پسند عناصر اردو زبان اُردو تہذیب اور اُردو اقدار کو نقصان پہنچانے کے درپے

ا کرتے ہیں یہ مجموعی تاثرات صاحب فکر اہل قلم و باذوق شرکائے محفل کا ہے جو مرکز ادب کے زیر اہتمام
ر جون کو ۷ بجے شام اردو تعلیم کی بازگشت کے مذاکرہ کے سلسلے میں رونما ہوا ڈاکٹر سید عبدالمنان
صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے صدارت کی مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب محمد اسحاق
ٹرار پرنسپل مفخم جاہ بی ایڈ کالج اور جناب غضنفر علی خاں جوائنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے
شرکت کی مذاکرہ میں مسز صلاح الدین نیر صادق نوید عائشہ بیگم ڈاکٹر انور قمر الدین صابری اور جناب
نصیر الدین نے بھی حصہ لیا ابتدا میں صدر ادارہ جناب عزیز بھارتی نے اردو تعلیم کی بازگشت کے زیر عنوان
ایک کلیدی نوٹ پیش کیا صدر جلسہ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے اردو تعلیم کے زیر عنوان ایک جامع اور
معلومات آفریں مضمون پیش کرنے کے علاوہ اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت کا تعاون ہمیں پوری طرح
حاصل نہیں ہے مسلسل توجہ دلانے کے بعد بھی بے شمار وسائل جوں کے توں ہیں اردو زبان اردو شعر و ادب
اور اردو تہذیب کا تحفظ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ کل تک اردو کے بارے میں گفتگو تک
کرنا نہیں چاہتے تھے وہ آج اپنے ورثہ کے تحفظ اور نئی نسل کی مناسب تربیت کے فکرمند ہیں ایسے
موضوعات جو معاشرہ کی شہرت کا کام دے رہے ہیں ان پر کچھ اداروں کی جانب سے مذاکروں
کا انعقاد نہایت کارآمد ثابت ہو رہا ہے مذاکرہ کے قابل توجہ موضوعات اہل فکر کی جدت طرازی کی
نشاندہی کرتے ہیں آج اردو زبان کے تحفظ کا تذکرہ اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے۔ جناب محمد
اسحاق نے اردو تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اردو والوں کی بے حسی
پر ضرب کاری لگاتے ہوئے کہا کہ اپنی زبان کی حفاظت اپنے ورثہ کا تحفظ ہوتا ہے انگلش میڈیم
ہر قسم کے اسکول اور سرکاری [illegible] نے اردو کے ساتھ خاطر خواہ انصاف نہیں کیا کس شعبہ کی
یہاں کمی رہ گئی اس پہلو پر توجہ درکار ہے جناب غضنفر علی خاں نے کہا اردو زبان ایک زندہ زبان ہے
دستور ہند کی تمام زبانوں میں اردو اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے اردو والے خود اپنی زبان کے
بارے میں بہت کم سنجیدہ ہیں لیکن اب حالات بدل چکے ہیں زبان و تہذیب کا تحفظ ضروری ہے
جناب صلاح الدین نیر نے کہا اردو تعلیم کی اس تازہ طاقتور لہر کو سرگرم عمل رکھنے کے لئے

عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کا ایک ثمر آور کارنامہ ہے بازگشت کا رجحان دراصل اس عظیم نقصان کا ایک بھرپور ردعمل ہے جو آزادی کے بعد سے مسلسل ناانصافی کا شکار ہوتا جارہا ہے اُردو والوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں ایک کامیاب اور زود اثر اقدام کیا ہے جناب صادق نوید نے کہا کہ بعض لوگ جو شعر و ادب کی دنیا سے وابستگی کی دعویدار ہیں ایسے خوشگوار ماحول میں سانس لینے کے بجائے ریشہ دوانیوں اور زنگ آلود مجنون مجہول و مطعون سرگرمیوں میں ملوث ہیں کوتاہ قامتی نامناسب تربیت اور بے چہرگی نے ایسے لوگوں کو ایک مستقل گھٹن میں مبتلا کر دیا ہے ایسے ہی لوگ اردو والوں میں دیگر اردو کے مختلف عوامل کا آلہ کار بن جاتے ہیں نائب صدر جناب قمرالدین صابری نے کہا کہ اُردو تعلیم کا سلسلہ گرامر اسکول تک محدود نہ رکھتے ہوئے ہمیشہ جاری رکھا جائے تو بہت بڑی خدمت ہوگی محترمہ عائشہ بیگم اور بشیر الدین نے جن کا تعلق پیشہ درس و تدریس سے ہے بہت سے مفید مشوروں سے نوازا ڈاکٹر انور نے سائنٹفک طریقے سے اُردو کے بقاء اور ارتقاء کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تعلیم میں تین پہلوؤں پر زور دیا جانا ضروری ہے (۱) روحانی (۲) دماغی (۳) جسمانی ـ روحانی پہلو انہوں نے کہا کہ دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم کا انتظام ہونا ـ دماغی تعلیم موجودہ سرکاری مدارس میں جو عصری تعلیم کا انتظام ہے اُس کے بجملہ انگریزی، ریاضی اور سائنس Tecnology تعلیم کا انتظام انگریزی زبان میں ہو اور تاریخ جغرافیہ و معاشیات وغیرہ کی تعلیم اُردو زبان میں ہو دینیات وغیرہ کی تعلیم عربی میں ہو اور اُن سب میں Audeo Visual Aids اور Computer وغیرہ جیسی جدید ایجادات سے استفادہ کیا جائے ـ

قمرالدین صابری نے مذاکرہ کی کاروائی چلائی مذاکرہ کے فوری بعد ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا پرنس معظم جاہ شجیع کی غزل کا مصرعہ

مجھ کو میری نظر سے چھپا کر تو دیکھئے

طرح کے طور پر دیا گیا تھا جناب صلاح الدین نیر رئیس اختر مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی ڈاکٹر علی احمد جلیلی صلاح الدین نیر رئیس اختر کے علاوہ پرنس شہابت جاہ (فرزند

پرنس معظم جاہ شجیع) صادق نوید عزیز بھارتی حسن فرخ مومن خاں شوق، قمرالدین صابری، ڈاکٹر حسن ساقی ایوبی، حبیب گونڈیاوی، نسیم اعجاز دل ہاشمی جلال بادشاہ جلال اور یوسف الدین یوسف نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی معتمد ادارہ جناب مومن خاں شوق نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی اور ڈاکٹر حسن نے شکریہ ادا کیا۔

سلسلہ ۴۹

مذاکرہ کے فوری بعد جناب صادق نوید کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ ہوا، جناب شفیع اقبال مہمانِ خصوصی تھے۔ صدر مشاعرہ جناب صادق نوید اور مہمانِ خصوصی شفیع اقبال کے علاوہ مسز صلاح الدین نیر، رئیس اختر، رحمٰن جامی، عزیز بھارتی، نہال سنگھ ورما، نانک سنگھ نشتر، مومن خاں شوق، منان منظور، قدیر انصاری، نسیم اعجاز نسیم، دل ہاشمی اور ڈاکٹر رشید الحسن رشید نے کلام سنایا اور داد و تحسین پائی۔ اس خوشگوار محفل کا اختتام جناب مومن خاں شوق کے شکریہ پر ہوا۔

سلسلہ ۳۷

ل پڑی ہے میں اسکا خیر مقدم کرتے ہوئے عابد مسلی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کو دل کی گہرائیوں لے ساتھ خراج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مذاکرہ کے بعد جنرل ریڈنگ روم اور لائبریری کا افتتاح محترمہ رجمند وہاب الدین نے کیا۔ جناب محمد قمرالدین صابری نے ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی۔ جناب ون خاں شوق نے محفل شعر کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جناب عزیز بھارتی کی صدارت محفل شعر منعقد کی گئی۔ صدر محفل جناب عزیز بھارتی مسز صلاح الدین نیر عائشہ بیگم رباب ننخاں شوق، قمرالدین صابری اور نسیم اعجاز نسیم نے اپنا کلام سنایا۔ جناب مومن خان شوق شکریہ ادا کیا۔

ستاروں سے آگے

مذاکرہ میرا شہر میرے لوگ

محدود فکر و خیال ارتقاء کی راہوں کے لیے پا بہ زنجیر بن جاتے ہیں مسلسل سفر زندگی کی علامت ہے فکر و خیال کی تھکن پاک و صاف راستوں کو بھی پابندی بنا دیتی ہے جذبہ عشق ہر ایک حد اخر کو کاٹ کر آگے نکل جاتا ہے ارتقاء پسندی انسان کی فطرت ہے تلاش کی کوئی منزل نہیں ہوتی جستجو ایک مسلسل عمل ہے جو حیات کی رگوں میں خون گرم کی طرح رواں رہتی ہے علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ عشق میں فکر کو محدود نہیں کیا۔ عشق فردی ہے زمین کی بندشوں میں جکڑا ہوا انسان فکر و خیال کی طاقت کو کمزور بنا دیتا ہے ہمارے حلقہ محدود ذہن و فکر دائروں میں پھنسے رہتے ارتقائی قوت سلب ہو کر رہ جاتی ہے تخلیق اچھا عمل ہے لیکن اجتہاد بھی فردی ہے یہ اجتماعی تاثرات حاشیہ شعر و ادب کا ہے جنہوں نے ادارہ میرا شہر میرے لوگ کے زیر اہتمام منعقدہ "ستاروں سے آگے" کے زیر عنوان مذاکرہ میں پیش کیا۔ یہ مذاکرہ ۹ جون کی شام ۷ بجے مکتبہ شاداب ریڈ ہلز میں زیر صدارت جناب خلیل الرحمٰن سابق ایم پی منعقد ہوا جس کا اہتمام ادارہ میرا شہر میرے لوگ نے کیا تھا۔

مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر احمد اللہ خاں شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر صادق نقوی صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ جناب ہاشم سعید پرنسپل کالج آف لینگویجس نے شرکت کی۔

ذاکرہ کے فوری بعد جناب مانک سنگھ نشتر کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مسز حسن فروغ اور
سوز عابدی نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی مذاکرہ میں مسز رئیس اختر، صادق نوید
صلاح الدین نیر، عزیز عبدالرازق اور قمرالدین صابری نے بھی حصہ لیا۔ ابتداً میں جنرل سکریٹری
ادارہ میر اشفاق میر سعد اللہ جناب صلاح الدین نیر نے ادارہ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ
مختلف موضوعات پر مذاکرہ کے انعقاد نے شعری و ادبی محفلوں کی سرگرمیوں کو اور خوشگوار بنا دیا
ہے زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے مسائل کے علاوہ شعروادب کے ہر موضوع پر کامیاب
مذاکروں نے دانشوران شعراء ادب کو سرگرم عمل رکھنا ہے انہوں نے عنوان پر کلیدی نوٹ کے تعلق
میں اظہار خیال کرنے سے قبل خیر مقدمی اور تعارفی تقریر کی۔ جناب رئیس اختر نے کہا کہ اقبال کا
پیام ساری کائنات کے لیے ایک مستقل پہلو ہے۔ جس کی روشنی میں بڑے بڑے دانشوروں نے
اپنے فکروتفکر کو وسعت دی ہے صدر جلسہ جناب خلیل الرحمٰن نے کہا کہ تھک کے بیٹھ جانا شکست کی علامت ہے
علامت ہے اقبال نے معاشرہ میں اپنے کلام کے ذریعہ ایک ہلچل پیدا کی ہے علامہ اقبال
کی تمام شاعری قرآن مجید اور احادیث کی تفسیر ہے اقبال نے انسان کو فکروخیال کی بلندیوں تک
پہنچایا لیکن ہمارے معاشرہ میں محدود زاویہ نگاہ رکھنے والے لوگ اپنی حیثیت کو گمراہ کن
عمل سے وابستہ کرتے ہوئے ذہنی مقصد و مجہول کا پرواز وں غیر تربیت یافتہ کارندوں کی
ہر شعبہ حیات کے ہر گوشہ کو مسموم کرنے کے علاوہ تہذیبی اقدار کو پامال کر رہے ہیں شعروادب
کی سرگرمیاں بعض کم قامت عناصر کی مجہول طرز فکر کی وجہ سے پراگندہ ہوتی جارہی ہیں جناب
خلیل الرحمٰن سابق ایم پی نے اس قسم کے مذاکروں کی اہمیتوں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ مختلف
موضوع کے مذاکروں نے فکروخیال کو تازگی بخشتے ہوئے تعلیمی پلیٹ فارم بنا دیا ہے
پروفیسر حمد اللہ خان نے کہا کہ علامہ اقبال پیدائشی مفکر تھے اقبال نے اپنے فلسفۂ عشق
اور فکروخیال کی بلندی کو آسمانوں سے آگے کی منزلوں سے روشناس کرایا۔ اقبال کا
فلسفۂ عشق ہر شعبہ حیات میں حاوی کرنے میں اقبال کی نظر میں آسمانوں سے آگے بھی دیکھنا

چاہتی تھی ستاروں سے آگے کیا کچھ نہیں ہے اقبال انسان کو روشنی کی آخری منزل تک لے جانا چاہتے ہیں فکر کی افادیت ہر تجربات میں رچ بس گئی ہے فطری طور پر ہر انسان ارتقاء پسند ہے اقبال ایسے انسانوں کو پسند کرتے تھے جو تلاش کی منزلوں آخر پر بھی دم نہیں لیتے ڈاکٹر صادق نقوی نے کہا کہ فکر کے ارتقاء کی منزل نہیں ہوتی زمانے کو کاٹ کر آگے بڑھنا زندگی کا منصب ہے تلاش کی کوئی منزل نہیں ہوتی جستجو قوموں کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑا دیتی ہے عشق میں واسطے نہیں ہوتے منزل بھی نہیں ہوتی ازل سے ابد تک سفر ہی سفر ہے ارتقاء کے لئے عشق فرمائی ہے جناب ہاشم سعید نے کہا کہ ہم چند محدود حلقوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں ہمارے حلقے کم علمی اور تنگ دامنی کا شکار ہو گئے ہیں آج کا معاشرہ انتشار کا مجموعہ ہے ہر ایک کو نجات دہندہ سمجھنا اپنی انفرادیت اور عزت نفس پر ضرب لگانا ہے معاشرہ سے کئے ہوئے ناپسندیدہ اور رد کردہ افراد اپنی فطرت کی ناہمواری کی وجہ سے کم قامتی کے باوجود قامت کے لوگوں کا قد ناپنے میں مصروف ہیں ایسے شکست کردہ معاشرہ کی نظروں سے گرے ہوئے لوگ گھٹن اور انتشار ذہنی میں مبتلا رہتے ہیں جناب صادق نوید نے کہا کہ اعلیٰ محفلوں معقولیت پسندوں اور سنجیدہ اور باہنر لوگوں میں نشست و برخاست سے ذہن وخیال کی آلودگی دور ہو جاتی ہے جناب عزیز بھارتی نے کہا کہ اقبال نے ہر منزل کو پہلا قدم کہا ہے ارتقاء انسان کی جبلت ہے ۔ جناب قمر الدین صابری نے کہا کہ اقبال نے ساری انسانیت کیلئے محبت کا پیام دیا ہے مذاکرے کے بعد جناب نانک سنگھ نشتر کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ جناب نانک سنگھ نشتر کے علاوہ مسرز صلاح الدین نیر رئیس اختر ڈاکٹر صادق نقوی صادق نوید عزیز بھارتی حسن فرخ سوز عابدی منان منظور گیان سنگھ شاطر قمر الدین صابری ڈاکٹر حسین نسیم اعجاز یوسف الدین اور دل ہاشمی نے کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی جناب رئیس اختر نے ادبی اجلاس و مشاعرہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

سول سروسیز امتحان

پورے ملک سے ۷۸۹ کامیاب، مسلم امیدوار صرف ۲۰ کامیاب

مدینہ آئی اے ایس اسٹیڈی سرکل کے طالب علم خواجہ محمد رضی الدین ہندوستان کے ان ۲۰ خوش نصیب امیدواروں میں شامل ہیں، جنہوں نے سیول سرویسز کے امتحان کے بعد پرسنالٹی ٹسٹ میں کامیابی حاصل کی۔ اور میرٹ کی اساس پر جنکے آئی، اے ایس، آئی پی یس، آئی آر ایس میں کسی ایک سرویس کے تقرر کی سفارش کی گئی۔ خواجہ محمد رضی الدین جناب کے ایم عارف الدین سکریٹری مدینہ گروپ آف ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹس کے فرزند ہیں۔ انہوں نے سینٹ پال اسکول سے میٹرک اور نظام کالج سے بی ایس سی امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا، انہیں عثمانیہ یونیورسٹی میں بی ای سیول میں داخلہ ملا تھا۔ تاہم انہوں نے ایم بی اے میں داخلہ کو ترجیح دی اور ۱۹۹۲ء میں ایم بی اے امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ وہ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ایم اے ماس کمیونیکیشن کے طالب علم ہیں۔ کے ایم رضی الدین کا تعلیمی کیریر ابتداء میں شاندار رہا ہے۔ وہ ایک بہترین فلسفہ اور مقرر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد جناب کے ایم عارف الدین کی زیر نگرانی خصوصی تربیت حاصل کی۔ یاد رہے کہ مدینہ آئی اے ایس اسٹیڈی سرکل سے اس سال تین طلباء نے سیول سرویسز کے مین امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ تاہم پرسنالٹی ٹسٹ میں کے ایم رضی الدین نے کامیابی حاصل کی۔ ملک بھر سے ۷۸۹ امیدوار کامیاب ہوئے ہیں، جن میں ۲۰ مسلم امیدوار ہیں۔ آندھرا پردیش سے صرف دو مسلم امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ جبکہ کے ایم رضی الدین علاقہ تلنگانہ سے کامیاب ہونے والے واحد مسلم امیدوار ہیں۔ آئی اے ایس اور اسی زمرہ سے تعلق رکھنے والے یونین سیول سرویس کے دوسرے مسابقتی امتحانات منعقدہ ڈسمبر ۱۹۹۳ء ۱۹۹۴ء کے کامیاب ۷۸۹ امیدواروں کی فہرست آج شائع کر دی گئی ہے۔ جس میں صرف ۲۰ مسلم امیدوار

شامل ہے۔ جنکی کامیابی کا تناسب صرف ڈھائی فیصد ہے، جبکہ اس فہرست میں درج فہرست اقوام سے تعلق رکھنے والے ۱۵۲ اور درج فہرست قبائل سے تعلق رکھنے والے ۷۹ امیدوار شامل ہیں۔ جنکا تناسب لگ بھگ ۲۰ فیصد ہوتا ہے۔ یہ تناسب درج فہرست اقوام و قبائل کے امیدواروں کو حاصل تحفظات کا نتیجہ ہے۔ یونین پبلک سروس کمیشن کی جانب آئی اے ایس، آئی ایف ایس، آئی پی ایس، پولیس سروس گروپ بی، ''سنٹرل سروس گروپ A سنٹرل سروسیس گروپ A اور B کے ۸۹۷ امیدواروں کی یہ فہرست الترتیب بہ لحاظ میرٹ جاری کی گئی ہے۔ یہ فہرست الترتیب بہ لحاظ میرٹ جاری کی گئی ہے۔ یہ امیدوار متذکرہ خدمات کے لیے تقررات کے اہل ہیں۔ لیکن تقررات مخلوعہ جائیدادوں کی تعداد کے مطابق عمل میں آتے رہینگے۔ ۲۰ کامیاب مسلم امیدواروں میں سرفہرست پہلے امیدوار کا نمبر بہ لحاظ میرٹ ۲۳۶ واں ہے، ابتدائی ۱۰۰ امیدواروں میں صرف ۲ مسلم امیدوار شامل ہیں۔ اس وقت مخلوعہ جائیدادوں کی تعداد ۱۸۰ ہے۔ جن میں یہ بہ لحاظ میرٹ تقررات کی صورت میں صرف ایک مسلم امیدوار کا تقرر ہو سکے گا۔ گذرے ہوئے کئی برسوں میں بھی ملک کی اعلیٰ ترین انتظامی خدمات سے متعلق ان مسابقتی امتحانات میں کامیاب مسلم امیدواروں کا تناسب ۲ تا ۳ فیصد ہی رہا ہے۔ مرکزی حکومت کی جانب سے اقلیتی امیدواروں کی کوچنگ کی اسکیموں اور بعض خانگی ذرائع سے بھی کوچنگ کے انتظام کے باوجود بھی یہ افسوسناک صورت حال پائی جاتی ہے۔ جسکی وجہ سے مرکزی حکومت کی ان اعلیٰ خدمات میں مسلم اقلیت سے تعلق رکھنے والوں کا تناسب گھٹ کر ۲ تا ۳ فیصد کے آس پاس ہی رہ گیا ہے کیونکہ جس زمانہ میں یہ تناسب نمایاں طور پر بہتر ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ کے تقرر شدہ تقریباً تمام عہدہ دار وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔

زمین اپنی قدم اوروں کے

مرکز ادب کا مذاکرہ

"زمین اپنی قدم اوروں کے" ان استحصال کرنے والی طاقتوں کے خلاف ایک بھرپور احتجاج کا موضوع ہے جس پر ایک تحریک کی شکل میں خامہ فرسائی کی ضرورت ہے ایسے لوگ یقیناً قابل احترام لائق ستائش ہیں جنہوں نے سرزمین دکن خاص طور پر حیدرآباد کو نہ صرف اپنا وطن بنا لیا بلکہ یہاں کی مٹی کی خوشبو سے پیراہن حیات کو معطر کیا لیکن ایسے لوگ جو ہر شعبۂ حیات میں حیدرآبادیوں، رواداری، عزت نفس اور ان کی تہذیبی روایات کو نظرانداز کیا وہ قابل بازپرس ہیں۔

ہم اپنے وطن کے تحفظ اور عزت نفس کی بقا کے لئے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ ہنرمندوں اور صلاحیت لوگوں کے مقابلے ہر اعتبار سے کم حیثیت رکھنے والوں کو بڑھاوا دینے کے رجحان کو ختم کیا جانا چاہیے۔ ہر شعبۂ حیات میں مستحق لوگوں کے حقوق کی پامالی نہ ہونے پائے۔ کچھ لوگ اپنی زمین کچھ نہ پانے کی کمی کو [illegible] آکر پورا کرتے ہیں۔ وہ [illegible] اپنی پہچان کے لیے وہ تمام [illegible] [illegible]

[illegible]

نے کی۔ مسرز نہپال سنگھ ورما اور نانک سنگھ نشتر مہمانانِ خصوصی تھے۔ مسرز صلاح الدین نیر، ر
رحمٰن جامی، صادق نوید اور عزیز بھارتی نے مذاکرہ میں حصہ لیا۔ معتمدِ عمومی مرکز ادب جناب
مومن خاں شوق نے اپنے کلیدی نوٹ میں کہا کہ استحصال کے خلاف بھرپور احتجاج کی ضرورت
ہے۔ حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کو ان کا اپنا مستحق مقام ملنا چاہئے۔ جناب مومن خاں
نے ادبی اجلاس و مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔ جناب عزیز بھارتی نے خیرمقدمی و تعارفی تقریر
کہا کہ ہمارے مختلف موضوعات پر مذاکرے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ صدر جلسہ جناب
خلیل الرحمٰن نے کہا کہ یہ کسقدر افسوس کی بات ہے کہ باہر کے لوگوں کو نوازے جانے کا سلسلہ بڑھ
ہی جارہا ہے۔ خاص طور پر باہر کے اہلِ قلم کی جتنی پذیرائی ہر سطح پر حیدرآباد میں کی جاتی ہے
کے کسی حصے میں نہیں کی جاتی۔ اپنی پہچان برقرار رکھنے کے لیے باہر کے لوگ نت نئے ہتھکنڈے
استعمال کرتے ہیں۔ میں نے پارلیمنٹ میں سخت احتجاج کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہما
حیدرآبادی شاعروں کو کل ہند سطح پر خاطر خواہ پذیرائی کیوں نہیں کی جاتی۔ ملک بھر میں
والے دور درشن کے مشاعروں میں کل ہند مشاعروں میں حیدرآبادیوں کو عملاً مستقلاً نظرانداز
کیا جاتا ہے۔ دراصل ہم لوگوں نے خود اپنے اہلِ قلم احباب کی قدر دانی میں کمی کی ہے۔ جناب
نانک نشتر نے کہا کہ ہمارے اسلاف نظام حیدرآباد کی خواہش پر دو سو سال پہلے حیدرآباد
آئے تھے۔ ہماری تمام نسلیں سرزمین دکن کی خوشبو میں رچ بس گئی ہیں۔ پنجابی ہماری مادری
زبان ہے لیکن میں اردو لکھتا پڑھتا اور بولتا ہوں اور میں اردو کے ذریعہ اپنی پہچان
رکھنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کے خلاف میرا سخت احتجاج ہے جو یہاں کی مٹی کی سوندھی سوندھی
خوشبو سے معطر ہونے کے باوجود احساسِ برتری کا شکار ہیں اور ہماری زمین پر قدم جمائے
ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ معاشرہ کی ہر سطح پر اپنی بلند قامتی کا احساس دلاتے ہوئے حیدرآباد
کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ جناب نہپال سنگھ ورما نے کہا کہ حیدرآباد کے لوگوں کے لیے ناانصافی کوئی
بات نہیں ہے۔ ہماری تہذیب و روایات کے تحفظ کے لیے ہمیں جدوجہد کرنا ہے۔ شوداب

پر سارے ملک میں کیسے کیسے لوگ نمایاں ہو رہے ہیں۔ عزت نفس با ہر خوب بکنے لگی
۔ ایسے حالات میں ایک ادبی و تہذیبی بیداری کی ضرورت ہے۔ جناب رحمن جامی
کا "زمین اپنی قدم اوروں کے" کی ایک روشن مثال حیدرآباد کے وہ پروگرام کا ایک شاعر
۲ عالیہ مشاعرہ ہے جس میں تقریباً ایک ... حیدرآباد کے شعراء کو
دیا اس سے بڑھ کر حیدرآبادیوں کی اہانت کیا ہو سکتی ہے۔ اس حرکت سے
ر حیدرآبادی روایات کو دھکا پہنچایا ہے غور کیا جا سکتا ہے۔ ہم حیدرآبادی مسلسل نظر انداز
ہے ہیں۔ عزت نفس کی بقا کا مسئلہ الجھتا جا رہا ہے۔ اگر حیدرآباد کے با اثر لوگ ایسے
ر پر خلوص توجہ دیں تو کوئی الجھن باقی نہیں رہے گی۔ جناب صلاح الدین نیر نے کہا کہ ہر
لیے عزت نفس کا مسئلہ قدم قدم پر درپیش ہوتا ہے۔ اپنی خود داری اپنی
ت اور عزت نفس کے لیے جدوجہد جاری رکھنا زندگی کی علامت ہے۔ حیدرآباد اتنا
ہے کہ ہر مستحق و غیر مستحق کی جھولیاں بھر دیتا ہے۔ لیکن بعض احسان فراموش نے ہماری
ت و رواداری کو ہماری کمزوری سمجھا۔ جو لوگ ہمارے دریا دلوں ہماری محفلوں سے اپنی
سے ... احسان فراموشی کا ثبوت دیتے
تحریکی اور تقریبات ... کا خیال نہ کیا۔ جناب ... نے کہا
واداری نے ... نقصان پہنچایا ... میں ...
ے ... قابل لوگ ... ہیں ہر ... کو
... ہمارے علمی و ادبی ...
ہے ... تہذیبی ... کے لیے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ہماری ...
کی ... کہ ہم ... برتری کو ... ہیں۔ ...
سب سے اہم مسئلہ اپنی شناخت کا ہے زندگی کے ... نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے
تلاش ... ۱۹۸۰ ...

مرکز ادب کے طرحی مشاعرہ

۸ جولائی ۱۹۹۴ء

کی غزلیات

مصرعِ طرح : مجھ کو مری نظر سے چھپا کر تو دیکھئے

غزل

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

جینے کا یہ فریب سہی کھا کر تو دیکھئے
بربادیوں کا جشن منا کر تو دیکھئے

چھن جائیں گی نقاب سے نظریں جمال کی
پردہ نظر کا آپ اٹھا کر تو دیکھئے

موسم بدل نہ جائے تو پھر ہم سے پوچھئے
ہاتھوں میں اپنے جام اٹھا کر تو دیکھئے

پھر کیجیے گا جشن چراغاں کا اہتمام
پہلے نصیب دل کے جگا کر تو دیکھئے

ہوتا ہے رقص آبلہ پائی کا کس طرح
راہوں میں اپنے خود کو بچھا کر تو دیکھئے

اسرار عشق کا کہ نظارہ ہو دور سے
دل کا یہ ضد کہ ہاتھ لگا کر تو دیکھئے

کرتا ہے صید طائر معنی کو اے علی
فکر و نظر کے دام بچھا کر تو دیکھئے

صلاح الدین نیر

غزل

یہ زخم زخم لوگ بلا کر تو دیکھئے
ایسا بھی ایک جشن منا کر تو دیکھئے

ہم آپ کی نظر سے کہاں آتی دنیا
ہم کو کبھی زمیں پہ آ کر تو دیکھئے

اب آپ اپنی ساری عدالت کے باوجود
بیمار باپ ہے ذرا جا کر تو دیکھئے

کس کس کی ہیں دعا کا اثر ہوں میں جانئے
میرے غریب خانے میں آ کر تو دیکھئے

غدارِ قوم کون محبِ وطن ہے کون
آواز اپنے گھر سے لگا کر تو دیکھئے

کچھ اور بھی ہے خونِ شہیداں کی تازگی
خاکِ وطن کو ہاتھ لگا کر تو دیکھئے

بھر جائیں گی [illegible] جھولیاں
صرف ایک بار ہاتھ اٹھا کر تو دیکھئے

نیر یہ وہ اپنا دوست ہے سمجھا ہو گا اسے
اک بار اس سے ہاتھ ملا کر تو دیکھئے

غزل

عزیز بھارتی

یہ نفرتوں کی دھوپ میں آ کر تو دیکھئے
مفہوم زندگی کو نبھا کر تو دیکھئے

پھر آئینہ [illegible]
میری نظر میں آپ سما کر تو دیکھئے

بکھرے [illegible]
دل کی زمیں پہ غم کو اگا کر تو دیکھئے

اک عمر بیت جائے گی خود کو [illegible]
اس شہرِ سنگ میں کبھی پیار تو دیکھئے

[illegible] ابھی کی وقت کی آئینہ صفات
احساس پتھروں کو دلا کر تو دیکھئے

[illegible]
دنیا کی سمت ہاتھ بڑھا کر تو دیکھئے

[illegible] زندگی [illegible]
اب وقت کے [illegible] اٹھا کر تو دیکھئے

غزل

رئیس اختر

میری طرف بھی آنکھ اٹھا کر تو دیکھیے
ذرہ کو آفتاب بنا کر تو دیکھیے

ابر کرم کو بھی چمن پہ [illegible] کر تو دیکھیے
لیکن وفا کے ہاتھ اٹھا کر تو دیکھیے

آنکھوں پہ خود بٹھائے گی دنیا یہ ایک دن
اپنی نظر سے اس کو گرا کر تو دیکھیے

[illegible]
[illegible] دوستوں سے ہاتھ ملا کر تو دیکھیے

تازہ ہوا میں سانس جو لینا ہو آپ کو
دیوار نفرتوں کی گرا کر تو دیکھیے

ظلمت کی بات ہی آپ سمٹ جائیگی جناب
[illegible] کی شمع جلا کر تو دیکھیے

[illegible]
[illegible]

صادق نوید

غزل

دستِ ہنر کو کام میں لا کر تو دیکھئے　　بنجر زمیں میں فصل اُگا کر تو دیکھئے
احساس کے چراغ جلا کر تو دیکھئے　　جانِ غزل سے ہاتھ ملا کر تو دیکھئے
آنگن میں گھر کے آگ لگا کر تو دیکھئے　　شعلوں کی زد سے خود کو بچا کر تو دیکھئے
آئینہ اپنے سامنے لا کر تو دیکھئے　　بے پیرہن کا داغ مٹا کر تو دیکھئے
جن حادثوں سے اپنا سدا واسطہ رہا　　اُن حادثوں سے آنکھ ملا کر تو دیکھئے
لہجے کی تازگی سے مہک جائے گی فضا　　طرزِ ادا کے پھول کھلا کر تو دیکھئے
گر ہو سکے تو ڈھونڈ کے لے آئیے نوید　　اک بار ہم کو ہم سے ملا کر تو دیکھئے

غزل

مومن خاں شوقؔ

یہ بزمِ ناز ہے کبھی آ کر تو دیکھئے　　نغمے محبتوں کے سنا کر تو دیکھئے
دل میں جو بات ہے اُسے ہونٹوں پہ لائیے　　ہم کو شریکِ راز بنا کر تو دیکھئے
نزدیک جا کے عیب نظر آئیں گے ہنر　　آئینہ آج خود کو دکھا کر تو دیکھئے
ظاہر ہوں گی میری [illegible] خامیاں　　مجھ کو مری نظر سے چھپا کر تو دیکھئے
خوش رنگ زندگی [illegible]　　اک شخص آئینہ [illegible] تو دیکھئے
جھک جائے گا [illegible] شرط ہے شوقؔ
اپنا سرِ نیاز جھکا کر تو دیکھئے

غزل

حبیب گوندیاوی

جلتا ہوا چراغ بجھا کر تو دیکھیے
ہوتا ہے کیا کسی کو مٹا کر تو دیکھیے

آجائے گی حیات کے پہلو میں روشنی
مشکل سہی خوشی کو منا کر تو دیکھیے

ہوجائے گا مقام مرا آپ پر عیاں
"مجھکو مری نظر سے چھپا کر تو دیکھیے"

جو حشر ہوگا' ہوگا دل بیقرار کا
اک بار اُن کے سامنے جا کر تو دیکھیے

اس روشنی سے اچھی کوئی روشنی نہیں
اُلفت کی شمع دل میں جلا کر تو دیکھیے

ممکن ہے دوستی میں بدل جائے دشمنی
دستِ خلوص اپنا بڑھا کر تو دیکھیے

تدبیر کہہ رہی ہے حبیب آج تک یہی
بن جائے گا نصیب' بنا کر تو دیکھیے

غزل

عزیز ناگپوری

ایک بار میرے روبرو آکر تو دیکھیے
آنکھوں سے میری آنکھیں ملا کر تو دیکھیے

اُلفت سے نفرتوں کو مٹا کر تو دیکھیے
بڑھ کر عدو سے ہاتھ ملا کر تو دیکھیے

ہرگز نہ جاسکیں گے مرے دل سے اٹھ کر
اک بار میرے دل میں سما کر تو دیکھیے

کب سے کھڑا ہوں آپ کے دیدار کیلئے
رُخ سے ذرا نقاب اٹھا کر تو دیکھیے

شرمائے گا یہ آئینہ اک شرط پر مگر
آنکھوں کو اپنے غم سے سجا کر تو دیکھیے

ہے زندگی کتنا حسین یہ چل جائیگا پتہ
حق کی صدا کو آپ دبا کر تو دیکھیے

وحشت سے روز کہتے ہیں ہم آپ کو عزیز
غم کو کبھی گلے سے لگا کر تو دیکھیے

غزل

اکٹر سید حسن

بسیوں کو دل سے ہٹا کر تو دیکھئے　　　پھر زندگی سے ہاتھ ملا کر تو دیکھئے
ہ دشتِ یاس میں نکل آئے گی کوئی راہ　　　اُمید کا چراغ جلا کر تو دیکھئے
ں میں ہو گی آپ کے دنیا کی ہر خوشی　　　دُنیا کے غم کو اپنا بنا کر تو دیکھئے
ِ فکر کتنی بلندی پہ جائے گی　　　شعر و سخن میں ذہن لگا کر تو دیکھئے
یا مختصر ہے کہ ملے پھر وہی جواب　　　پھر حال اپنا اُن کو سُنا کر تو دیکھئے
اک ورق میں اُبھر رہا ہے خیال　　　حرفِ غلط سمجھ کے مٹا کر تو دیکھئے
رہو جو قافیہ پیمائی اے حسنؔ　　　فہرست قافیوں کی بنا کر تو دیکھئے

غزل

نسیم اعجاز نسیم

ں کی وسعتوں کو بڑھا کر تو دیکھئے　　　"مجھ کو مری نظر سے چھپا کر تو دیکھئے"
ں میں کتنے ہو گئی تقسیم زندگی　　　تصویر زندگی کی اُٹھا کر تو دیکھئے
کیا رہے گا بھلا آپ کے بغیر　　　منظر سے خود کو آپ ہٹا کر تو دیکھئے
وار جائیں گے بھلے موت کو　　　اک شمع زندگانی جلا کر تو دیکھئے

روٹھے ہوئے ہیں وہ تو منا لیجئے نسیمؔ
شاید وہ مان جائیں سُنا کر تو دیکھئے

جولائی ۱۹۹۰ء

غزل

قمر جابری

انسانیت کو کام میں لاکر تو دیکھئے
ادروں کی زندگی کو بناکر تو دیکھئے

آئینہ اپنے حسنِ عمل کا ہو سامنے
پھر صورتِ حیات دکھاکر تو دیکھئے

سب کی ڈگر سے ہٹ کے ہے رستہ عجیب یہ
اِس راستہ پہ آپ بھی آکر تو دیکھئے

حق بات ہے وہ راستہ دکھلائے حق کا جو
ایسی کبھی کوئی بات سمجھا کر تو دیکھئے

پھر دیکھئے حیات نکھرتی ہے کس طرح
سامان زندگی کا سجا کر تو دیکھئے

راحت سکون چین ملے گا قمر یہاں
زلفوں کو اپنی رات بناکر تو دیکھئے

ٹھنڈک قمر کی اور خنک روشنی بھی ہے
منزل میں میری آپ بھی آکر تو دیکھئے

غزل

دِل ہاشمی

تجھ کو مری نظر سے چھپا کر تو دیکھئے
اک اجنبی کو اپنا بنا کر تو دیکھئے

عالی جناب ہم کو بُلاکر تو دیکھئے
محفل کو اپنی یوں بھی سجا کر تو دیکھئے

کس کا قصور کتنا ہے سب یاد آئے گا
آئینہ مجھ کو اپنا بنا کر تو دیکھئے

کس بات کی جھجک ہے ملاقات میں بھلا
مانا کہ ہم خفا ہیں منا کر تو دیکھئے

پڑھنا اگر ہے آپ کو بھی داستانِ غم
[illegible]

اگست ۱۹۹۴ء

سیرت النبیؐ نمبر

جلد: ۱۱ شمارہ: ۸

قیمت: ۲۰ روپے

ماہنامہ شاداب

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر: مومن خاں شوق، رشید الدین

حیدرآباد

منیجنگ ایڈیٹر: محمد نہال احمد صدیقی

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	۲۰۰	۳۶۰	۴۲۰۰
امریکہ	۴۰ ڈالر	۷۰ ڈالر	۷۰۰ ڈالر
انگلستان	۲۵ پونڈ	۴۵ پونڈ	۴۰۰ پونڈ
پاکستان	۱۷۵ پاکستانی روپے	۳۰۰ روپے	۳۰۰۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ "شاداب" ۱۴۲-۵-۱۱ ریڈ ہلز - حیدرآباد - ۴

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپواکر دفتر "شاداب" ۱۴۲-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

نعتِ شریف

آپ کا جس میں میسر مجھے دیدار نہیں
میرے سرکارؐ وہ جنت مجھے درکار نہیں

حاضری میری ہے دشوار بہت میرے لئے
آپؐ چاہیں تو یہ آسان ہے دشوار نہیں

اب تو لے دے کے فقط جان ہے وہ بھی ایسی
آپ کی نذر کے لائق تو یہ سرکارؐ نہیں

جب سے دیکھا ہے وہ گلزارِ مدینہ میں نے
میری آنکھوں میں تو جچتا کوئی گلزار نہیں

چاہتے ہیں جسے دیدار دکھا دیتے ہیں
روک سکتے وہ کرم یہ درو دیوار نہیں

آج بھی اُن کے اشاروں پہ عمل ہوتا ہے
کون کہتا ہے کہ سرکارؐ کی سرکار نہیں

یوں پڑا رہتا ہے بے فکر درِ اقدس پر
جیسے مرزاؔ کا جہاں میں کوئی دربار نہیں

مرزا شکور بیگ مرزاؔ

نعتِ شریف

تخلیق کائنات کا عنوان تمہیں تو ہو
صبحِ ضیا نسیمِ بہاراں تمہیں تو ہو

تم سے ہے دل میں زینت ایماں و آگہی
روشن ہے جس سے مشعلِ عرفاں تمہیں تو ہو

سر پر تمہارے تاج شفاعت ہو پُر ضیاء
روزِ جزا کے شافعِ عصیاں تمہیں تو ہو

مالک سے اُس کے بندوں کو تحفہ ملا دیا
انسانیت پہ جس کا ہے احسان تمہیں تو ہو

فاتح تھے پھر بھی کر دیا ہر ظلم کو معاف
فتحِ مبین کے یوسفِ کنعاں تمہیں تو ہو

مسعود بھی تمہارا اک ادنیٰ غلام ہے
مسعود کا وسیلہ و ایماں تمہیں تو ہو

(الحاج حافظ محمد مسعود صدیقی مسعود)

نعتِ شریف

ذکرِ خدا میں ذکرِ رسولِؐ آنام ہے
نامِ خدا کے ساتھ محمدؐ کا نام ہے

بھیجے خدا اور اس کے فرشتے جنہیں سلام
اُس ذات کا بتاؤ ذرا کیا مقام ہے

لاکھوں بیان کر چکے سیرت رسولؐ کی
لیکن ابھی ادھوری ہے اور نا تمام ہے

معراج میں تمام نبی مقتدی بنے
ہے مقتدا، جو سارے جہاں کا امام ہے

اللہ نے تم کو رحمتِ للعالمین کہا
رحمت تمہاری خلقِ خدا پر دوام ہے

قرآن ہے حضورؐ کا اک معجزہ بڑا
جس میں خدا کا ایک مکمل نظام ہے

ہادیؔ پہ اک نگاہِ کرم حسنِ مرحمت
یہ بھی تمہارے در کا گدا اور غلام ہے

(ہادی حیدرآبادی)

نعتِ شریف

کرمِ نبیؐ کا بہت کچھ ہے چشمِ تر کے لیئے
بہت ہے خاکِ مدینہ مری نظر کے لیئے

نظر میں گنبدِ خضرا ہے دل میں یادِ رسولؐ
یہی ہے زادِ سفر، آخری سفر کے لیئے

بہت زیادہ نہیں تھوڑی سی جگہ دیجے
رہوں گا آپؐ کے قدموں میں عمر بھر کے لیئے

نبیؐ کی یاد کے دل میں چراغ روشن ہیں
یہ روشنی ہی بہت ہے ہمارے گھر کے لیئے

تمام عمر میں لپٹا رہوں گا دامن سے
یہ آرزو ہے بڑی عمرِ مختصر کے لیئے

اُجالے رات کے دامن میں پھیل جائیں گے
نبیؐ کا نام تو لیجئے نئی سحر کے لیئے

شمار اپنا بھی نیئر ہے یکہ تکا ہوں میں
ملی ہے ہم کو بھی دستار اپنے سر کے لیئے

صلاح الدین نیّر

نعتِ شریف

عاصیوں کا سہارا حضورؐ آپ ہیں
ڈوبتے کا کنارا حضورؐ آپ ہیں

سو نظارے نظر میں سمائے مگر
دل نشیں اک نظارا حضورؐ آپ ہیں

ظلمتیں آپ ہی آپ گھٹنے لگیں
ایسا روشن مینارہ حضورؐ آپ ہیں

لاکھ بھٹکیں گناہوں کے جنگل میں ہم
رحمتوں کا اشارا حضورؐ آپ ہیں

کیوں نہ ہم شوق سے نام لیں آپؐ کا
جان اور دل. ہمارا حضورؐ آپؐ ہیں

مومن خان شوق

نعتِ شریف

بحرِ کرم ہیں چشمۂ جود و سخا ہیں آپؐ
اُمید اور یقین سے بھی ماورا ہیں آپؐ

محبوبِ ذوالجلالؐ شہِ انبیاءؐ ہیں آپؐ
خیرالبشرؐ حبیبِ خدا مصطفیٰؐ ہیں آپؐ

دنیا کو جس نے راہِ صداقت دکھائی ہے
ہادی وہی ہیں آپؐ وہی رہنما ہیں آپؐ

سایہ زمین پر نہ پڑا آپؐ کا کبھی
ثابت اسی سے ہوگیا نورِ خدا ہیں آپ

اُمت کو اپنی خُلد میں لے جائیں گے ضرور
محشر میں ہر بشر کے لئے پیشوا ہیں آپؐ

ادنیٰ غلام آپ کا ہے اُمتی مشفق
بخشش کرائیں اُس کی شفیع الوریٰ ہیں آپؐ

مشفق اقبال

نعت شریف

○

نہ خورشیدِ درخشاں سے نہ مہتابِ منوّر سے
جہاں میں نُور پھیلا ہے فقط روئے پیمبرؐ سے

مرا کیا واسطہ بُت سے مجھے کیا کام پتھّر سے
مجھے توحید کی دولت ملی ہے آپؐ کے در سے

زباں پر نام جیسے ہی مرے سرکارؐ کا آیا
خدا کی شان ہے ساری بلائیں ٹل گئیں سر سے

وہ گنبد کے قریں اُڑتا ہے میں قدموں میں رہتا ہوں
مقدّر میرا اونچا ہے مدینے کے کبوتر سے

مدینے کی زمیں پر کس طرح اپنے قدم رکھوں
بُلاوا آئے تو جاؤں گا میں چلتا ہوا سر سے

وسیلہ مصطفیٰؐ کا مانگ بیٹھا میں دعاؤں میں
کوئی نہ مانگ لی تسلیم خوشبو جسمِ اطہر سے

○ افضل تسلیم

نعتِ شریف

محمدؐ کا لب پر ہو ہر دم ترانہ
بڑھے جوشِ ایماں پھر والہانہ

مری خوش نصیبی کا ہے کیا ٹھکانہ
ملا سر کو سرکار کا آستانہ

ذرا اک نظر میرے آقا اِدھر بھی
کہ دشمن مرا ہو رہا ہے زمانہ

محمدؐ کی عظمت کا شاہد ہے قرآں
کہ ہیں حسنِ کردار کا وہ خزانہ

سنبھلنا ذرا اے نگاہِ عقیدت
دو عالم کے سرور کا ہے آستانہ

نبیؐ کی اطاعت نبیؐ کی محبت
یہی میری دولت یہی ہے خزانہ

یہ ہے مردِ مومن کی پہچان بابر
مصیبت میں بھولے نہ جو مسکرانہ

○

حلیم بابر
(محبوب نگر)

نعتِ شریف

شکر ہے تیرا خدایا کملی والے ہیں میرے
میرے ملجا میرے ماوی کملی والے ہیں میرے

حشر کے دن فکر کیا ہے دھوپ کی اور پیاس کی
کملی والے کا سہارا کملی والے ہیں میرے

فکر دنیا کیا کروں میں فکرِ عقبیٰ کیا کروں
میری دنیا میری عقبیٰ کملی والے ہیں میرے

گردش دوراں اسی میں خیریت ہوگی تیری
سامنے سے میرے ہٹ جا کملی والے ہیں میرے

میں چلا جاؤں گا طیبہ نعت گوئی کے طفیل
آئے گا مجھ کو بلاوا کملی والے ہیں میرے

اب نہیں ہے فکر بخشش کی مجھے مطلق جمیل
قبر ہو یا حشر ہو یا کملی والے ہیں میرے

○ جمیل نظام آبادی

نعتِ شریف

دل غم سے ہوگیا ہے مجبور یا محمدؐ
اے کاش زندگی ہو مسرور یا محمدؐ

موسیٰؑ کی طرح مجھ کو غش تو کبھی نہ آیا
تھا روضۂ مبارک یا طور یا محمدؐ

اُس در کی جستجو ہے اس در کی آرزو ہے
جس در پہ خود جبیں ہو مغرور یا محمدؐ

مجبور بے وسیلہ مغموم اُمتی ہیں!
نسبت پہ آپ کی ہیں مغرور یا محمدؐ

ہم بیکسوں کی جانب کچھ رحمتِ کرم ہو
الطاف آپ کے ہیں مشہور یا محمدؐ

ہر وقت کیفؔ پر ہو نظرِ کرم کا سایہ
ہر چند آپ سے ہے وہ دُور یا محمدؐ

غلام محی الدین خاں کیفؔ

نعتِ شریف

جو کچھ ہے کرم آپ کا سرکارؐ بہت ہے
آنکھوں کو مری حسرتِ دیدار بہت ہے

خود اپنے لیئے شمس و قمر ڈھونڈنے والو
میرے لئے یہ روضۂ انوار بہت ہے

مجھ کو جو ملا ہے وہ مدینہ کا ہے صدقہ
دل الفتِ سرکارؐ میں سرشار بہت ہے

کیوں خانہ بدوشوں کی طرح پھرتے رہیں ہم
اپنے لئے سرکارؐ کا دربار بہت ہے

ہم کب سے یہاں دیدۂ تر لے کے کھڑے ہیں
دل آپ کی رحمت کا طلبگار بہت ہے

جنت کی تمنّا ہے اگر دل میں تری تاجؔ
اِس کے لیئے اک نسبتِ سرکارؐ بہت ہے

فاطمہ جبیں تاج

ابوالاثر حفیظ جالندھری (شاہنامۂ اسلام ج ۴ سے)

اَصحابِ صُفّہ

یہ اصحابِ صُفّہ عکس تھے انوارِ رحمت کے
وجودِ پاک تھے ان کے مکاتب درسِ حکمت کے

بہت سے طالبانِ حق گھروں کو چھوڑ کر نکلے
جہانِ ماسویٰ سے رشتے ناطے توڑ کر نکلے

فقط اللہ واحد کی رضا مطلوب تھی ان کو
فقط دنیا میں حُبِّ مصطفیٰ محبوب تھی ان کو

نہیں پروائے زینت تھی نہ دولت سے علاقہ تھا
لباس ان کا تھا غیرت ان کا دامن فقر و فاقہ تھا

یہ آئے تھے یہاں پر اکتسابِ نور کرنے کو
اشاعت نورِ قرآں کی قریب و دور کرنے کو

فروغِ علم سے لبریز تھے ایماں کے پیمانے
لنڈھاتے پھرتے تھے خُم کے خُم اللہ کے دیوانے

بظاہر بے سروساماں تھے اور آفت کے مارے تھے
مگر اصحابِ صفہ سرورِ عالم کے پیارے تھے

ظواہر اور زوائد سے تھی یکسر ان کو بیزاری
خدا و مصطفیٰ ہی ان کی دولت تھی بڑی بھاری

جو حاصل تھا انھیں حاصل نہیں تھا بادشاہوں کو
میسر تھی کہاں یہ سرفرازی کج کلاہوں کو

لکھا کرتے تھے ان کے ہاتھ پروانے [illegible] کے
کیا کرتے تھے یہ تقسیم جوہر طبعِ صافی کے

انہی کی ذات سے ملتی تھی دنیا کو نوید اکثر
زبانیں ان کی بنتی تھی عدالت کی کلید اکثر

جلاتے تھے بشر کے قلب میں شمعِ اُمید اکثر
یہی اصحاب تھے حفاظِ قرآنِ مجید اکثر

یہ بنائے زندگانی ہی میں تھے اللہ سے واصل
کہ ان کو دولتِ حُبِّ رسول اللہ تھی حاصل

یہ مسجد میں ہمیشہ حاضرِ دربار رہتے تھے
بہ فکرِ اکتسابِ دولتِ دیدار رہتے تھے

وفورِ اشتہائے علم اور جذبہ قناعت کا
نبی کو پاسِ خاطر کیوں نہ ہوتا اس جماعت کا

یہ انکا زہد انکا فقر و فاقہ ان کی مسکینی
یہ ان کا رنگِ استغنا و یہ ان کی محبتِ دینی

بلند انکی نگاہیں فقر تھا انکے شمائل میں
رسول اللہ اکثر بیٹھتے تھے انکی محفل میں

جب انکی صف میں شامل آ [illegible] ہو
[illegible] صفہ [illegible] ہو

ماخوذ

دین مبین فی اربعین

عن سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اربعین حدیثاً التی قال من حفظها من امتی دخل الجنۃ قلت وما ھی یا رسول اللہ۔ قال:
(۱) ان تؤمن باللہ (۲) والیوم الآخر (۳) والملٰئکۃ (۴) والکتب (۵) والنبیین (۶) والبعث بعد الموت (۷) والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ (۸) وان تشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ (۹) وتقیم الصلوٰۃ بوضوء سابغ کامل لوقتھا (۱۰) وتؤتی الزکوٰۃ (۱۱) وتصوم رمضان (۱۲) وتحج البیت ان کان لک مال (۱۳) وتصلی اثنتی عشرۃ رکعۃ فی کل یوم ولیلۃ۔ (۱۴) والوتر لا تترکہ فی کل لیلۃ (۱۵) ولا تشرک باللہ شیئاً (۱۶) ولا تعق والدیک (۱۷) ولا تاکل مال الیتیم ظلماً (۱۸) ولا تشرب الخمر (۱۹) ولا تزن (۲۰) ولا تحلف باللہ کاذباً (۲۱) ولا تشھد شھادۃ زور (۲۲) ولا تعمل بالھوی (۲۳) ولا تغتب اخاک المسلم (۲۴) ولا تقذف المحصنۃ (۲۵) ولا تغل اخاک المسلم (۲۶) ولا تلعب (۲۷) ولا تلہ مع اللاھین (۲۸) ولا تقل للقصیر یا قصیر ترید بذلک عیبہ (۲۹) ولا تسخر باحد

مِّنَ النَّاسِ (۳۰) وَلَا تَمْشِ بِالنَّمِيْمَةِ بَيْنَ الْاَخَوَيْنِ (۳۱) وَاشْكُرِاللّٰهَ تَعَالٰی عَلٰی نِعْمَتِهٖ (۳۲) وَاصْبِرْ عَلَى الْبَلَاءِ وَالْمُصِيْبَةِ (۳۳) وَلَا تَأْمَنْ مِنْ عِقَابِ اللّٰهِ (۳۴) وَلَا تَقْطَعْ اَقْرِبَائِكَ (۳۵) وَصِلْهُمْ (۳۶) وَلَا تَلْعَنْ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِ اللّٰهِ (۳۷) وَاَكْثِرْ مِنَ التَّسْبِيْحِ وَالتَّكْبِيْرِ وَالتَّهْلِيْلِ (۳۸) وَلَا تَدَعْ حُضُوْرَ الْجُمُعَةِ وَالْعِيْدَيْنِ (۳۹) وَاَعْلَمْ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَمَا اَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ (۴۰) وَلَا تَدَعْ قِرَاءَةَ الْقُرْآنِ عَلٰی كُلِّ حَالٍ

قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا ثَوَابُ مَنْ حَفِظَ هٰذِهِ الْاَرْبَعِيْنَ ط قَالَ حَشَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی مَعَ الْاَنْبِيَاءِ وَالْعُلَمَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط

(کنز الاعمال صـ ۲۳۸ ج ۵)

دینِ مُبین چالیس حدیثوں میں

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ چالیس حدیثیں کیا ہیں جن کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ جو ان کو یاد کرلے جنت میں داخل ہوگا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :-

(۱) تو اللہ پر ایمان لائے (۲) اور آخرت کے دن پر (۳) اور فرشتوں کے وجود پر (۴) اور سب آسمانی کتابوں پر (۵) اور تمام انبیاء پر (۶) اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پر (۷) اور تقدیر پر کہ بھلا اور بُرا جو کچھ ہوتا ہے سب اللہ ہی کی طرف سے ہے (۸) اور گواہی دے اس پر کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے (سچے) رسول ہیں (۹) اور ہر نماز کے وقت کامل وضو کرکے نماز کو قائم کرے۔ (کامل وضو وہ کہلاتا ہے جس میں آداب و مستحبات کی رعایت رکھی گئی ہو اور ہر نماز کے لئے نیا وضو مستحب ہے' اور نماز کے قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے تمام ظاہری و باطنی آداب کا اہتمام کرے (۱۰) زکوٰۃ ادا کرے (۱۱) رمضان کے روزے رکھے (۱۲) اگر مال ہو تو حج کرے (۱۳) بارہ رکعات سُنّتِ مؤکدہ روزانہ ادا کرے۔ (صبح سے پہلے دو رکعت۔ ظہر سے قبل چار رکعت۔ ظہر کے بعد دو رکعت۔ مغرب کے بعد دو رکعت اور عشاء کے بعد دو رکعت) - (۱۴) وتر کسی حالت میں نہ چھوڑے (۱۵) اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرے (۱۶) [illegible]

دیکھے (۱۹) زنا نہ کرے (۲۰) جھوٹی قسم نہ کھائے (۲۱) جھوٹی گواہی نہ دے۔ (۲۲) خواہشاتِ نفسانیہ پر عمل نہ کرے (۲۳) مسلمان بھائی کی غیبت نہ کرے۔ (۲۴) اور عفیفہ عورت یا مرد کو تہمت نہ لگائے (۲۵) اپنے مسلمان بھائی سے کینہ رکھے (۲۶) لہو ولعب میں مشغول نہ ہووے (۲۷) تماشائیوں میں شریک نہ ہووے (۲۸) کسی پستہ قد کو عیب کی نیت سے ٹھگنا نہ کہے (۲۹) کسی کا مذاق نہ اڑائے۔ (۳۰) نہ مسلمانوں کے درمیان چغل خوری کرے (۳۱) اللہ جل شانہٗ کی نعمتوں پر اس کا شکر کرے (۳۲) بلا اور مصیبت پر صبر کرے (۳۳) اللہ کے عذاب سے بے خوف نہ ہووے (۳۴) اعزہ سے قطع تعلق نہ کرے (۳۵) بلکہ ان کے ساتھ صلۂ رحمی کرے (۳۶) اللہ کی کسی مخلوق کو لعنت کرے (۳۷) سبحان اللہ۔ اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کا اکثر ورد رکھا کرے (۳۸) جمعہ اور عیدین میں حاضری نہ چھوڑے (۳۹) اور اس بات کا یقین رکھے کہ جو تکلیف اور راحت تجھے پہنچی وہ مقدر میں تھی جو ٹلنے والی نہ تھی اور جو کچھ نہیں پہنچا وہ کسی طرح بھی پہنچنے والا نہ تھا (۴۰) اور کلام اللہ کی تلاوت کسی حال میں بھی نہ چھوڑے۔

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہتے ہیں : میں نے پوچھا کہ جو کوئی ان کو یاد کرے اسے کیا اجر ملے گا ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ : حق سبحانہٗ اس کا حشر انبیاء علیہم السلام اور علمائے کرام کے ساتھ فرمائیں گے۔

محمد قمر الدین صابری
(مدیر شاداب)

دین کیا ہے؟

حدیث جبرئیل

دین کیا ہے؟ اس کی خبر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تاکہ ہر ایک کو دین کی رہنمائی حاصل ہو سکے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل: ۳۶)

(ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل انبیا کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں رسول تین سو تیرہ ہیں۔

سورۂ نساء میں صاف بتایا گیا ہے کہ

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء: ۱۶۵)

(یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی عذر باقی نہ رہے)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری انسانیت کے لئے مبعوث فرمایا گیا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف: ۱۵۸)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے، اے انسانو میں تم سب (انسانوں) کی طرف اللہ کا پیغامبر ہوں)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دینِ اسلام کی تکمیل کی گئی، دین و دنیا کے تمام مسائل کا حل بتادیا گیا، اس طرح کہ اس میں کسی قسم کی کوئی تشنگی اور کمی باقی نہیں چھوڑی گئی ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ:۳)

(آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔)

تمام اصولِ دین کو قرآن کریم میں نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ایک ہی جگہ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایک حدیث شریف میں بتا دیا گیا ہے۔

یہ حدیث شریف "حدیث جبرئیل" کے نام سے معروف ہے۔ اور اس طرح ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا یُرٰی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُہٗ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ اِلٰی رُکْبَتَیْہِ وَوَضَعَ کَفَّیْہِ عَلٰی فَخِذَیْہِ وَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک ایک ایسا آدمی ہماری مجلس میں وارد ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے۔ اس پر سفر کر کے آنے کی کوئی علامت (گرد وغبار و پراگندگی) نہ تھی۔ اور ہم میں سے کوئی اس سے واقف نہ تھا۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر اور اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ کر دو زانو ہو کر با ادب بیٹھ گیا اور اس نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بتایئے کہ اسلام کیا ہے!

فَقَالَ : أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ	آپؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ آپ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔
وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ	اور یہ کہ آپ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔
وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَدَقْتَ	رمضان کے روزے رکھیں اور زادِ راہ کی استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کریں۔ اس نووارد نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔
فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ	ہم بہت متعجب ہوئے کہ پہلے تو سوال کرتا ہے پھر خود ہی تصدیق بھی کر رہا ہے۔ اس نے کہا مجھے بتلائیے کہ ایمان کیا ہے؟
قَالَ : أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ	آپؐ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، روزِ قیامت اور تقدیر (خیر و شر) پر مکمل ایمان رکھیں۔ تب اس نے کہا مجھے بتائیں کہ احسان کیا ہے۔؟
قَالَ : أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ	آپؐ نے ارشاد فرمایا احسان یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس خشوع خضوع سے کریں گویا آپ اسے بچشمِ خود دیکھ رہے ہیں
فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ	اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو فرض ہو کہ وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔
قَالَ : أَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ	اُس نے کہا مجھے بتائیں کہ قیامت کب آنے والی ہے
قَالَ : مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ	آپؐ نے فرمایا جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتا

قَالَ اَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِهَا — تو اس نے کہا علامات قیامت ہی بتا دیں

قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا — آپؐ نے فرمایا لونڈی اپنے آقا کو جنم دیگی

وَاَنْ تَرَی الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ — اور آپ دیکھینگے ننگے پاؤں ننگے بدن بھیڑ بکریاں چرانے والے لوگ بڑی بڑی عمارتیں بنا کر فخر و غرور سے بدمست ہو کر جھومیں گے۔

قَالَ: فَمَضٰی فَلَبِثْتُ مَلِیًّا — حضرت عمرؓ کہتے ہیں اتنی باتیں کرنے اور سن لینے کے بعد وہ نو وارد چلا گیا مگر ہم تھوڑی دیر تک سراسیمہ اور خاموش رہے۔

قَالَ: یَا عُمَرُ اَتَدْرُوْنَ مَنِ السَّائِلُ ؟ — تب رسول اللہؐ نے فرمایا اے عمرؓ کیا آپ لوگ جانتے ہیں یہ سائل کون تھا ؟

قُلْنَا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ — ہم نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں

قَالَ هٰذَا جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ اَمْرَ دِیْنِکُمْ — تو آپؐ نے بتایا یہ جبریل تھے جو تمہیں اپنے دین کی تعلیم دینے آئے تھے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(متفق علیہ)

"اسلام" "ایمان" اور "احسان" کی جو وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا قولاً اقرار اور عملاً اس پر قائم رہنا ہی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات : ۵۶)

(میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں)

وہ عبادت جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جن اور انسانوں کو پیدا فرمایا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف و اظہار کیا جائے۔ اوامر کی اطاعت اور نواہی سے اجتناب اسی عبادت میں داخل ہے

دین کے ان تین درجوں میں پہلا درجہ "اسلام" ہے۔ اس کے پانچ ارکان ہیں۔
۱۔ شہادت توحید و رسالت ۲۔ نماز قائم کرنا ۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا
۴۔ روزے رکھنا ۵۔ حج کرنا۔

شہادت توحید کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (آل عمران - ۱۸)

(اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یہی شہادت سب فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی لائق عبادت نہیں۔) (آل عمران - ۱۸)

شہادت رسالت کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ - ۱۲۸)

(دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ تمہاری فلاح کا وہ خواہشمند ہے، ایمان والوں کے لیے وہ بڑا شفیق اور رحیم ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی شہادت دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جو خبر دی ہے اس کی تصدیق کی جائے اور آپ کے احکام کی اطاعت کی جائے۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم کلام پاک میں بے شمار جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینۃ - ۵)

(اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں۔ اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے)

روزوں کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

یاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۔۱۸۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کردیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔

حج کے لئے فرمان الٰہی اس طرح ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (آل عمران۔۹۷)

(لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو اس حکم کی پیروی سے انکار کرے وہ جان لے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے)

دین کا دوسرا درجہ "ایمان" ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں جن میں اعلیٰ ترین درجہ لا الہ الا اللہ کہنا ہے۔ اور سب سے ادنیٰ درجہ راستے سے ضرر رساں چیز (کانٹے وغیرہ) ہٹانا ہے۔ والحیاء شعبۃ من الایمان شرم و حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

ایمان کے چھ ارکان ہیں : ۱۔ اللہ پر ایمان لانا ۲۔ فرشتوں پر ایمان ۳۔ کتابوں پر ایمان ۴۔ رسولوں پر ایمان ۵۔ روز قیامت پر ایمان اور ۶۔ اچھی بری تقدیر پر ایمان لانا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (البقرہ۔ ۱۷۷)

(نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر اور یوم آخر اور ملائکہ پر اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں پر ایمان و یقین رکھے)

ایمان کے چھٹے رکن "تقدیر خیر و شر" کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (القمر: ۴۹) (ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے)

دین کے "تیسرے درجے" "احسان" کا ایک ہی رکن ہے۔ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت س خشوع و خضوع اور انابت و رجوع سے کریں کہ گویا آپ اُسے بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔ ر اگر آپ اس مقام کو نہیں پا سکتے کہ آپ دیکھ رہے ہیں تو کم از کم یہ کیفیت تو ضرور ہونی چاہیئے وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں تو کم از کم یہ کیفیت تو ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ آپ کو دیکھ رہا ہے ۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَتَوَکَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۞ الَّذِیْ یَرٰىکَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۞ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۞ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۞ (الشعراء ۲۱۷ تا ۲۲۰)

(اور اس زبردست اور رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب آپ تے ہیں اور سجدہ گزار لوگوں میں آپ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے)

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (النحل ۱۲۸)

للہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور "محسنین" سے ہیں یعنی عبادتوں ں طرح کرتے ہیں ۔ سلسلہ صفحہ ۳۶

حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ بات خوش نہیں آتی کہ میرے لئے کوہ اُحد سونا بن جائے اور پھر رات کو اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہے، بجز ایسے دینار کے جس کو کسی واجب مطالبہ کے لئے تھام لوں اور یہ بات آپ کے کمال سخاوت وجود و عطا کی دلیل ہے ۔ چنانچہ اسی کمال سخاوت کے سبب آپ مقروض رہتے تھے ۔ حتیٰ کہ آپؐ نے جس وقت وفات پائی ہے تو آپ کی زرہ اہل و عیال کے اخراجات میں رہن رکھی ہوئی تھی

(النشر الطیب)

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

دینِ حق اور اسوۂ حسنہ

سب مسلمان جانتے ہیں کہ "دین حق" وہ پیغامِ الٰہی ہے، جو ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے جس پر آپؐ نے اور آپؐ کی نگرانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء نے عمل کیا اور جس کی قیامت تک حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ یہ دینِ حق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل اور ائمہ مجتہدین کی تشریحات کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ — اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس اُمت کے پاس آج بھی یہ ساری چیزیں بالکل صحیح سالم اس طرح محفوظ ہیں کہ گویا آج کے لئے ہی یہ دین نازل کیا گیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اُمت میں دو قسم کے اختلافات ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قسم کے اختلافات سے مطلع بھی کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے بارے میں اُمت کو ہدایات بھی عطا فرمائیں۔

پہلی قسم کا اختلاف وہ ہے جو اجتہادی مسائل میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کے درمیان رونما ہوا اور جو آج حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اختلاف کے نام سے مشہور ہے یہ اختلاف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بھی کبھی کبھی رونما ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْعَصْرَ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ (تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہونچ کر۔)

اتفاق سے وہاں پہنچنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاخیر ہوگئی اور نمازِ عصر کا وقت ضائع ہونے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ کیا ہونا چاہیئے؟ مشورہ میں دو فریق بن گئے۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھی جائے تو اب راستے میں نماز پڑھنے کا کیا جواز ہے؟ اسلئے خواہ نماز قضا ہوجائے مگر ارشاد نبوی کی تعمیل ضروری ہے مگر دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اس حکم کا منشائے مبارک یہ تھا کہ ہمیں عصر کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے بنو قریظہ پہنچ جانا چاہیئے اور عصر کی نماز وہاں پہنچ کر پڑھنی چاہیئے۔ لیکن اب جب کہ ہم غروب سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتے تو نماز عصر قضا کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں۔ اگر ہم سے وہاں پہونچنے میں تاخیر ہوگئی ہے تو اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اب ہمیں نمازِ عصر قضا کر کے اپنی کوتاہی میں مزید اضافہ کرلینا چاہیئے۔ الغرض پہلے فریق نے ارشادِ نبوی کی تعمیل میں عصر کی نماز قضا کرنا گوارا کیا۔ مگر ارشادِ نبوی کے ظاہر سے ہٹنا گوارا نہیں کیا اور دوسرے فریق نے منشائے نبوی کی تعمیل ضروری سمجھی۔ راستے میں اتر کر نماز عصر پڑھی اور پھر بنو قریظہ پہونچے۔ جب بارگاہِ نبوی میں یہ واقعہ پیش ہوا تو آپ نے کسی فریق کو عتاب نہیں فرمایا بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی کیونکہ دونوں منشائے نبوی کی تعمیل میں کوشاں تھے۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ الغرض ایک اختلاف یہ ہے جس کو "اجتہادی اختلاف" کہا جاتا ہے۔ یہ اختلاف نہ صرف ایک فطری اور ناگزیر چیز ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو "رحمت" فرمایا ہے اور جس شخص کو حق تعالیٰ نے ذرا بھی نور بصیرت عطا کیا ہو، اس کو اس اختلاف کا "رحمت" ہونا کھلی آنکھوں نظر آتا ہے۔ یہ اختلاف بالکل صحیح ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ جس امام مجتہد سے اعتقاد ہو اس کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور باقی بزرگوں کے بارے میں ادب و احترام کو ملحوظ رکھا جائے کیونکہ یہ تمام حضرات اعلیٰ درجہ کے ماہر دین بھی تھے اور صاحب باطن عارف باللہ بھی

بعد کے لوگوں میں سے کوئی شخص نہ ان کے پائے کا عالم ہوا ہے اور نہ معرفت میں کوئی ان کی ہمسری کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت پیران پیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ شیخ محی الدین عربیؒ خواجہ علی ہجویری گنج بخش بابا فرید الدین شکر گنج مجدد الف ثانیؒ سب ان ائمہ مجتہدین کے پیروکار ہوئے ہیں۔

دوسری قسم کا اختلاف "نظریاتی اختلاف" کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختلاف کی بھی پیشگوئی فرمائی تھی اور اس اختلاف میں حق و باطل کو جانچنے کا معیار مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔ "بنو اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے۔

اور میری اُمت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی۔ یہ سب کے سب، سوائے ایک کے، جہنّم میں جائیں گے۔ عرض کیا گیا، یا رسول اللہ! یہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے؟ فرمایا "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِی"۔ جو لوگ اُس راستے پر قائم رہیں گے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں"۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

"۷۲ دوزخ میں جائیں گے اور ایک جنّت میں۔ اور یہ "الجماعت" یعنی برحق جماعت ہے اور کچھ لوگ نکلیں گے جن میں خواہشات اور غلط نظریات اس طرح سرایت کر جائیں گے جس طرح باولے کُتّے کے کاٹے ہوئے شخص کی بیماری ہوتی ہے کہ اس کا کوئی جوڑ اور رگ و ریشہ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری سرایت نہ کر جائے"۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا اسلئے میرے طریقہ کو ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقہ کو لازم پکڑو۔

اور اُسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور دیکھو! جو باتیں نئی نئی ایجاد کی جائیں
گی ان سے احتراز کیجیو۔ اسلئے کہ ہر وہ چیز (جو دین کے نام پر) نئی
ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچ کر فرمایا: "یہ تو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے"۔ اور اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچ کر فرمایا: "یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو ورغلا رہا ہے کہ اِدھر آؤ! یہ صحیح راستہ ہے"۔ یہ ارشاد فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔" یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اس پر چلو"

(یہ تمام حدیثیں مشکوٰۃ شریف میں ہیں)

اس موضوع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں جن کو اس وقت جمع کرنا میرے لئے ممکن نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اِن ارشاداتِ مقدسہ سے واضح طور پر حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت میں نظریاتی اختلاف کے رونما ہونے کی پیشگوئی فرمائی۔

۲۔ اس اختلاف کو ناپسند فرمایا اور سوائے ایک جماعت حقہ کے، باقی سب کو دوزخ کی وعید فرمائی۔

۳۔ اس اختلاف میں حق و باطل کو پہچاننے کا معیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معین فرمایا کہ جو شخص یا جو گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے طریقے پر قائم ہے جس پر آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ کرامؓ بھی عمل پیرا رہے وہ حق پر ہے اور جو اس کے خلاف چلے وہ باطل پر ہے۔ گویا معیارِ حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا راستہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی بہت سی جگہ اسی کو "معیارِ حق" قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے
وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ

غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ
وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (النسآء ۱۱۵)

: اور جو شخص مخالفت کرے رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی جب کہ اس کے سامنے ہدایت کھل چکی ہے اور چلے مؤمنین کا راستہ چھوڑ کر، ہم اس کو دھکا دیں گے جدھر وہ جاتا ہے اور اس کو دوزخ میں جھونک دیں گے۔ اور وہ ہے بہت بُرا ٹھکانا۔

اِس آیت کریمہ میں جس "المومنین" کے راستے کی نشاندہی کی گئی اس سے صحابہؓ مراد ہے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اُمور کو جو دین کے نام پر بعد میں ایجا گئے "بدعت" فرمایا۔

۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعات اور گمراہیوں کے ایجاد کرنے کی علت بھی بیا غلط خواہشات کی پیروی۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ آدمی کے دل و دماغ ہی کو مسخ بلکہ جس طرح باؤلے کتے کے کاٹنے کا زہر آدمی کے سارے بدن میں سرایت کر اور وہ اچھا بھلا آدمی ہونے کے باوجود غیر انسانی حرکات پر اُتر آتا ہے اسی جس شخص کو غلط نظریات کے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو اس کے رگ و ریشہ خود رائی کا زہر سرایت کر جاتا ہے اور اُسے اپنے خود تراشیدہ نظریات کے سو دُنیا افسانہ غلط نظر آنے لگتی ہے۔

(۶) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو ہدایت فرمائی کہ ان اختلافات کے کے وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین، جن کا بہ ظاہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، کے طریقہ پر سختی سے قائم رہیں۔ اُسے دانت کچلیوں سے مضبوط پکڑ لیں، بدعات و خواہشات کے ہزاروں جھگڑ چلیں اور

نئے خوشنما قسم کے نظریات کی لاکھوں بجلیاں کوندیں مگر اُمت کے ہاتھ سے یہ مضبوط رشتہ ہرگز نہیں چھوٹنا چاہیئے۔

(۷) ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ " اللہ تعالیٰ کا راستہ " وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور جس پر صحابہ کرام رضؓ چلے۔ یہ راستہ قیامت تک رہے گا۔ لیکن اِس " خدائی راستے " کے بالمقابل کچھ شیطانی راستے بھی نکلیں گے اور ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو خدائی راستہ سے ہٹا کر اپنے راستہ پر چلنے کی دعوت دے گا۔ اپنی اس دعوت میں لوگوں کے مزاج اور ان کی نفسیات کے مطابق دلائل بھی دے گا اور خدا تعالیٰ کے راستہ کو نعوذ باللہ فرسودہ اور رجعت پسندانہ بھی بتلائے گا۔ مگر اُمت آگاہ رہنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ٹھیک راستہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا جس پر صحابہ کرام رضؓ اور خلفائے راشدین رضؓ چلے اور جس کی پیروی ہمیشہ سلف صالحین اور اولیائے اُمت کرتے آئے۔ اس ایک راستے کے سوا باقی سب شیطان کے ایجاد کیئے ہوئے راستے ہیں اور جو لوگ ان میں سے کسی راستے کی دعوت دیتے ہیں وہ شیطان کے ایجنٹ بلکہ مجسم شیطان ہیں۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر ان پگڈنڈیوں پر نکل پڑے گا اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کسی اندھیرے غار میں کسی اژدھا کے مُنہ میں جائے گا یا کسی لق ودق صحرا میں بھٹک کر کسی بھیڑیئے کا تر نوالہ بن کر رہ جائے گا۔

یہ اُصول اور قواعد جو قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں صراحتہً ذکر کیئے گئے ہیں اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لئے جائیں تو ایک متوسط ذہن کے آدمی کو یہ سمجھ لینا زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ حق پر کون ہے؟ اور صراط مستقیم کیا ہے؟

ڈاکٹر محمد عبدالحئی

اُسوۂ رسولِ اکرم
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

خلقِ عظیم

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ کریم میں مکارم اخلاق محامد صفات ان کی کثرت و قوت اور عظمت کے لحاظ سے قرآن کریم میں مدح و ثنا فرمائی ہے اور ارشاد

اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ط بلاشبہ آپ بڑے ہی صاحبِ اخلاق ہیں

اور فرمایا :-

كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی مجھے مکارم اخلاق کی تعلیم کیلئے بھیجا گیا

اور ایک روایت میں ہے :-

لِاُكَمِّلَ محاسن الافعال یعنی اچھے کاموں کو مکمل کرنے کیلئے بھیجا

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ذاتِ مقدس میں تمام محاسن و مکارم اخلاق جمع ہوں کیوں نہ ہوں جبکہ آپ کا معلم حق تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔

سیدتنا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا :-

كَانَ خُلُقُه القرآن آپ کا اخلاق قرآن تھا۔

اسکے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن کریم میں اخلاق و صفات محمودہ مذکور

آپ اُن سے متصف تھے۔

کتاب الشفاء میں قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں (کہ نیز یہ بھی ہے) کہ آپ کی خوشنودی قرآن کی خوشنودی کے ساتھ اور آپ کی ناراضگی قرآن کی ناراضگی کے ساتھ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی رضا امرِ الٰہی کی بجا آوری میں اور آپ کی ناراضگی حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی میں اور ارتکاب معاصی میں تھی۔

اور عوارف المعارف میں مذکور ہے کہ سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مراد یہ تھی کہ قرآن کریم ہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مہذب اخلاق تھا یعنی کَانَ خلقہ القرآن کے یہی معنی و مطلب ہیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ کسی فہم اور کسی کا قیاس حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کی حقیقت اور آپ کے حال کی کُنہ عظیم تک نہیں پہنچ سکتا اور بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مانند کما حقہٗ کوئی نہیں پہچان سکتا۔ لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ اُس کی تاویل بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

(حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز۔ مدارج النبوت)

حلم و عفو

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر، بردباری اور درگذر کرنے کے صفات نبوت کی عظیم ترین صفتوں میں سے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنے ذاتی معاملہ اور مال و دولت کے سلسلہ میں کسی سے انتقام نہیں لیا مگر اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا تو اس سے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے بدلہ لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ اشد و سخت صبر غزوہ اُحد میں تھا کہ کفار نے آپ کے ساتھ جنگ و مقابلہ کیا اور آپ کو شدید ترین رنج و الم پہنچایا۔ مگر آپؐ نے ان پہ نہ صرف صبر و عفو پہ ہی

اکتفا فرمایا بلکہ ان پر شفقت و رحم فرماتے ہوئے ان کو اس ظلم و جہل میں معذور گردا
فرمایا اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (یعنی اے اللہ میری تو
راہِ راست پر لا کیونکہ وہ جانتے نہیں)

اور ایک روایت میں ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَھُمْ اے اللہ انھیں معاف
اور جب صحابہ کو بہت شاق گذرا تو کہنے لگے یا رسول اللہ کاش ان پر بد دعا فرماتے کہ
ہلاک ہوجاتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں لعنت کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ میں
دعوت اور جہان کے لئے رحمت ہوکر مبعوث ہوا ہوں (الشفاء۔ مدارج النبوۃ)

عفو و کرم

کفارِ مکہ اکیس سال تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نام لیواؤں
سے۔ ظلم و ستم کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو انھوں نے خدائے واحد کے پرستاروں پر نہ
حتیٰ کہ وہ گھر بار اور وطن تک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے لیکن جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے یہ
دشمن مکمل طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر تھے۔ اور آپ کا ایک اشارہ
سب کو خاک و خون میں ملا سکتا تھا۔ لیکن ہوا کیا ــــ ؟

ان تمام جباران قریش سے جو خوف اور ندامت سے سر نیچے ڈالے آپ
سامنے کھڑے تھے۔ آپؐ نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں ؟"

انہوں نے دبی زبان سے جواب دیا۔

"اے صادق۔ اے امین۔ تم ہمارے شریف بھائی اور شریف برادر زادے ہو
تمہیں ہمیشہ رحم دل پایا ہے"۔

آپ نے فرمایا۔ آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیو
کہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا :۔

" تم پر کچھ الزام نہیں۔ جاؤ آج تم سب آزاد ہو " صلی اللہ علیہ وسلم
(کتاب الشفا ۔ ابن ہشام)

سخاوت

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اول تو تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے (کوئی آپ کی سخاوت کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا کہ خود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور عطاؤں میں بادشاہوں کو شرمندہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ نہایت سخت احتیاج کی حالت میں ایک عورت نے چادر پیش کی اور سخت ضرورت کی حالت میں آپ نے پہنی، اسی وقت ایک شخص نے مانگ لی، آپ نے مرحمت فرمادی، آپ قرض لے کر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا فرماتے تھے، اور قرض خواہ کے سخت تقاضے کے وقت کہیں سے کچھ اگر آگیا اور ادائے قرض کے بعد بچ گیا تو جب تک وہ تقسیم نہ ہوجائے گھر میں تشریف نہ لیجاتے تھے)۔ بالخصوص رمضان المبارک کے مہینہ میں اخیر تک بہت ہی فیاض رہتے (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ ماہ کی فیاضی بھی اس مہینہ کی فیاضی کے برابر نہ ہوتی تھی) اور اس مہینہ میں جب بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لاتے اور آپ کو کلام اللہ سناتے، اس وقت آپؐ بھلائی اور نفع رسانی میں تیز بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے (خصائل نبوی)

ترمذی کی حدیث سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ نوّے ہزار درہم جس کے تقریباً بیس ہزار روپے سے زیادہ ہوتے ہیں کہیں سے آئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بورے پر ڈلوا دیئے اور وہیں پڑے پڑے سب تقسیم کرا دیئے۔ ختم ہوجانے کے بعد ایک سائل آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس تو کچھ رہا نہیں تو کسی سے میرے نام سے قرض لے لے۔ جب میرے پاس ہوگا ادا کردوں گا۔ (خصائل نبوی)۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول خدا سے کچھ مانگا گیا ہو، اور آپؐ نے فرمایا ہو، میں نہیں دیتا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے کوئی چیز نہ اُٹھا رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے۔ خاص کر ماہ رمضان میں تو بہت سخی ہوجاتے تھے (صحیح بخاری۔ باب بدء الوحی)

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی سے فرمایا:

" اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر سونا ہو۔ اور تیسرے دن تک اس میں سے میرے پاس ایک اشرفی بھی بچ رہے۔ سوائے اس کے جو ادائے قرض کے لئے ہو۔ تو اے ابوذر! میں اس مال کو دونوں ہاتھوں سے خدا کی مخلوق میں تقسیم کر اُٹھوں گا۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الاستقراض صـ۳۲۱)

قناعت و توکّل

حضرت انس رضی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے دن کے واسطے کسی چیز کا ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

(ف) یعنی جو چیز ہوتی کھلا پلا کر ختم فرما دیتے۔ اس خیال سے کہ کل پھر ضرورت ہوگی اس کو محفوظ نہ رکھتے تھے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غایت درجہ توکل تھا کہ جس نے آج دیا ہے وہ کل بھی عطا فرمائے گا۔ یہ صرف اپنی ذات کے لئے تھا ورنہ ازواج کا نفقہ ان کے حوالے کر دیا جاتا تھا کہ وہ جس طرح چاہیں تصرف میں لائیں چاہیں رکھیں یا تقسیم کر دیں۔ مگر وہ بھی تو حضور کی ازواج تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں ایک بار دو گونیں درہموں کی نذرانہ کے طور پر پیش کی گئیں جن میں ایک لاکھ درہم سے زیادہ تھے۔ اُنھوں نے طباق منگوایا اور بھر بھر کر تقسیم فرما دیا۔ خود روزہ دار تھیں۔ افطار کے وقت روٹی اور زیتون کا تیل تھا جس سے افطار فرمایا۔ باندی نے عرض کیا کہ ایک درہم کا آج گوشت منگا لیتیں تو آج ہم اسی سے افطار کر لیتے۔ ارشاد فرمایا کہ اب طعن سے کیا ہو سکتا ہے۔ اسی وقت یاد دلاتی تو میں منگا دیتی (خصائل نبوی)

(ماہنامہ ۲۵ بر دیکھئے)

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

دیوبندی اور بریلوی مکتبِ نظر

میرے لئے " دیوبندی بریلوی اختلاف " کا لفظ ہی موجبِ حیرت ہے۔ شیعہ سنّی اختلاف تو صحابہ کرامؓ کو ماننے یا نہ ماننے کے مسئلہ پر پیدا ہوا اور حنفی وہابی اختلاف ائمہ ہدیٰ کی پیروی کرنے نہ کرنے پر پیدا ہوا لیکن " دیوبندی بریلوی اختلاف " کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے۔ اسلئے کہ یہ دونوں فریق امام ابوحنیفہؒ کے ٹھیٹھ مقلد ہیں۔ عقائد میں دونوں فریق امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابومنصور ماتریدیؒ کو امام و مقتدا مانتے ہیں۔ تصوف و سلوک میں دونوں فریق اولیاء اللہ کے چاروں سلسلوں قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی میں بیعت کرتے کراتے ہیں۔

الغرض یہ دونوں فریق اہل سنت والجماعت کے تمام اصول و فروع میں متفق ہیں۔ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کی عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے حلقہ اور مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تک سب اکابر کے عقیدت مند ہیں اور اکابر اولیاء اللہ کی کفش برداری کو سعادتِ دارین سمجھتے ہیں۔ اسلئے ان دونوں کے درمیان مجھے اختلاف کی کوئی صحیح بنیاد نظر نہیں آتی۔ تاہم میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ان کے درمیان چند امور میں اختلاف ہے۔ اسلئے میں کسی فریق کا نام لئے بغیر قرآن و سنّت اور فقہ حنفی کی تصریحات کی روشنی میں ان کے مختلف فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

ان دونوں کے درمیان جن نکات میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں۔

(۱)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے یا بشر ؟

(۲) ۔ آپؐ عالم الغیب تھے یا نہیں ؟
(۳) ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں ؟
(۴) ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کل ہیں یا نہیں ' یعنی اس کائنات کے تمام اختیا
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں ہیں یا اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ؟

ان مسائل میں جس فریق کا عمل قرآن کریم ' ارشاداتِ نبویؐ تعامل اور فقہ حنفی کے مطابق ہوگا ۔ میں اسے حق پر سمجھتا ہوں اور دوسرے کو غلطی پر ۔ ا میں نہایت اختصار کے ساتھ ان متنازعہ فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نکتہ نظر پیش کرتا ہوں ۔

ا ۔ نور اور بشر :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ آپؐ اپنی ذا کے لحاظ سے نہ صرف نوعِ بشر میں داخل ہیں بلکہ افضل البشر ہیں ۔ نہ صرف انسان ہ بلکہ نوعِ انسان کے سردار ہیں ۔ نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں بلکہ آ و اولادِ آدم کے لئے سرمایہ صد افتخار ہیں ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ خود ارشادِ نبویؐ ہے ۔

اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ میں اولاد آدم کا سردار ہوں قیامت کے دن (مشکوٰۃ ص۵۱۱)

اسلئے آپؐ کا بشر ' انسان اور آدمی ہونا نہ صرف آپؐ کے لئے طرہ افتخ ہے بلکہ آپؐ کے بشر ہونے سے انسانیت و بشریت رشکِ ملائکہ ہے ۔

جس طرح آپؐ اپنی نوع کے اعتبار سے بشر ہیں اسی طرح آپؐ صفتِ ہدایت کے لحاظ سے ساری انسانیت کے لئے مینارۂ نور ہیں ' یہی " نور " ہے جس روشنی میں انسانیت کو خدا تعالیٰ کا راستہ مل سکتا ہے اور جس کی روشنی ابد تک درخشا و تابندہ رہے گی ۔ لہذا میرے عقیدے میں آپؐ بیک وقت نور بھی ہیں اور بشر

اور میرے نزدیک نور و بشر کو دو خانوں میں بانٹ کر ایک کی نفی اور دوسرے کا اثبات غلط ہے۔

بشر اور انسان دونوں ہم معنیٰ لفظ ہیں اور بشریت کی نفی کے معنیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ دائرۂ انسانیت سے خارج کرنا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ انبیاء کرام کے بنی نوع انسان میں سے ہونے کی صراحت کی گئی ہے۔ اِدھر اہلسنت والجماعت اس پر متفق ہیں کہ صرف نوع انسان ہی میں سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے۔ اہلِ سُنّت کے عقائد کی مشہور کتاب "شرح عقائد نسفی" میں رسول کی تعریف یہ کی گئی ہے:

اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ لِتَبْلِیْغِ الرِّسَالَۃِ وَالْاَحْکَامِ ۔ رسول وہ انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے پیغامات و احکام بندوں تک پہنچانے کے لئے کھڑا کرتا ہے

اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری (ص ۲۶۳ ج ۲) میں "فصول عمادیہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جو شخص کہے کہ میں نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے یا جن، وہ مسلمان نہیں" الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انسان اور بشر ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی شخص بشرطِ سلامتیٔ عقل ہرگز انکار نہیں کرسکتا۔

بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ آپؐ خدا کے نور میں سے نور تھے۔ جو لباسِ بشریت میں جلوہ گر ہوئے اور بعض کہتے ہیں کہ "احد" اور "احمد" میں صرف "میم" کا پردہ ہے۔ نعوذ باللہ۔ یہ بعینہٖ وہی عقیدہ ہے جو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رکھتے ہیں کہ وہ خُدا تھے جو لباسِ بشریت میں آئے۔ اسلام میں ایسے لغو اور بیہودہ بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ پہلی اُمّتوں نے اسی قسم کے لغو سے اپنے دین کو برباد کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اُمّت کے بارے میں بھی اسی غلو کا

اندیشہ تھا۔ اس لئے آپؐ نے اُمت کو ہدایت فرمائی کہ "میری تعریف میں ایسا مبالغہ نہ کیجیو جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہ اُنھیں خدا اور خدا کا بیٹا بنا ڈالا' میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہیو" (صلی اللہ علیہ وسلم) (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۹)

اس ارشادِ مقدس کی روشنی میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمالات و خصوصیات میں تمام کائنات میں سب سے اعلیٰ و اشرف اور یکتا ہیں کوئی آپ کے مثل نہیں مگر آپؐ بہرحال انسان ہیں' خدا نہیں۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور اسی پر میرا ایمان ہے۔

۲۔ عالم الغیب :

میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ شانہٗ نے وہ علوم عطا کئے جو کسی مقدس نبی اور کسی مقرب فرشتے کو عطا نہیں کئے گئے بلکہ تمام اولین و آخرین کے علوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے علم کا ایک قطرہ ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات صفات' گذشتہ و آئندہ کے بے شمار واقعات' برزخ اور قبر کے حالات' میدانِ حشر کے نقشے' جنت و دوزخ کی کیفیت۔ الغرض وہ تمام علوم جو آپؐ کی ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شایانِ شان تھے۔ وہ سب آپ کو عطا کئے گئے اور ان کا اندازہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ اسی کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح ساری کائنات کے علوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم مقدسہ سے کوئی نسبت نہیں۔ یہی حیثیت آپؐ کے علوم کی حق تعالیٰ کے علم محیط کے مقابلے میں ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو دریا کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا :

مَا عِلْمِی وَ عِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ — اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرے اور

اِلَّا مِثْلَ مَا نَقَصَ هٰذَا الْعُصْفُوْرُ مِنْ هٰذَا الْبَحْرِ (صہ ۶۸۸ ج ۲)
آپ کے علم کی مثال اس قطرے کی ہے جو اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔

اور یہ مثال بھی محض سمجھانے کے لئے ہے ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم کے ساتھ کیا نسبت؟ (حاشیہ صحیح بخاری ج ۱ صہ ۴۸۲) ۔ یہی سبب ہے کہ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ "عالم الغیب" کا لفظ اللہ تعالیٰ کی خاص صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور بہت سی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ بیسویں پارے کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفاتِ الوہیت ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا ہے

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ
وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔ " (النمل۔ ۶۵)

ترجمہ: فرما دیجئے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جتنی مخلوق بھی موجود ہے ان میں سے کوئی غیب نہیں جانتا۔ اللہ کے سوا ۔ اور ان کو خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے

اسی طرح بہت سی احادیث میں بھی یہ مضمون ارشاد ہوا ہے ۔ ان آیات و احادیث کو نقل کیا جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں ہوگی ۔ اور ہمارے تمام ائمہ اہلسنّت اور ائمہ احناف کا یہی مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو " عالم الغیب " کہنا صحیح نہیں ۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ " جو شخص یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے ' اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا "

(صحیح بخاری۔ مشکوٰۃ شریف صہ ۵۰۱)

اور فقہ حنفی کی مشہور کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ " جس شخص نے کسی عورت سے گواہوں کے بغیر نکاح کیا اور یہ کہا کہ ہم خدا اور رسولؐ کو گواہ بناتے ہیں تو وہ کافر ہو جائے گا۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ صہ ۲۶۶) ۔ اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو " عالم الغیب " سمجھا اور ایسا عقیدہ رکھنا

کفر ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں برحاشیہ عالمگیری ص۲۳۴ ج۔۱ ' البحرالرائق ج ۳۔ص۸

بعض لوگ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ "عالم الغیب" ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "عالم الغیب" ہیں۔ ایسا کلمہ کفر سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ در اصل یہ مسکین یہی نہیں جانتے کہ "علم غیب" کسے کہتے ہیں؟ ہما ائمہ احناف کی مشہور تفسیر "مدارک" میں لکھا ہے :

" وَالْغَيْبُ : هُوَ مَا لَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيْلٌ وَلَا اَطَّلَعَ عَلَيْهِ مَخْلُوْقٌ ـ " (ترجمہ)۔ "غیب" ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن پر کوئی دلیل قائم نہیں اور نہ کسی مخلوق کو ان کی اطلاع ہے۔"

پس جن امور کا علم انبیاء کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی عطا کردیا جاتا ہے جو چیزیں اولیاء کرام کو بذریعہ الہام یا کشف معلوم ہوجاتی ہیں ان پر "غیب" کا اطلاق ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم مبارکہ اس قدر ہیں کہ ان کا کا اندازہ کسی انسان' کسی جن اور کسی فرشتے کو نہ ہوا ہے' نہ ہوسکتا ہے۔ لیکن نہ تو آ' صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم' علم الٰہی کے مساوی ہیں اور نہ قرآن کریم' حدیث نبویؐ اور فقہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو "عالم غیب" کہنا صحیح ہے۔

۳۔ حاضر و ناظر :

اس نکتہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے "حاضر و ناظر" کا مطلب سمجھ لینا ض ہے۔ یہ دونوں عربی کے لفظ ہیں جن کے معنیٰ ہیں "موجود اور دیکھنے والا" اور جب ا دونوں کو ملاکر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے " وہ شخصیت جس کا وجود خاص جگہ نہیں بلکہ اس کا وجود بیک وقت ساری کائنات کو محیط ہے اور کائنات کی ا ایک چیز کے تمام حالات اول سے آخر تک اس کی نظر میں ہیں۔" میرا عقیدہ یہ ہے "حاضر و ناظر" کا یہ مفہوم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر صادق آتا ہے اور یہ ص

اسی کی شان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ آپؐ روضۂ اطہر میں استراحت فرما ہیں اور دُنیا بھر کے مشتاقانِ زیارت وہاں حاضری دیتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ آپؐ ہر جگہ موجود ہیں اور کائنات کی ایک ایک چیز آپؐ کی نظر میں ہے۔ بداہتِ عقل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں۔ چہ جائیکہ یہ شرعًا درست ہو۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس کو کسی دوسری شخصیت کے لئے ثابت کرنا غلط ہے۔

اور اگر "حاضر و ناظر" ماننے والوں کا یہ مطلب ہے کہ اس دُنیا سے رحلت فرمانے کے بعد آپؐ کی روحِ طیبہ کو اجازت ہے کہ جہاں چاہیں تشریف لے جائیں تو اوّل تو اس سے آپؐ کا ہر جگہ "حاضر و ناظر" ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک کے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ ملک کے جس حصّے میں جب چاہے آجا سکتا ہے، کیا اس اجازت کا کوئی شخص یہ مطلب سمجھے گا کہ ملک کا ہر شہری ہر جگہ "حاضر و ناظر" ہے؟۔ کسی جگہ جانے کی اجازت ہونے سے وہاں واقعتًا حاضر ہونا تو لازم نہیں آتا۔ اس کے علاوہ جب کسی خاص جگہ کے بارے میں کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں حاضر ہیں تو یہ ایک مستقل دعویٰ ہے جس کی دلیل کی ضرورت ہوگی چونکہ اس کی کوئی دلیل شرعی موجود نہیں، اسلئے بغیر دلیل شرعی کے اس کا عقیدہ رکھنا ناجائز ہوگا۔ بعض لوگ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بلکہ اولیاء کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں۔ مجھے ان حضرات کی سخاوت پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کتنی فیاضی سے اللہ جل شانہٗ کی صفات اس کی مخلوق میں تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ بہرحال ائمہ اہلسنّت کے نزدیک یہ جسارت قابلِ برداشت نہیں۔

فتاویٰ بزازیہ میں فرماتے ہیں:

قَالَ عُلَمَآئُنَا مَنْ قَالَ اَرْوَاحُ الْمَشَائِخِ حَاضِرَةٌ تَعْلَمُ يَكْفُرُ

(بزازیہ برحاشیہ عالمگیری ص ۳۲۶ ج ۶)

(یعنی اسے ... فرمایا کہ جو شخص کہے کہ بزرگوں کی روحیں حاضر ہیں اور وہ سب کچھ جانتی ہیں ایسا شخص کافر ہے۔)

۴۔ مُختارِ کُل :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدائی صفات ثابت کرنے کا صاف و نتیجہ یہ تھا کہ آپؐ کو خدائی اختیارات میں بھی حصہ دار ٹھیرایا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے عقیدہ بھی بڑی شدّ و مدّ سے پیش کیا ہے کہ اس کارخانہ عالم کے متصرف و مختار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اختیارات عطا کر دئے ہیں۔ اس لئے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو " مختارِ کُل " کا خطاب دیتے ہیں لیکن قرآن کریم، نبویؐ اور عقاید اہلِ سُنّت میں اس عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کُل یا بعض اختیارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور کو دے ہیں۔

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ موت و حیات، صحت و مرض، عطا و بخشش سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء اللہ تعالیٰ کی سے التجائیں اور دُعائیں کرتے اور اسی کو ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک سمجھتے رہے ہیں۔ حال تمام اکابر اولیاء اللہ کا ہے۔ کسی نبی و ولی اور صدّیق و شہید نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ اسے کائنات میں تصرف کا حق دے دیا گیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارے میں جو عقیدہ تھا وہ یہ ہے :

" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ میں ایک دن آنحضرت صلی اللہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ آپؐ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا :

" اے لڑکے ! تُو اللہ کے حقوق کی حفاظت کر، اللہ تیری حفاظت کرے گا

تو اللہ کے حقوق کی حفاظت کر تو اس کو اپنے سامنے پائے گا اور جب کچھ مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ اور جب مدد کی ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر اور یقین رکھ کہ ساری جماعت اگر تجھے کوئی نفع پہنچانے پر جمع ہو جائے تو تجھے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ اور اگر ساری جماعت تجھے کوئی نقصان پہنچانے پر جمع ہو جائے تو تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔

(مشکوٰۃ شریف ص۴۵۳)

شیخ علی القاریؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

"اللہ سے مانگ" یعنی صرف اللہ تعالیٰ سے مانگ۔ اس لئے کہ عطیات کے خزانے اسی کے پاس ہیں اور عطاء و بخشش کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر نعمت یا نقمت، خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، جو بندے کو پہونچتی ہے یا اس سے دفع ہوتی ہے وہ بغیر کسی شائبہ غرض یا ضمیمۂ علت کے صرف اسی کی رحمت سے ملتی ہے کیونکہ وہ جوادِ مطلق ہے۔ اور وہ ایسا غنی ہے کہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس لئے اُمید صرف اسی کی رحمت سے ہونی چاہیئے۔ بڑی بڑی حاجات التجا اسی کی بارگاہ میں ہونی چاہیئے اور تمام اُمور میں اعتماد اسی کی ذات پر ہونا چاہیئے۔ اس کے سوا کسی سے نہ مانگے۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہ دینے پر قادر ہے نہ روکنے پر۔ نہ مصیبت ٹلانے پر، نہ نفع پہنچانے پر، کیونکہ اس کے ماسوا خود اپنی ذات کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، اور نہ وہ موت و حیات اور جی اُٹھنے کی قدرت رکھتے ہیں"

اور "آگے" "ساری جماعت" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بے شک ساری اُمت" یعنی تمام مخلوق، خاص و عام انبیاء و اولیاء

اور ساری اُمت بالفرض اس بات پر متفق ہو جائیں کہ دنیا یا آخرت کے کسی معاملے میں تجھے کسی چیز کا نفع پہونچائیں تو تجھے نفع پہنچانے پر قادر نہیں۔"

(مرقاۃ المفاتیح ص۹۱ ج ۵)

اور حضرت پیرانِ پیر شاہ عبدالقادر جیلانیؒ "الفتح الربانی" کی مجلس ص۱۶۱ میں فرماتے ہیں: اِنَّ الْخَلْقَ عَجِزٌ عَدَمٌ، لَا هُلْكَ بِاَیْدِیْهِمْ وَلَا مُلْكَ، لَا غِنٰی بِاَیْدِیْهِمْ وَلَا فَقْرَ، وَلَا ضَرَّ بِاَیْدِیْهِمْ وَلَا نَفْعَ، وَلَا مُلْكَ عِنْدَهُمْ اِلَّا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ لَا قَادِرَ غَیْرُهٗ۔ وَلَا مُعْطِیَ وَلَا مَانِعَ وَلَا ضَارَّ وَلَا نَافِعَ غَیْرُهٗ وَلَا مُحْیِیَ وَمُمِیْتَ غَیْرُهٗ۔"

(ترجمہ)۔ بے شک مخلوق عاجز اور عدم محض ہے۔ نہ ہلاکت ان کے ہاتھ میں ہے اور نہ ملک۔ نہ مالداری ان کے قبضہ میں ہے، نہ فقر۔ نہ نقصان اُن کے ہاتھ میں ہے اور نہ نفع۔ نہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے پاس کوئی ملک ہے اور نہ اس کے سوا کوئی قادر ہے۔ نہ اس کے سوا کوئی دینے والا ہے، نہ روکنے والا نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع دے سکتا۔ نہ اس کے سوا کوئی زندگی دینے والا ہے نہ موت۔

یہی عقیدہ تمام اولیاء اللہ کا اور تمام اکابر اہل سنّت کا ہے۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھ پر بطور معجزہ کے اور اولیاء اللہ کے ہاتھ پر بطور کرامت کے جو چیزیں ظاہر فرماتے ہیں وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ اسی بناء پر اس کو معجزہ اور کرامت کہا جاتا ہے۔ معجزہ اور کرامت کو دیکھ کر ان کو خدائی میں شریک اور کائنات کا مالک و مختار سمجھ لینا حماقت ہے۔ یہی حماقت عیسائیوں سے سرزد ہوئی جب انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر (مثلاً مُردوں کو زندہ کرنے سے) اُن کو خود خدائی کا حصے دار سمجھ لیا۔ قرآن کریم کی دعوت کا سب سے اہم ترین موضوع اور انبیاء کرام کی بعثت کا

سب سے بڑا مقصد حق تعالیٰ کی توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال ہے۔ قرآن کریم نے حق تعالیٰ شانہٗ کی الوہیت کے جو دلائل بار بار مختلف پیرایوں میں بیان فرمائے ہیں ان میں سب سے زیادہ واضح دلیل یہی ہے کہ بتاؤ! کائنات میں متصرف کون ہے؟ رزق کون دیتا ہے؟ موت و حیات اور صحت و مرض کس کے قبضہ میں ہے؟ نفع و نقصان کا کون مالک ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو احکام صادر ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تشریعی احکام جو انبیاء کرام علیہم السلام کی معرفت بندوں کو دئے گئے ہیں۔ اور دوسرے تکوینی احکام جو کائنات کی ہر چیز پر جاری ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے تشریعی احکام سے کوئی مکلّف مستثنیٰ نہیں، خواہ وہ خدا تعالیٰ کا کتنا ہی مقرب ہو، اسی طرح اس کے تکوینی احکام سے کوئی مخلوق خارج نہیں خواہ آسمان کی مخلوق ہو یا زمین کی۔ وہ انبیاء کرام علیہم السلام ہوں یا خدا تعالیٰ کے فرشتے۔ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کی پابند۔ اور اس کی قضاء و قدر کے تحت ہے۔ لوگ انبیاء و اولیا کو کائنات کے اختیارات تفویض کرتے ہیں۔ حالانکہ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت نصیب فرمائی وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کے ہاتھ میں "مردہ بدست زندہ" کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ہم جیسے محجوب لوگ جو اپنی خود مختاری پر ناز کرتے ہیں حضرات عارفین تو اس سے بھی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلئے انبیاء و اولیاء کو کائنات میں متصرف سمجھنا خود اکابر کے ذوق و مسلک اور ان کی دعوت کے خلاف ہے۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

عیدِ میلادُ النبیؐ

۱۲ ربیع الاوّل کو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا "جشن عید
جاتا ہے اور آج کل اسے اہلِ سنت کا خاص شعار سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کے بارے
ضروری نکات عرض کرتا ہوں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر ایک اعلیٰ ترین عبادت بلکہ روحِ ایمان
صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ سرمۂ چشم بصیرت ہے۔ آپؐ کی
آپؐ کی صغر سنی، آپؐ کا شباب۔ آپؐ کی بعثت، آپ کی دعوت، آپؐ کا جہاد،
قربانی۔ آپؐ کا ذکر و فکر، آپؐ کی عبادت و نماز، آپؐ کے اخلاق و شمائل، آ
صورت و سیرت، آپؐ کا زہد و تقویٰ، آپ کا علم و خشیت، آپؐ کا اٹھنا بیٹھنا
پھرنا، سونا جاگنا، آپؐ کی صلح و جنگ۔ خفگی و غصہ، رحمت و شفقت، تبسم و
الغرض آپؐ کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت و سکون اُمت کے لئے اُسوہ حسنہ
ہدایت ہے اور اس کا سیکھنا سکھانا، اس کا مذاکرہ کرنا، دعوت دینا اُمت کا ف
صلی اللہ علیہ وسلم۔

اسی طرح آپؐ سے نسبت رکھنے والی شخصیات اور چیزوں کا تذکرہ بھی عباد
آپؐ کے احباب و اصحاب، ازدواج و اولاد، خدام و عمال، آپؐ کا لباس، پوشا
کے ہتھیاروں، آپ کے گھوڑوں، خچروں اور ناقہ کا تذکرہ۔ بھی عین عبادت ہے۔ کیو

دراصل ان چیزوں کا تذکرہ نہیں بلکہ آپؐ کی نسبت کا تذکرہ ہے صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک ولادت شریفہ سے لے کر قبل از نبوت تک کا اور دوسرا بعثت سے لے کر وصال شریف تک کا۔ پہلے حصے کے جستہ جستہ بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں ۔ اور حیات طیبہ کا دوسرا حصہ ۔ جسے قرآن کریم نے اُمت کے لئے "اُسوۂ حسنہ" فرمایا ہے ۔ اس کا کل ریکارڈ حدیث وسیرت کی شکل میں محفوظ ہے اور اس کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ آپؐ باہمہ خوبی و زیبائی گویا ہماری آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں اور آپؐ کے جمال جہاں آرا کی ایک ایک ادا اس میں صاف جھلک رہی ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

بلا مبالغہ یہ اسلام کا عظیم ترین اعجاز اور اس اُمت مرحومہ کی بلند ترین سعادت ہے کہ ان کے پاس ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پورا ریکارڈ موجود ہے اور وہ ایک ایک واقعہ کے بارے میں دلیل و ثبوت کے ساتھ نشاندہی کرسکتی ہے کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے ۔ اس کے برعکس آج دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جن کے پاس ان کے ہادی کی زندگی کا صحیح اور مستند ریکارڈ موجود ہو ۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو بیان کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے ایک ایک نقشے کو اپنی زندگی کے ظاہر و باطن پر اس طرح آویزاں کیا جائے کہ آپؐ کے ہر اُمتی کی صورت و سیرت، چال ڈھال، رفتار و گفتار، اخلاق و ادا آپؐ کی سیرت کا مرقع بن جائے اور دیکھنے والے کو نظر آئے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی موقعہ ملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے ہر مجلس و محفل کو معمور و معطر کیا جائے ۔ آپ کے فضائل و کمالات اور آپؐ کے برکت اعمال و اخلاق اور طریقوں کا تذکرہ کیا جائے اور آپ کی زندگی کے ہر نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی جائے ۔

[illegible]

طریقوں پہ عامل تھے ۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنّت کو اپنے عمل سے زندہ کرتے تھے اور ہر محفل و مجلس میں آپؐ کی سیرتِ طیبّہ کا تذکرہ کرتے تھے ۔ آپؐ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کا یہ واقعہ سُنا ہوگا کہ ان کے آخری لمحات حیات میں ایک نوجوان ان کی عیادت کے لئے آیا ۔ واپس جانے لگا تو حضرت نے فرمایا : برخوردار تمہاری چادر ٹخنوں سے نیچی ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے خلاف ہے ۔ ان کے صاحبزادے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہٗ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو اپنانے کا اسقدر شوق تھا کہ جب حج پہ تشریف لے جاتے تو جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اپنے سفرِ حج میں پڑاؤ کیا تھا وہاں اترتے ۔ جس درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا اس درخت کے نیچے آرام کرتے اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فطری ضرورت کے لئے اُترے تھے خواہ تقاضا نہ ہوتا تب بھی وہاں اترتے اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے اُس کی نقل اُتارتے ۔ رضی اللہ عنہٗ ۔ یہی عاشقانِ رسول تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کے دم قدم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ صرف اوراق و کتب کی زینت نہیں رہی بلکہ جیتی جاگتی زندگی میں جلوہ گر ہوئی اور اس کی بوئے عنبرین نے مشام عالم کو معطر کیا ۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ بہت سے ایسے ممالک میں پہنچے جن کی زبان نہیں جانتے تھے نہ وہ اُن کی لغت سے آشنا تھے مگر ان کی شکل و صورت ، اخلاق و کردار اعمال و معاملات کو دیکھ کر علاقوں کے علاقے اسلام کے حلقہ بگوش اور جمالِ محمدی کے غلام بے دام بن گئے ۔ یہ سیرت نبویؐ کی کشش تھا جس کا پیغام ہر مسلمان اپنے عمل سے دیتا تھا ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۴ ۔ سلف صالحین نے کبھی سیرت النبی کے جلسے نہیں کئے اور نہ میلاد کی محفلیں سجائیں اسلئے کہ وہاں "ہر روز ، روزِ عید اور ہر شب ، شبِ برات " کا قصہ تھا ۔ ظاہر ہے کہ جب ان کی پوری زندگی "سیرت النبی " کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ، جب ان کی ہر

و مجلس کا موضوع ہی سیرتِ طیبہ تھا اور جب ان کا ہر قول و عمل سیرۃ النبی کا مدرسہ تھا تو ان کو اس نام کے جلسوں کی نوبت کب آسکتی تھی لیکن جوں جوں زمانہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دَور سے بُعد ہوتا گیا' عمل کے بجائے قول کا اور کردار کے بجائے گفتار کا سِکّہ چلنے لگا۔

الحمدللہ یہ اُمت کبھی بانجھ نہیں ہوئی۔ آج اس گئے گذرے دور میں بھی اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے موجود ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا آئینہ سامنے رکھ کر اپنی زندگی کے گیسو و کاکل سنوارتے ہیں اور ان کے لئے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سُنّت ملک سلیمان اور گنج قارون سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن مجھے شرمساری کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ ایسے لوگ کم ہیں جب کہ ہم میں سے اکثریت مجھ ایسے بدنام کنندہ گکوئے ناموں اور نعرہ بازوں کی ہے جو سال میں ایک دو بار سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نعرے لگا کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے ذمہ ان کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حق تھا وہ قرض انھوں نے پورا ادا کر دیا اور اب ان کے لئے شفاعت واجب ہو چکی ہے۔ مگر ان کی زندگی کے کسی گوشے میں دور دور تک سیرت طیبہ کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت کے ایک ایک نشان کو اُنھوں نے اپنی زندگی کے دامن سے کُھرچ کُھرچ کر صاف کر ڈالا ہے اور روزمرہ نہیں بلکہ ہر لمحہ اس کی مشق جاری رہتی ہے مگر ان کے پتھر دل کو کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سُنّتوں اور اپنے طریقوں کے مٹنے سے کتنی تکلیف اور اذیّت ہوتی ہوگی۔ وہ اس خوش فہمی میں ہیں کہ بس قوالی کے دو چار نغمے سُننے' نعت شریف کے دو چار شعر پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

۵۔ میلاد کی محفلوں کے وجود سے اُمّت کی چھ صدیاں خالی گذرتی ہیں اور ان چھ صدیوں میں جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں مسلمانوں نے کبھی "سیرت النبی" کے نام سے

کوئی محفل نہیں سجائی۔ "محفلِ میلاد" کا آغاز سب سے پہلے ۶۰۴ھ میں سلا
ابوسعید مظفر اور ابوالخطاب ابن دحیہ نے کیا جس میں تین چیزیں بطورِ خاص ملحوظ

- بارہ ربیع الاول کی تاریخ کا تعین
- علماء وصلحاء کا اجتماع
- اور ختم محفل پر اطعام طعام کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح

فتوح کو ایصال ثواب۔ ان دونوں صاحبوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ
قماش کے آدمی تھے ؟ بعض مورخین نے ان کو فاسق وکذاب لکھا ہے اور بعض نے
وثقہ۔ وَاللّٰہُ اَعْلَم۔

جب یہ نئی رسم نکلی تو علمائے اُمّت کے درمیان اس کے جواز وعدم جوا
بحث چلی۔ علّامہ فاکہانیؒ اور ان کے رفقاء نے ان خود ساختہ قیود کی بناء پر اس سے
سے عذر کیا اور اسے "بدعت سیئہ" قرار دیا۔ اور دیگر علماء نے سلطان کی ہمنو
اور ان قیود کو مباح سمجھ کر اس کے جواز و استحسان کا فتوٰی دیا۔ جب ایک بار
چل نکلی تو یہ صرف "علماء وصلحا کے اجتماع" تک محدود نہ رہی بلکہ عوام کے
میں آکر ان کی نئی نئی اختراعات کا تختۂ مشق بنتی چلی گئی۔ آج ہمارے سامنے
میلاد النّبی (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی جو ترقی یافتہ شکل موجود ہے (اور ابھی خدا ہی
جانتا ہے کہ اس میں مزید کتنی ترقی مقدر ہے) اب ہمیں اس کا جائزہ لینا ہے۔

۶۔ سب سے پہلے دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ جو فعل صحابہ وتابعین کے زما
کبھی نہیں ہوا بلکہ جس کے وجود سے اسلام کی چھ صدیاں چلی آئی ہیں آج وہ "ا
شعار" کہلاتا ہے۔ اس شعارِ اسلام کو زندہ کرنے والے "عاشقانِ رسول"
ہیں اور جو لوگ اس نو ایجاد شعارِ اسلام سے نا آشنا ہوں ان کو دشمنانِ
تصور کیا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

کاش! ان حضرات نے کبھی یہ سوچا ہوتا کہ چھ صدیوں کے جو مسلمان ان کے اس خود تراشیدہ شعارِ اسلام سے محروم رہے ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کیا وہ سب نعوذ باللہ دشمنانِ رسول تھے؟ اور پھر انھوں نے اس بات پر بھی غور کیا ہوتا کہ اسلام کی تکمیل کا اعلان تو حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کونسا پیغمبر آیا تھا جس نے ایک ایسی چیز کو ان کے لئے شعار اسلام بنا دیا جس سے چھ صدیوں کے مسلمان نا آشنا تھے؟ کیا اسلام میرے یا کسی کے ابا کے گھر کی چیز ہے کہ جب چاہو اس کی کچھ چیزیں حذف کر دو اور جب چاہو اس میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ کر ڈالو؟

۷۔ دراصل اسلام سے پہلے قوموں میں اپنے بزرگوں اور بانیانِ مذہب کی برسی منانے کا معمول ہے جیسا کہ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم ولادت پر "عید میلاد" منائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے برسی منانے کی رسم کو ختم کر دیا تھا اور اس میں دو حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سالگرہ کے موقع پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ اسلام کی دعوت اور اس کی روح و مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اسلام اس ظاہری سج دھج، نمود و نمائش اور نعرہ بازی کا قائل نہیں، وہ اس شور و شغب اور ہاؤ ہو سے ہٹ کر اپنی دعوت کا آغاز دلوں کی تبدیلی سے کرتا ہے اور عقائد حقہ، اخلاقِ حسنہ اور اعمال صالحہ کی تربیت سے "انسان سازی" کا کام کرتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ ظاہری مظاہرے ایک کوڑی کی قیمت بھی نہیں رکھتے، جن کے بارے میں کہا گیا ہے

"جگمگاتے در و دیوار دل بے نور ہیں"　　ع

دوسری حکمت یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح کسی خاص موسم میں برگ و بار نہیں لاتا، بلکہ وہ تو ایسا سدا بہار شجرِ طوبیٰ ہے، جس کا پھل اور سایہ دائم و قائم ہے گویا اس کے بارے میں قرآنی الفاظ میں "أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا

کہنا بجا ہے۔ اس کی دعوت اور اس کا پیغام کسی خاص تاریخ کا مرہون منت بلکہ آفاق و ازمان کو محیط ہے۔

اور پھر دوسری قوموں کے پاس تو دو چار ہستیاں ہوں گی جن کی سالگرہ وہ فارغ ہوجاتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے دامن میں ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ ایسی قد آور ہستیاں موجود ہیں جو ایک سے ایک بڑھ کر ہیں اور جن کی عظمت کے سامنے آسمان کی بلندیاں ہیچ اور نورانی فرشتوں کا تقدس گرد راہ ہے۔ اسلام کے پاس کم سوا لاکھ کی تعداد تو ان انبیاء کی ہے جو انسانیت کے ہیرو ہیں اور جن میں سے ایک کا وجود کائنات کی ساری چیزوں پر بھاری ہے۔ پھر انبیاء کرامؑ کے بعد کرامؓ کا قافلہ ہے۔ ان کی تعداد بھی سوا لاکھ سے کیا کم ہوگی؟ پھر ان کے ہر صدی کے وہ لاکھوں اکابر اولیاء اللہ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں رشد و ہدایت کے مینارۂ نور تھے اور جن کے آگے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اب اگر اسلام شخصیتوں کی سالگرہ منانے کا دروازہ کھول دیتا تو سوچیئے اس امت کو سال بھر میں سالگرہوں کے علاوہ کسی اور کام کے لئے ایک بھی فرصت ہوتی؟ چونکہ یہ چیز ہی اسلام کی دعوت اور اس کے مزاج کے تھی۔ اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین کے بعد چھ صدیوں تک امت کا مزاج اس کو قبول نہ کر سکا۔ اگر آپ نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی تاریخ میں چھٹی صدی وہ زمانہ ہے جس میں فرزندان تثلیث نے صلیبی جنگیں لڑیں اور مسیحیت کے ناپاک اور منحوس قدموں نے عالم اسلام روند ڈالا، ادھر مسلمانوں کا اسلامی مزاج داخلی و خارجی فتنوں کی مسلسل یلغار کمزور پڑ گیا تھا۔ ادھر مسیحیت کا عالم اسلام پر فاتحانہ حملہ ہوا، اور مسلمانوں میں مفتوح کا سا احساس کمتری پیدا ہوا، اسلئے عیسائیوں کی تقلید میں یہ قوم بھی سال

اپنے مقدس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے "یوم ولادت" کا جشن منانے لگی تھی یہ قوم کے کمزور اعصاب کی تسکین کا ذریعہ تھا۔ تاہم جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اُمت کے مجموعی مزاج نے اس کو قبول نہیں کیا بلکہ ساتویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک علماء اُمت نے اسے "بدعت" قرار دیا اور اُسے "ہر بدعت گمراہی ہے" کے زمرے میں شمار کیا۔

۸۔ اگرچہ میلاد کی رسم ساتویں صدی کے آغاز سے شروع ہو چکی تھی۔ اور لوگوں نے اس میں بہت سے اُمور کے اضافے بھی کئے لیکن کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اسے "عید" کا نام دیتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "میری قبر کو "عید" نہ بنانا"۔ اور میں اُوپر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ "عید" بنانے کی ممانعت کیوں فرمائی گئی تھی مگر اب چند سالوں سے اسی سالگرہ کو "عید میلاد النبی" کہلانے کا شرف بھی حاصل ہو گیا ہے۔

دُنیا کا کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے "عید" کے دو دن مقرر کئے ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو بھی "عید" کہنا صحیح ہوتا، اور اسلام کے مزاج سے یہ چیز کوئی مناسبت رکھتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کو "عید" قرار دے سکتے تھے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ پسندیدہ چیز ہوتی تو آپ نہ سہی، آپ کے خلفائے راشدین ہی آپ کے یوم ولادت کو "عید" کہہ کر جشنِ عید میلاد النبی" کی طرح ڈالتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جس سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں یا یہ کہ ہم اس کو "عید" کہنے میں غلطی پر ہیں۔ یا یہ کہ نعوذ باللہ ہم کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی خوشی ہے مگر صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین کو کوئی خوشی نہیں تھی، انہیں آپ سے اتنا عشق بھی نہیں تھا جتنا ہمیں ہے۔

مسلّم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں تو اختلاف ہے بعض ۹، ربیع الاول بتاتے ہیں، بعض ۸، ربیع الاول اور مشہور بارہ ربیع الاول ہے۔ لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ شریفہ ۱۲، ربیع الاول ہی کو ہوئی۔

گویا ہم نے "جشن عید" کے لئے دن بھی تجویز کیا تو وہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے داغِ مفارقت دے گئے۔ اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے کہ تم لوگ "جشن عید" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ پہ مناتے ہو ؟ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خوشی میں ؟ (نعوذ باللہ) تو شاید ہمیں اس کا جواب دینا بھی مشکل ہو گا۔

بہرحال اس دن کو "عید" کہنا معمولی بات نہیں سمجھتا بلکہ اس کو صاف صاف تحریف فی الدین سمجھتا ہوں۔ اسلئے کہ "عید" اسلامی اصطلاح ہے اور اسلامی اصطلاحات کو اپنی خود رائی سے غیر منقول جگہوں پہ استعمال کرنا دین میں تحریف ہے۔

۹۔ اور پھر یہ "عید" جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مطابق منائی جاتی ہے وہ بھی لائقِ شرم ہے۔ بے ریش لڑکے غلط سلط نعتیں پڑھتے ہیں۔ موضوع اور من گھڑت قصے کہانیاں، جن کا حدیث و سیرت کی کسی کتاب میں کوئی وجود نہیں، بیان کی جاتی ہیں۔ شور و شغب ہوتا ہے۔ نمازیں غارت ہوتی ہیں اور نامعلوم کیا کیا ہوتا ہے۔ کاش ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جو "بدعت" ایجاد کی گئی تھی، اس میں کم از کم آپؐ کی عظمت و تقدس ہی کو ملحوظ رکھا جاتا۔

غضب یہ کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان خرافاتی محفلوں میں بنفس نفیس تشریف بھی لاتے ہیں۔

فَيَا غُرْبَةَ الْإِسْلَامِ (ہائے ! اسلام کی بے چارگی !)

اکتوبر ۱۹۹۴ء
جلد : ۱۱ شمارہ : ۱۰
قیمت : ۶ روپے

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر: مومن خان شوق، رشید الدین
منیجنگ ایڈیٹر: محمد نہال احمد صدیقی

زرتعاون

ہندوستان	سالانہ ۶۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	" ۲۰۰ "	" ۳۶۰ "	" ۳۰۰۰ "
امریکہ	" ۴۰ ڈالر	" ۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	" ۲۵ پونڈ	" ۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	" ۱۷۵ پاکستانی روپے	" ۳۰۰ روپے	" ۲۰۰۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز - حیدرآباد - 1
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس
بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب ۱۴۷-۵-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سیرت کا پیغام

موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام

سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی، زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے، بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس وقت بھی چل رہا تھا، سارے کاروبار آج کی طرح جاری تھے، تجارت بھی تھی، زراعت بھی تھی، اور حکومتوں کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے، اس وقت کی دنیا میں لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی، حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے

"ان اللہ نظر الی اھل الارض فمقتھم عربھم و عجمھم الا بقایا من اھل الکتاب"

(اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر نظر ڈالی اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں کیا عرب کیا عجم سب کو بے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بیزار ہوا، سوائے اہل کتاب کے چند افراد کے)

ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ساتھ

ایک پوری قوم کے ظہور کا سامان کیا، ظاہر ہے کہ ان کو کسی ایسے مقصد کے لیے پیدا کیا تھا، دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا۔ جو کام وہ سب پورے انہماک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے، ان کے لیے ظاہر ہے کہ کسی نئی امت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی، اور انفاق زندگی کے اس پرسکون سمندر میں اس پتھر کے تلاطم کی حاجت نہ تھی، جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح و تقدیس کے لیے ہم نیاز مند پہلے سے کافی تھے ...... اس کے لیے اس خاکی پیکر کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

" انی اعلم مالا تعلمون "

گویا اشارہ فرمایا اور آگے چل کر واضح کر دیا کہ آدم صرف اسی کام کے لیے پیدا نہیں ہوئے جو ملائکہ انجام دے رہے تھے، ان سے خدا کو کچھ اور کام لینا ہے۔

اگر مسلمان صرف تجارت کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے تو مکہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے، اور مدینہ کے ان بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے، یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لیے ہم گنہگار کیا کم ہیں کہ اس کے لیے ایک نئی امت پیدا کی جا رہی ہے، اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام اور یمن اور عراق کے کاشتکاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشتکاری اور زراعت میں ہم محنت و کوشش کا کون سا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لیے ایک نئی امت کی بعثت ہو رہی ہے، اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا، اور حکومتوں کے نظم و نسق اور دفتری کاروبار کو معاوضہ لے کر چلانا تھا تو روم و ایران کے کارپردازانِ سلطنت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہم بہت ہیں، اور ہمارے بہت سے بھائی بے روزگار ہیں، اس کے لیے نئے امیدواروں کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیے پیدا کئے جارہے تھے، جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا، اور نہ دے سکتا تھا، اس کے لیے ایک نئی امت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی چنانچہ فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (آل عمران-۱۱)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش وتنعم کو خیرباد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کرلیں، اور نذریں موقعے کھو دیئے، پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا، ان مقاصد و مشاغل کے لیے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی، اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا، اور نہ یہ اہل عرب اور دنیا کی دوسری قوموں کے لیے وجہ شکایت تھی، انہوں نے تو بار بار انہیں چیزوں کی پیش کش کی (جو آج عام مسلمانوں کا منتہاہے) اور بار اسلام کے داعی نے ان کو ٹھکرایا، دولت و سرداری عیش و عشرت اور راحت و تن آسانی کی بڑی پیش کش کو نامنظور کیا، پھر اگر مسلمان اسی سطح پر آجاتا تھا۔ جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں، اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے، اور زندگی کے انہیں مشاغل میں منہمک اور سستو لپیا غرق ہوجاتا تھا۔ نامیں اہل عرب اور رومی اور ایرانی ڈھیلے ہوئے تھے اور انہیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی اپنا تھا جن کو ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے بہترین موقع پر رد کر چکے تھے تو

یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے اور اس بات کا اعلان انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر و حنین و احزاب اور قادسیہ و یرموک میں بہا بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سرداران قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کر کے وہ یہی کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا انہیں چیزوں کو ہم گنہگاروں نے تمہارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے پیش وہ تمام چیزیں اس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں تو کیا سا جدوجہد کا حاصل اور ان تمام قربانیوں کی قیمت وہ طرزِ زندگی ہے، جس کو تم نے اخت اور زندگی و اخلاق کی وہی سطح ہے جس پر تم نے قناعت کر لی ہے، اگر ان سرداران قر سے جو اسلام کے حریف تھے، کسی کو یہ جرح کرنے کا موقع ملے تو آج ہمارا کوئی بڑے سے بڑ وکیل بھی اس کا تشفی بخش اور مسکت جواب نہیں دے سکتا اور اُمت کے لیے اس پر شر ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے متعلق یہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آجائیں، آپ وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

"ما الفقر أخشى عليكم ولكن أخشى أن تبسط عليكم الدنيا كما بسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم كما أهلكتهم" ا

مجھے تمہارے بارے میں کچھ فقر و افلاس کا خطرہ نہیں ہے، مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی تو تم بھی اسی طرح اس میں حرص و مقابلہ کرو جیسے انھوں نے کیا تو تم کو بھی اسی طرح ہلاک کر دے جیسے ان کو ہلاک کیا۔

مدینہ کے انصاریوں نے جب اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور ا

جدوجہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل کر کے اپنے باغوں، کھیتوں اور کاروبار کو درست کر لیں اور کچھ مدت کے لیے صرف اپنے کاروبار میں مشغول ہونے کی اجازت حاصل کر لیں، یہ خطرہ بھی ان کے دل میں نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ ارکان دین نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ سے بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرا لیں، لیکن اسلام کی عملی جدوجہد اور دین کے فروغ اور اس عارضی یکسوئی کو بھی خودکشی کا مرادف قرار دیا گیا اور سورۂ بقرہ کی آیت نازل ہوئی جس کی تفسیر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اس طرح کی ہے۔

"وَاَنفِقُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَلَا تُلقُوا بِاَیدِیکُم اِلَی التَّھلُکَۃِ وَاَحسِنُوا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ المُحسِنِینَ" (سورہ بقرہ ۱۹۵)

اللہ کے راستہ پر خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور اچھی طرح کام کرو بیشک اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسلمان کی زندگی کی اصلی ساخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی دعوت اور عملی جدوجہد میں مشغول ہو یا اس دعوت و عملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لیے پشت پناہ و مددگار ہو، اس کے ساتھ بھی عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق رکھتا ہو، مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں، اور کسی طرح بھی یہ ایک مسلمان کا مقصود حیات نہیں ہو سکتا، جائز مشاغل زندگی، جائز وسائل معیشت ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ نیت و اجر طلبی کے ساتھ عبادت و قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں، اگر یہ سب دین کے سایہ میں ہوں اور صحیح مقاصد کا وسیلہ ہوں نہ کہ خود مقصود بالذات۔

سیرت محمدیؐ کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے۔ جو خاص مسلمانوں کے نام ہے، اس کی طرف توجہ نہ کرنا اس کے مقصد کو ضائع کرنا اور سب سے بڑی حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہے، جو سیرت محمدیؐ مسلمانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

انورالجندی ۔ آفتاب عالم ندوی

علامہ سید ابوالحسن علی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قابل فخر فرزندوں میں مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن ندوی ایک ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک ہیں، آپ کا تعلق مشہور صاحب عزیمت و صاحب داعی اور مجاہد سید احمد شہید کے خانوادے سے ہے جنہوں نے برصغیر ہندوستان میں پہلی مرتبہ اصول و طریقہ پر حکومت قائم کرنے کی کوشش کی، اور اس راستے میں انہوں نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ سرزمین بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا ہے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سید احمد شہید کی دعوت و تحریک کے دوررس اور گہرے اثرات آج بھی ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ندوۃ العلماء سے اب تک سینکڑوں اہل قلم، مصنف، مفکر، داعی اور ادیب پیدا ہو چکے علامہ شبلی نعمانی اس عظیم درسگاہ تحریک کے بانیوں میں ہیں جنہوں نے عربی ادب اور اسلامی ... یہ وہی شبلی ہیں جنہوں نے ہندوستان میں بیٹھ کر مشہور عیسائی عربی ادیب مصنف جرجی زیدان کی شہرہ آفاق تصنیف "تاریخ التمدن الاسلامی" کا عربی میں رد کیا اس نے کتاب میں علامہ شبلی کا نام نہایت ادب و احترام سے لیا ہے

ندوی فرزندوں میں ایک بہت ہی ممتاز نام علامہ سید سلیمان ندوی کا ہے جو علامہ شبلی کے شاگرد رشید اور شیخ ابوالحسن کے محبوب و محترم استاد ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگردوں میں مولانا مسعود عالم ندوی بھی عالم اسلام میں محتاج تعارف نہیں۔

شیخ ابوالحسن ندوی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں، ان تمام حضرات نے زبان وقلم سے اسلام کے بارے میں عیسائی مشنریوں، سامراجی طاقتوں اور دوسرے دشمنان دین کے پھیلائے ہوئے شکوک وشبہات کے تیرہ وتاریک پردے کو چاک کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء نے شروع ہی سے اس بلند مقصد کی طرف توجہ دی، اس کے لیے اس نے ایسا نصاب و نظام تعلیم وتربیت وضع کیا جسے پڑھ لینے کے بعد اسلام کی نمائندگی وترجمانی ہر زمانے میں اسے عالم انسانیت کے لیے باعث نجات ورحمت ثابت کرنا اور عصری وعلمی اسلوب میں اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو جواب دے کر ان کے ذہن ودماغ کو مطمئن کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: "ندوہ کی بنیاد زمانے کے علماء اصحاب بصیرت وفراست اور ارباب فکر ودعوت نے رکھی، ان کی دور رس نگاہیں اس سنگین خطرے کے آثار کو دیکھ رہی تھیں جو جدید وقدیم تہذیب وثقافت اور فکر ومعیار کی کشمکش اور آویزش سے پیدا ہونے والا تھا۔ قدیم وجدید طبقوں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی اور جو دن بدن وسیع ہوتی جا رہی تھی اس کو پاٹنے کے لیے ایک معتدل اور متوازن فکر وتخیل کی انھوں نے ضرورت محسوس کی اور ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا، دونوں طبقوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کے لیے ندوۃ العلماء نے ایسا جامع نصاب تعلیم مرتب کیا جس میں نئی اسلامی پود کی اسلامی اخلاق و آداب پر تربیت کرنے اور نوجوان نسل کو کتاب وسنت میں گہرائی وگیرائی، عربی ادب میں قدرت ومہارت اور بقدر ضرورت عصری علوم اور جدید افکار ونظریات سے واقفیت وآگاہی عطا کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔

ندوۃ العلماء نے امت اسلامیہ کی مختلف مذاہب جماعتوں اور فرقوں کو باہم متحد ومتفق

ہو کر اور آپسی اختلافات و تنازعات کو بھلا کر اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلہ کے لیے سیسہ
ہونے کی دعوت دی، مدارس دینیہ کو نصاب تعلیم میں ضروری ترمیم و اصلاح اور اس میں بقدرِ ضرورت
عصری مضامین کے اضافے اور یونانی منطق و فلسفے کے غیر ضروری حصے کو نصاب سے خارج کرنے پر
آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

ندوۃ العلماء کی نمایاں خصوصیت جس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں عربی زبان وادب
کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے نصاب میں شامل کرنا ہے، اس نے اپنے مختلف ادوار میں ع
ادبا کی خدمات حاصل کیں۔ متعدد طلبہ کو عرب ملکوں میں بھیجا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی
عرصے میں قرآن و حدیث کی زبان میں اسلامی افکار کو طاقتور عربی عصری اسلوب میں پیش کرنے
والے متعدد اہل قلم پیدا ہو گئے۔ ندوۃ العلماء کی یہ خصوصیت آج بھی اسے دوسرے اداروں سے
ممتاز کرتی ہے، اس کے فضلاء آج پوری دنیا میں ادبی و فکری سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لے رہے
ہیں، ندوی فضلاء و مفکرین مسلکی و گروہی تعصب، انتہا پسندی اور غلو سے ہمیشہ دور رہے۔

اگر ندوۃ العلماء کے قیام کا یہی مقصد و پیغام ہے تو بلاشبہ شیخ ابوالحسن اس وقت
اس کے سب سے بڑے نمائندہ اور ترجمان ہیں، موجودہ زمانے میں ہر چہار طرف سے دشمنوں
نے اسلام پر اعتراضات و شبہات کے تیر برسائے، کسی نے اسلام کو آوٹ آف ڈیٹ اور
قیادت و سیادت کی صلاحیت سے محروم بتایا تو کسی نے کہا اسلام نے عورتوں پر ظلم کیا ہے۔
کسی نے اسلام کو ایک خونی مذہب کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی تو کسی نے محسن انسانیت
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنایا کسی نے ذخیرہ قرآن و حدیث کو مشکوک
کرنے کی ناکام کوشش کی تو کسی نے تعدد ازدواج کو اپنا موضوع بنایا۔

شیخ ابوالحسن کی بصیرت افروز و انقلاب آفریں تحریروں میں ہر زہر کا تریاق موجود ہے،
انہوں نے عالم اسلام کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا دورہ کیا، قاہرہ، دمشق، مکہ مکرمہ،
مدینہ منورہ، بغداد، طہران، کابل، لبنان، اسپین (لندن و امریکہ) لاہور اور ڈھاکہ میں

بڑے بڑے اجتماعات کو خطاب کیا، انہیں یاد دلایا کہ دنیا کو تباہی و بربادی کی کگار سے ہٹا کر امن و سلامتی، صلح و آشتی اور خوشحالی و فارغ البالی کے راستے پر صرف وہی گامزن کر سکتے ہیں۔ یہ سوختہ جاں مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کے لیے ہر وقت بے کل و بے چین رہتا ہے، اسی بے تابی میں کبھی نہر کابل اور نہر یرموک کا رخ کرتا ہے اور کبھی مشرق وسطیٰ اور ہر اس چپہ کا جہاں مسلمان بستے ہیں، جہاں انسانیت دور حاضر کے ظلم و استبداد سے کراہ رہی ہو تی ہے، ان جگہوں میں بھی جاتا ہے جہاں سے یورپ کے فکری سوتے پھوٹتے ہیں، کئی سال ہوئے آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں اس کی سرکردگی میں اسلامک سینٹر کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

شیخ ابوالحسن نے عربوں کو ان کا وہ عظیم تاریخی رول یاد دلایا جو انہوں نے تاریخ انسانی میں ادا کیا ہے، طاقت و قوت کے ان خزانوں کی نشاندہی کی جو ان کے سینوں میں مدفون ہیں، قومیت عربیہ کی لعنت میں گرفتار عربوں کو بتایا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان اور اس کی عزت و افتخار کا عنوان ہیں، اسلام ان کی قومیت ہے، حق گوئی و بے باکی سے شیخ ندوی کو نہ شامیوں کا جاہ و جلال باز رکھ سکا، نہ سلاطین کی عنایت و نوازش، نہ عوام کا غیظ و غضب، انہوں نے داد و تحسین کی تمنا اور ملامت کی پرواہ کیے بغیر ہر جگہ پیغام حق سنایا، مسلمانوں کی کمزوریوں اور بیماریوں کی نشاندہی کی، حق گوئی و بیباکی اس مرد مجاہد کی سرشت ہے، اس نے عربوں سے صاف صاف کہا، آپ خالق کائنات کی جانب سے دنیا کے نگراں و محتسب ہیں، لیکن اس عزت و افتخار اور اس اعزاز و اکرام کے لیے ایمان و اسلام شرط ہے، اس سے پہلے یہ عظیم منصب آپ سے چھین کر کسی دوسری قوم کو دے دیا جائے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ کی ذات عرب و عجم سے بے نیاز و مستغنی ہے، ناقدری کی صورت میں یہ نعمت آپ سے چھینی جا سکتی ہے، جس طرح کہ چھٹی صدی عیسوی میں تہذیب و تمدن، علم و فن اور دولت و ثروت کے ملک بنی اسرائیل سے چھین کر جاہل، نادار اور غیر مہذب عربوں کو دے دی گئی۔ شیخ ابوالحسن نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے عربوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، انہوں نے انہیں اپنے کھوئے ہوئے

مقام و مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ابھارا؟

شیخ ابوالحسن نے فتنۂ قومیت عربیہ کا جس شد و مد سے رد کیا شاید ہی کسی دوسری چیز کا کیا ہو، اس فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اسلام کی دولت کے بغیر کیا عربوں کے لیے وہ عظیم تاریخی رول ادا کرنا ممکن تھا جو انہوں نے کیا، آسمانی پیغام ہدایت کے بغیر کیا روم و ایران کو فتح کرنے کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا، اونٹ کے چرانے والے کیا اپنی تہذیب، اپنا تمدن، اور اپنی زبان کو قرآن کے بغیر دنیا کی دوسری متمدن قوموں میں رائج کر سکتے تھے؟ وہ کبھی نہیں ایک ہزار سال میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت نہ ہوتی تو آج نہ شام کا کہیں پتہ ہوتا، نہ عراق کا کہیں ذکر ملتا، نہ مصر کا وجود ہوتا، نہ عالم عربی عالم عربی ہوتا، اور یہیں تک نہیں، دنیا میں بھی تمدن و شائستگی علم و فن، اور تہذیب و تمدن کی ترقی اس سطح پر نہ ہوتی، جس سطح پر آج ہے، اگر عرب قوموں اور حکومتوں میں کوئی دین اسلام سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور اپنا رخ کعبۃ اللہ کے بجائے مغرب کی طرف پھیرتا ہے یا عرب کے عہد قدیم کی طرف حریصانہ نظر ڈالتا ہے یا اپنے نظام زندگی اور سیاست و حکومت میں مغربی دستور اور مغربی قوانین کی پیروی کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا قائد، اپنا رہبر، اسوہ اور معیار نہیں سمجھتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی نعمت کو فوراً واپس کر دے، اور اپنے پہلے دور جاہلیت کی طرف لوٹ جائے جہاں جہل و گمراہی تھی، جہاں فقر و فاقہ تھا، جہاں غفلت و بیکاری تھی، جہاں دنیا سے الگ تھلگ گوشۂ گمنامی میں ایک مجہول زندگی گزاری جا رہی تھی، اس لیے کہ یہ شاندار اور روشن تاریخ، یہ تابناک تہذیب، یہ بازار... یہ کتب خانے، یہ حکومتیں، یہ سلطنتیں صرف اسلام کا فیض، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آمد کا نتیجہ ہے۔

اسی جوش، اسی قوت اور اسی روانی سے شیخ مزید یہ لکھتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل بعض عرب ملکوں میں قومیت عربیہ کی دعوت دی جا رہی ہے، سرکاری

سطح پر اس کی تشہیر ہو رہی ہے، اسے ایک دین، ایک مذہب اور ایک نظریے کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، تو شدتِ غم سے دل ... "ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے" یہ ایک خطرناک اور منظم سازش ہے، سید العرب والعجم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے عربوں کے ربط و تعلق کو ختم کرنے کی، مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کی جس کی بنیاد ایمان، اسلام اور خاتم الانبیاء مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت کے اقرار پر ہے، یہ ایک قومی جرم ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے قومی جرائم کی تاریخ قاصر ہے، دنیا میں بہت سی تخریب پسند تحریکوں نے جنم لیا بعض دفعہ ان کی تخریب کاریوں سے دنیا کو شدید نقصان پہنچا، لیکن خدانخواستہ یہ تحریک اگر کسی درجہ میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے تو اس کی ہلاکت خیزیوں اور تباہ کاریوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ ندوی نے اس فتنۂ کبریٰ کی سنگینی، اس کے بھیانک نتائج اور اس سے عربوں کو پہنچنے والے نقصانات کی وضاحت کرتے ہوئے عربوں کو وہ معاہدہ یاد دلایا جو اسلام اور عربوں کے درمیان ہوا ہے۔ شیخ ندوی نے بتایا کہ آپ کی قسمت اسلام سے وابستہ کر دی گئی ہے، اسلام سے جدا ہو کر آپ کو نہ ماضی میں کبھی عزت و سربلندی اور کامیابی و کامرانی ملی ہے نہ مستقبل میں کبھی ملے گی۔

قومیت عربیہ شیخ ندوی کے ان سیکڑوں موضوعات میں سے ایک ہے جن پر انہوں نے کتابیں لکھیں، اسفار کیے، ارباب حل و عقد کو خطوط لکھے۔

دوسرا مسئلہ جسے شیخ ندوی نے اپنی تقریر و تحریر کا موضوع بنایا قضیۂ فلسطین ہے، اس مسئلہ کا شیخ ندوی نے جس گہرائی و گیرائی اور ایمانی بصیرت سے جائزہ لیا اس کے حقیقی اسباب و عوامل سے بحث کی وہ انہیں حقائق کا بہت پہلے انکشاف ہو گیا تھا جن کی تصدیق بعد کے واقعات و حادثات نے کی۔

دوسرے قضیوں کی طرح اس قضیہ کا بھی انہوں نے قرآن و حدیث، قوانینِ فطرت، سنت خداوندی اور تاریخ اقوام عالم کی روشنی میں مطالعہ کیا تھا اور اسی کی روشنی میں مطالعہ کیا

اور اسی کی روشنی میں اس کا حل پیش کیا، شیخ ندوی مسببات سے زیادہ اسباب اور واقعات سے زیادہ محرکات سے بحث کرتے ہیں، فلسطین کا المیہ ہو یا اندلس کے سقوط کا مسئلہ شیخ ندوی کے نزدیک ان کے اسباب و محرکات خارجی سے زیادہ داخلی ہیں۔ جو چھپکے چھپکے ایک مدت سے اپنا کام کر رہے تھے، عیش کوشی ولذت پرستی، دین وایمان کے تقاضوں کی ادائیگی میں غفلت وکوتاہی اور غیر اسلامی وغیر منطقی طرز زندگی اندر سے معاشرہ کو دیمک کی طرح چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کرتا رہتا ہے، اس طرح کے جانکاہ قومی حادثات اسی وقت پیش آتے ہیں جب اندرونی خرابیوں کی وجہ سے معاشرہ کھوکھلا ہو چکا ہوتا ہے، فلسطینی جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا سبب افرادی قوت کی کمی، اسلحوں کی عدم فراہمی آلات حرب وضرب کی کمیابی نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ ایمان ویقین کی کمزوری، احساس کمتری، خود اعتمادی وخودداری کا فقدان ہے، دشمنوں نے مسلمانوں کی طاقت وقوت کے سرچشمہ پر تاک کر حملہ کیا، ایمان ویقین کو شک وتذبذب خودداری، ایمانی احساس برتری اور عالی حوصلگی کو احساس کمتری، شکست خوردگی اور پست ہمتی میں بدل دیا، مسلمانوں کی نگاہ میں مشرق اور مشرق سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کمتر اور مغرب اور مغرب سے تعلق رکھنے والی ہر چیز بہتر اور افضل ہو گئی، آج اسلامی ممالک میں مادہ پرستی پوری شان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے، مغربی علوم اور تہذیب کے اثر سے آخرت اور حساب وکتاب کا خیال کمزور ہو گیا، دنیا کی اہمیت اور کشش بڑھ گئی، مادی قوموں کی تقلید میں ظاہری نمائش اور کھوکھلے مظاہر کی گرویدگی، انسانوں کی بندگی، قوت ودولت کے سامنے سرافگندگی اور شاہ پرستی میں کبھی کبھی یہ امت اور جفاکش قوم دوسری قوموں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔

آج امت کا بڑا طبقہ ایسا ہے جس کا ذہن ودماغ روشن لیکن روح تاریک اور ایمان ویقین کمزور ہے، یہ طبقہ اصول واخلاق پر فوائد اور مصلحتوں کو ترجیح دیتا ہے، اعزاز وقربانی کے حصول کی خاطر یہ اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے دین وایمان تک کا سودا کر سکتا ہے

یہ ہیں شیخ ندوی کے نزدیک مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے حقیقی اسباب۔

شیخ ندوی کے نزدیک عالم اسلام کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ایمان و یقین کے ساتھ وہ اپنے اقوال و افعال، تجارت و صنعت، حرفت و تعلیم اور سیاست و حکومت میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو جائے، کسی بھی میدان میں غیر کا دست نگر اور مغرب کا پروردۂ رحمت اور نمک خوار نہ رہے، دوسروں کی امداد اور قرضوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرے۔

شیخ ندوی کے نزدیک عالم اسلام کی شکست خوردگی و پژمردگی کے تین اسباب ہیں: ۱۔ مغربی تہذیب: ۲۔ عیش و تنعم: مغربی تہذیب اور مال و دولت کے سیلاب نے اس جفاکش امت کی فوجی خصوصیات و امتیازات کو ضائع کر دیا، شہسواری، عربی غیرت و حمیت اور مصائب کو برداشت کرنے کی قوت و صلاحیت اور آڑے وقتوں میں ثبات و استقامت جیسی اعلیٰ صفات کو سخت نقصان پہنچایا۔ ۳۔ وطنیت و قومیت: دین، ایمان اور عقیدہ کے بجائے لوگ اب وطنیت اور قومیت پر جان دے رہے ہیں، اس صنم اکبر نے اسلام اور مسلمانانِ عالم سے عربوں کے رشتہ کو کمزور اور انہیں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں محدود کر دیا۔

شیخ ندوی کا تیسرا اہم موضوع مغربی تہذیب ہے، کیونکہ ان کے نزدیک دنیا کی تباہی و بربادی کی اصل ذمہ داری یہی تہذیب ہے۔

یہ ہے شیخ ندوی کے نزدیک موجودہ اسلامی معاشرہ کی حقیقی صورت حال جسے بدلنے کے لیے نصف صدی سے وہ جد و جہد کر رہے ہیں۔

شیخ ندوی نے قادیانیت سے بھی عالم اسلام کو آگاہ کیا کہ یہ ختم نبوت اور اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی ایک خطرناک سازش ہے۔

شیخ ندوی کی کتاب زندگی کارناموں سے اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمات سے روشن ہے۔ اس مختصر مضمون میں ظاہر ہے چند نقطے ہی پیش کیے جا سکتے تھے۔

محمد محمود صواف، ترجمہ: مسعود الرحمن ندوی

اُمہاتُ المومنینؓ

کثرتِ تعداد کی حکمت

میری شدید خواہش تھی کہ حضورؐ کی کثرتِ ازواج کی حکمت پر ایک مضمون تحریر کروں اگرچہ موضوع پر اب تک بیشمار مضامین و کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن وہ اِدھر اُدھر منتشر ہیں یا پھر ان کی ا[...] ان سے بھرپور استفادہ میں مانع رہی ہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی خواہش کی تکمیل کے خیال سے لکھا گ[یا] ہے تاکہ اس اہم موضوع سے لوگوں کو باخبر کیا جا سکے۔ جس سے متعلق سوال کرنے والے اکثر سوال ک[رتے] رہے ہیں۔ اور افواہ پھیلانے والے افواہ بازی۔ اس باب میں کچھ حضرات نے خدا کی توفیق راہِ راست کو پا بھی لیا۔ تو کچھ ایسے بھی ہوئے جو گم گشتہ منزل ہی رہ گئے۔ جن کی نگاہوں کو ان کی کم علمی نے یا پھر تعصب نے خیرہ کر دیا [...] ان کی حق بینی کی صلاحیت کو زائل کر دیا [...] مغرب نے تو بعض لوگوں کو حضورؐ کی ذاتِ مبارکہ پر بھی طعن و تشنیع کرنے سے باز نہیں رکھا۔ نتیجۃً وہ غلط بیانی، تراشی، جھوٹ اور گمراہی و ضلالت کی دلدل میں دھنستے چلے گ[ئے]

دشمنانِ دین نے ہمیشہ یہ الزام لگایا ہے کہ حضورؐ نے شادیاں عیاشی، عورتوں کی محبت اور شہوت رانی کی غرض سے کی تھیں۔ نعوذ باللہ۔ لیکن اس الزام کے ساتھ کبھی انہوں نے نہیں سوچا کہ آپؐ نے اپنی ساری توانائی خدا کی طرف بلانے میں صرف کر دی اور آپ نے اس عظیم مقصد کے حصول کی خاطر عیش و آرام، دنیا اور متاعِ دنیا سب کچھ چھوڑ دیا اور دین کی تبلیغ و اشاعت کے

کٹھن راہوں پر چلتے رہے۔ آپ نے جو بھی شادیاں کیں وہ ارکان اسلام کو پختہ اور مضبوط بنانے کا سبب بنیں جو انصاف پسندوں کے سامنے آپ کی عظمت، بے پایاں الطاف و کرم، بلند ہمتی اور دور اندیشی کو اور بھی نمایاں کر دیتی ہیں۔

اگر دعوت دین اور اس کی تبلیغ کی شدید فکر دامنگیر نہ ہوتی تو حضورؐ کے لیے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد جن کے ساتھ آپ نے اپنی جوانی اور اپنی عمر کے بہترین ایام گزارے تھے کسی اور خاتون سے شادی کرنے کی کوئی ضرورت بالکل نہیں تھی۔

تبلیغ دین کی شدید خواہش ہی نے آپؐ کو ان لوگوں میں رشتۂ ازدواج قائم کرنے کے لیے مجبور کیا جن سے آپ کو تقویت ملے اور آپؐ کی ہمت افزائی ہو۔ آپ کے پیارے چچا اور آپ کی نیک رفیقۂ حیات دونوں ہی آپ سے رخصت ہو چکے تھے جو آپ کی نصرت و حمایت کرنے اور تقویت پہنچانے میں دو اہم ستون رہے۔ دوسری بات ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن خواتین سے آپ نے بعد میں شادیاں کیں حضرت عائشہؓ کو چھوڑ کر باقی سبھی بیوہ بے سہارا معمر خواتین تھیں جنہیں ان کے شوہروں نے بے آس و بے سہارا چھوڑ رکھا تھا۔

نفس پرستی اور ہوس رانی کے لیے آپ کے قلب مبارک میں ذرا سی بھی جگہ ہوتی تو نبوت ملنے سے پہلے ہی جن لڑکیوں کو آپ چاہتے اپنی زوجیت کے لیے منتخب فرما لیتے جبکہ آپؐ جوانی کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے اور آپ کے اعضاء جوارح مضبوط ہو چکے تھے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو اس مقصد میں کوئی شریعت حائل ہوتی نہ رسم و رواج ہی مانع ہوتے کیونکہ آپ پہلے سے لوگوں میں کافی معروف و مقبول تھے اور آپ کے اچھے اخلاق و عمدہ کردار، بہتر عادات، دلکش جمال اور زبردست طاقت و شجاعت کی شہرت عام تھی لیکن آپ نے یہ کچھ بھی نہ کیا۔ ذرا پیچھے پہلے آپ نے من پسند خواتین سے شادیاں نہیں کیں، جب آپ پچیس برس کے تھے اور عنفوان شباب کی منزل میں تھے اس وقت عرب میں زیادہ سے زیادہ عورتوں کے رکھنے کا رواج بھی تھا۔ ہر ایک وقت ایک شخص کے حرم سرا میں ۲۰ عورتیں تک پائی جاتی تھیں۔

آپؐ نے اسلام سے قبل حضرت خدیجہؓ کے علاوہ کسی اور خاتون سے شادی نہیں کی اور انہیں کی رفاقت میں اپنی جوانی اور کہولت کا حصہ بسر کر دیا۔ ہجرت سے تین سال قبل حضرت خدیجہؓ جن کی صحبت میں آپؐ نے پچیس ۲۵ سالوں کا عرصہ گزارا تھا۔ کا وصال ہو گیا تو آپ نے دوسری خواتین کے ساتھ شادی کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ شادیاں کرنے والے آپؐ ہی پہلے نبی نہیں ہوئے کہ فتنہ پرور اور دشنام طراز یہ الزام عائد کریں کہ "نبی بن جانے کے بعد مزید شادیاں کرنا محمدؐ کی شان سے فروتر بات تھی" ان لوگوں کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ آپؐ ہی شادیاں کرنے والے پہلے رسول نہیں ہوئے۔ آپؐ سے قبل اور رسولوں نے بھی شادیاں کی تھیں جو اس عمل میں بالکل حق بجانب تھے اور دنیا میں یہی سنت اللہ بھی رہی ہے۔ اس ذیل میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام جیسے معزز رسولوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جنہوں نے بہت سی شادیاں کی تھیں۔ لیکن کیا کوئی صاحب فہم انسان ان کی نبوت شریعت اور ان پر نازل ہونے والے صحف سماوی کے انکار کی جرأت کر سکتا ہے؟ پھر کثرت ازدواج آپ کی شان کو کیونکر گھٹا سکتی ہے۔ بلکہ رسالت محمدیؐ تو اس کی عین متقاضی ہے کہ دعوت و تبلیغ کے لیے بکثرت داعیان حق کا پایا جانا بے حد ضروری ہے جو لوگوں میں اس کی اشاعت و تبلیغ کر سکیں اور حق کا پیغام ہر فرد و بشر تک پہنچا سکیں۔ یہی بات ہر اس پیغام اور دعوت کے لئے ضروری ہے جو لوگوں میں بقائے دوام اور شہرت تام چاہتی ہو۔ اور انہیں اپنا ہمنوا و ہمدرد بنانے کی فکرمند ہو۔ دعوت اسلامی کے لئے جس کے آپؐ علمبردار تھے۔ یہ امر تو اور بھی ضروری ہے جو دعوت ہونے کی وجہ سے اپنے اندر بقائے دوام کے عمدہ عناصر رکھتی ہے۔

دعوت کا پیغام لے کر اٹھنے والے پہلے داعی کیلئے بے حد ضروری ہے کہ اسے اپنی دعوت پر پختہ یقین ہو۔ اور اس کے دل میں اصلاح کا جذبہ کار فرما ہو جہاں نشاط و بشاش اور سپاہی کا حوصلہ ہو۔ لوگوں سے میل و تکلم بڑھانے کا ان سے رابطہ قائم کرے اور وہ طرز اختیار کرے جو اسے لوگوں سے قریب کرے۔ تاکہ وہ اپنا پیغام ان کے دلوں تک پہنچا سکے۔ اور ظاہر ہے کہ دامادی اور نسب کے رشتہ

مضبوط رشتہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ایک داعی کی بیوی دعوت کے میدان میں سینکڑوں مردوں پر فائق ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کے ماں باپ، اہل خاندان اور قبیلہ اس سے مانوس و متعارف ہونے کی وجہ سے اس کے پیغام کو بغور سنیں گے۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے بھی دیگر پیغمبروں کی طرح کثرت ازدواج کا طریقہ اختیار کیا۔ ان خواتین سے آپ ﷺ نے شادیاں کیں، ان کے اہل خاندان، قبیلے میں متعارف ہو گئے۔ اور آپ ﷺ کی آواز ان کے لیے مانوس و مقبول بن گئی۔ آپ ﷺ کی بعض شادیاں قبائل کی ایذا رسانی سے نجات پانے کا بھی ذریعہ بنیں۔ کبھی تو آپ ﷺ نے اس جذبے سے شادی کی کہ عورت جو ہلاکت کے دہانے پر کھڑی تھی اپنی تباہی سے بچ جائے۔

آپ ﷺ نے تمام ازدواج مطہرات رض کے ساتھ ہمیشہ عمدہ برتاؤ کیا۔ انہیں بہتر بدلہ دیا۔ اگر آپ ﷺ انہیں اپنی زوجیت میں نہ لاتے تو وہ مشرکین کے پھندے، شرک میں پڑی رہ جائیں اور کبھی "امہات المومنین" کے شرف سے مشرف نہ ہوتیں۔ جبکہ آپ ﷺ کی یہ خواہش رہتی تھی کہ آپ ﷺ کی ہر ایک بیوی اسلام کی داعی بنے۔ اور اپنی ذات میں ایک انجمن کی مصداق ہو۔ جو لوگوں کی تعلیم و تربیت کرے۔ دینی معلومات میں انہیں فتوے دے اور ان کے سامنے حلال و حرام کی وضاحت کرے۔

چنانچہ آپ ﷺ کے گھر والے اہل ایمان کی تعلیم و تربیت کے لیے اور ان کی اصلاح کے لیے ایک درسگاہ ثابت ہوئے۔ جہاں اسوۂ رسول اور سیرت رسول کی فوری تعلیم دی جاتی۔ آپ ﷺ کے گھروں کے دروازے مسائل خواتین اور ذو محرم افراد کے لیے سدا کھلے رہتے تھے۔ اس وقت ان درسگاہوں کی بہت ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے گھروں میں کھول رکھا تھا سخت ضرورت تھی کہ دین ابھی ابھی آیا تھا۔ لوگوں کے لیے اسلام کی دعوت بالکل نئی سی چیز تھی۔ گو اس کی جڑیں مومنوں کے دلوں میں راسخ ہو چکی تھیں۔ اور خدا کی تائید سے اس کے بہتر نتائج ظاہر ہوتے جا رہے تھے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ امہات المومنین میں کل ۹ ازواج کو حضور ﷺ نے منتخب فرمایا۔ اور پوری امت اسلامیہ کے لیے خانگی مسائل، شرعی احکامات، ازدواجی معاملات

اور نبوی فیصلوں میں رہنمائی کرنے میں بہترین معلمات، اتالیق، مصلحات اور مفتیان دین ثابت ہوئیں۔ اور نیکی بھلائی اور عمل صالح کے میدان میں امت کے لیے ایک نمونہ بنیں۔ جیسے کہ آپ خود اپنی ان ازواج مطہرات کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنے میں ان تمام کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ آپ نے ان کے ہمراہ خوشگوار زندگی بسر کی اس میں ہمیشہ عدل و انصاف کا مظاہرہ کیا۔ انہیں بالخصوص عورتوں سے تعلق رکھنے والے شرعی احکامات سکھائے۔ اس طرح آپؐ نے ازواج مطہرات کی کثرت کی پس پردہ وہ حسن تدبیر اور بہتر سیاست پیش کی جس کی دعوت اسلامی اس وقت سخت متقاضی تھی کسی ایک بیوی یا دو بیویوں کے لیے اس عظیم بوجھ کو اٹھالینا یقیناً محال ہوتا جسے نیک طبع، خشوع و خضوع سے متصف، عبادت گزار اور پختہ ایمان رکھنے والی ۹ خواتین نے ایک ساتھ سنبھال رکھا تھا۔ جن احکامات شرعیہ کو ان سبھوں نے عمل کرا دیا تھا انہیں کوئی بھی عورت چاہے وہ کتنی ہی ذہین اور مضبوط حافظہ والی کیوں نہ ہو، یادداشت، فہم و فراست اور روایت کے اعتبار سے اکیلی احاطہ نہیں کر سکتی۔

حضورؐ کی ان ازواج مطہراتؓ سے بے شمار افراد نے مختلف شرعی احکامات بالخصوص خواتین سے متعلق مسائل کے سلسلے میں روایتیں نقل کی ہیں جن پر کتب احادیث بخوبی شاہد و عادل ہیں۔

حضورؐ کی پاکباز بیویوں اور ان کی کثرت تعداد کی حکمت و علت کے بارے میں اب تک جو باتیں بتائی جا چکی ہیں مجھے قوی امید ہے کہ صاحب دل اور حضور قلب سے پڑھنے اور سننے والوں کے لیے بہت کافی ہیں۔ ویسے خدا کے علاوہ کون ہے جو صراط مستقیم کی ہدایت و سیدھے عمل کی توفیق بخشے؟

دستور ہند اور انسانی حقوق

ڈاکٹر احمد اللہ خاں، پروفیسر قانون (عثمانیہ یونیورسٹی)

انسانی حقوق کی فہرست میں طبعی، معاشی، تہذیبی اور روحانی ضروریات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ انسانی بقا کے لیے صرف ہوا، پانی اور غذا ہی کافی نہیں ہوتے۔ بلکہ آزادی اور اظہار خیال، مساوات اور انصاف کا مطالبہ بھی حیات انسانی کے لیے مہذب دنیا میں ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس لیے عام طور پر انسانی حقوق کی اس فہرست میں حسب ذیل درجہ بندی قابل قبول طے پائی۔ مثلاً (۱) حق زندگی، اذیت اور ظلم سے تحفظ، شخصی وقار کا تحفظ اور حق مالی اور بے اصولی حراست وقید سے نجات (۲) معاشی اور سماجی حقوق جو انسانی وقار کی بقا کے لئے ضروری ہے، مثلاً کام کرنے کا حق، صحت عامہ، تعلیم، مناسب اجرت اور سوشل سیکوریٹی یعنی سماجی تحفظ وغیرہ۔ (۳) سیاسی اور شہری حقوق جیسے شخصی آزادی، آزادیٔ اظہار خیال اور مختلف شعبہ حیات میں مساوی شرکت و تعاون وغیرہ عالمی سطح پر انسانی حقوق کو حکومت برطانیہ نے ۱۲۱۵ء کے magna carta یا منشور اعظم کے ذریعہ تسلیم کیا اور عوام کو بادشاہ کی مطلق العنانیت کے خلاف تحفظات ملنے کے بعد دیگر ممالک اور حکومتوں نے بھی اس سمت میں پیشرفت کی۔ لیکن جدید ہندوستان میں انسانی حقوق کی تاریخ ۱۸۹۵ء سے شروع ہوتی ہے جب لوک مانیہ تلک نے دستور ہند بل بنا کر عوام کے لیے بنیادی حقوق کا مطالبہ کیا۔

کامن ویلتھ آف انڈیا بل بابتہ ۱۹۲۵ء میں مسز اینی بیسنٹ کے تعاون سے بنیادی حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۷ء کے سالانہ سیشن میں کانگریس نے ایک کمیٹی کا تقرر اس غرض سے کیا کہ وہ سوراج دستور کا مسودہ تیار کرے۔ اس من میں ایک رپورٹ پیش کی جس میں ۱۹ بنیادی حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء کا کراچی کانفرنس میں کانگریس نے پہلی مرتبہ معاشی حقوق کا اعلان کیا ۱۹۴۵ء میں تیج بہادر سپرو کی قیادت میں بنیادی حقوق کا مطالبہ کیا گیا جس میں بنیاد پر ۱۹۴۶ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اعلان کیا کہ عوام کو بنیادی حقوق کی فراہمی اس کا اہم مقصد ہے۔ چنانچہ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت نہرو نے قانون ساز اسمبلی میں قرار داد پیش کی جس میں تمام انسانی حقوق کو دستور ہند کی بنیاد بنانے پر زور دیا گیا۔ اس طرح دستور ہند کے تیسرے اور چوتھے باب میں انسانی حقوق کو بالترتیب بنیادی حقوق اور حکومت کے رہنمایانہ اصول کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ لیکن دستور ہند کی تدوین کے وقت سے دستور کے تیسرے باب میں شامل بنیادی حقوق اور چوتھے باب میں شامل رہنمایانہ اصولوں کے درمیان ترجیحی دور کا سلسلہ چل پڑا۔ دستور ہند کے تیسرے باب میں شامل بنیادی حقوق بہت بڑی حد تک انسانی حقوق کی اقدار پر مبنی ہیں خصوصاً قانون کے آگے مساوات (آرٹیکل ۱۴) مذہب، نسل، ذات، اور مقام پیدائش کی بنیاد پر امتیاز تعصب کی ممانعت (آرٹیکل ۱۵) عوامی ملازمتوں میں مساوی مواقع (آرٹیکل ۱۶) چھوت چھات کی ممانعت (آرٹیکل ۱۷) وغیرہ ایسے بنیادی دستوری حقوق ہیں جن کی بنیاد انسانیت کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ لیکن دو دستوری دفعات ایسی ہیں جن پر انسانی حقوق کا بہت زیادہ انحصار ہے یہ دفعات حق آزادی سے متعلق آرٹیکل ۱۹ اور حق زندگی و شخصی آزادی سے متعلق آرٹیکل ۲۱ ہیں۔ آرٹیکل ۱۹ کے تحت تمام شہریوں کو حسب ذیل حقوق حاصل ہیں۔ (۱) آزادی تقریر و اظہار خیال (۲) بغیر ہتھیار کے پر امن طریقے سے جمع ہونا (۳) ایسوسی ایشن یا یونین قائم کرنا (۴) سرزمین ہند میں آزادی سے گھومنا پھرنا (۵) سرزمین ہند میں کہیں بھی رہنا یا مستقل سکونت

اختیار کرنا اور (۶) کوئی بھی پیشہ تجارت یا بزنس اختیار کرنا۔

لیکن یہ تمام حقوق "مناسب تحدیدات" کے تحت مشروط ہیں جس کی بنیاد مفادِ عامہ قرار پاتی ہے۔ آرٹیکل ۲۱ دستورِ ہند کا اہم ترین حق ہے۔ جو تمام شہریوں کو حق زندگی اور شخصی آزادی کا حقدار ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ اس آرٹیکل میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کی زندگی اور شخصی آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا سوائے اس طریقہ کار کے تحت جس کو قانون کے ذریعہ قائم کیا گیا۔

"دستورِ ہند کی مندرجہ بالا دو دفعات کو سپریم کورٹ نے خصوصاً گزشتہ چند برسوں میں فیصل شدہ مقدموں میں نئے معنیٰ اور نئی وسعتیں عطا کیں جو قانون کا ہر طالب علم محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہ الفاظ دیگر یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کا عالیہ فیصلہ ہندوستانی عدلیہ کا وہ امتیاز بن کر اس عظیم الشان ملک کی پیشانی پر درخشاں ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں مقدمات کے سمندر سے چیندہ چند موتی قارئین کرام کی خدمت میں بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں (۱) مینکا گاندھی کے پاسپورٹ کے اجرا سے متعلق مقدمہ میں سپریم کورٹ نے آزادی نقل وحرکت کے حق کی صراحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ حق نہ صرف ہندوستانی حدود میں آزادانہ نقل وحرکت سے متعلق ہے بلکہ بیرون ملک جانے کے لئے بھی اس حق کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور کسی بیرونی ملک جانے کے لیے پاسپورٹ کی اجرائی ضروری ہے۔ اس لیے کسی شہری کو بغیر مناسب وجوہات کے پاسپورٹ اجرا کرنے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس فیصلہ کی روشنی میں پاسپورٹ ایکٹ بابت ۱۹۶۷ء میں مناسب ترمیم کی گئی۔ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہوئے سپریم کورٹ نے حق تعلیم کو دستورِ ہند کی دفعہ ۲۱ کے تحت حق زندگی وشخصی آزادی کے دائرہ میں داخل کر دیا۔ ایک اور حالیہ مقدمہ اُنی کرشنن بنام حکومت آندھرا پردیش میں فیصلہ صادر فرماتے ہوئے سپریم کورٹ نے واضح کیا کہ ہر شہری کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ البتہ اس کے بعد تعلیم کا حصول حکومت کے مالی موقف اور وسائل پر منحصر ہوگا۔ قانون کی روشنی میں مجرم قرار پائے۔ افراد کے حقوق کے تعلق سے بھی سپریم کورٹ نے

سنیل بترا بنام دہلی ایڈمنسٹریشن کے مقدمہ میں کہا کہ ایسے مجرم کو جس پر قتل کا الزام ثابت کیا جا کر سزا کا اطلاق کیا جا رہا ہے "قید تنہائی" علاحدہ کمرہ میں بند نہیں رکھا جا سکتا۔ جب تک کہ ایسا کرنا دیگر وجوہات کی بنا پر ناگزیر قرار دیا جائے۔ اسی مقدمہ میں سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا کہ کسی مجرم کو زنجیروں میں باندھے رکھنا صرف اس بنا کر جائز نہیں ہے کہ وہ سزا یافتہ مجرم ہے۔ بلکہ اس کے لئے بھی معقول وجوہات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ مجرم تشدد مارپیٹ وغیرہ کا عادی ہے

انسانی حقوق کی عزت و احترام اس فیصلہ سے بھی عیاں ہے۔ جہاں سپریم کورٹ نے اسٹیٹ آف مہاراشٹر نام پربھاکر پانڈو رنگا (AIR -1966- SC-424) کے مقدمہ میں قیدی کے اس حق کا اعتراف کیا کہ وہ دوران قید اپنی نوشتہ کوئی کتاب یا تصنیف اشاعت کے لئے روانہ کر سکتا ہے۔ کم سے کم اجرت سے متعلق ایک اور دلچسپ مگر اہم مقدمہ ایشیاڈ کیس میں سپریم کورٹ نے Minimum Wages Act نیز Abolition Bonded Labour Act کے درمیان ایسا انوکھا رشتہ قائم کیا جس سے بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کی راہ ہموار ہو گی۔ یعنی اس مقدمہ میں سپریم کورٹ نے کہا کہ اگر کوئی جو قانون کے تحت مقرر کردہ اقل ترین اجرت مزدوروں کو نہ دے تو ایسے مزدور Bonded Labour بندھوا مزدور تصور کئے جائیں گے۔ بہرحال ایسے مقدمات کی فہرست بہت طویل ہے جو مضمون کی طوالت کا باعث بنے گی۔ اس لئے صرف مختصر حوالے کے طور پر عرض کیا جا سکتا ہے کہ سپریم کورٹ نے دستور ہند کے تحت عطا کردہ بنیادی حقوق کو وسعت عطا کر کے حق قانونی امداد، سرعت کے ساتھ حق سماعت، غیر معمولی اور بے جا سزاؤں کے خلاف تحفظ، 'حق معلومات' حق ہرجانہ وغیرہ جیسے حقوق بھی انسانی اصولوں کو بنیاد بنا کر دستور ہند کے دائرہ میں عطا فرمایا۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دستور ہند اور سپریم کورٹ کے درمیان یہ حسین امتزاج ہندوستانی جمہوریت و تہذیب دنیا کے ہر ایک رکن کی حیثیت سے یہاں مستحکم عطا کرنے میں اہم رول عطا کر رہا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ ہر شہری دستور ہند اور عدلیہ کے احترام کو پامال ہونے سے برقرار رکھنے میں اپنا تعاون دے۔ دیکھئے کہ شاہی نظام حکومت میں ایک بگڑے شہزادے کو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن ایک جمہوری نظام حکومت میں ایک شہری کا دوسرے شہری پر ظلم یا بیجا زیادتی برداشت نہیں کی جا سکتی۔

سید معین الدین احمد قادری

حقوقِ انسانی

اور

عدلِ اجتماعی کا اسلامی تصور

ٹاڈا (TADA) اختصار ہے THE TERRORIST & DISRUPTIVE (PREVENTION) ACT کا۔ سماج دشمن عناصر سے نپٹنے کی خاطر یہ قانون ۱۹۸۵ء میں بنایا گیا۔

حقوقِ انسانی کمیشن نے جو گزشتہ سال قائم کیا گیا پہلی بار پنجاب اور کشمیر کے علاوہ اس قانون کے جواز کو محلِ نظر قرار دیا۔

دو باتوں کو اس جیسے قانون کے جواز کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ دہلی میں پنجاب کے دہشت گردوں کی جانب سے رکھے جانے والے ٹرانسسٹر بم کا پھٹ پڑنا۔ جس کو بے ضرر سمجھ کر راہ گیروں نے اٹھا لیا تھا۔ دوسرے دہشت گردانہ کارروائیوں کی پنجاب اور کشمیر کے حدود کے باہر توسیع۔ اس قانون سازی کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا تھا۔ دہشت گردی کو [illegible] پنجاب اور [illegible] میں پھیلنے سے روکا جا سکے۔ اس قانون کا نفاذ ابتداً میں دو سال کے لیے [illegible] آج [illegible] ریاستوں [illegible] ۲۲ [illegible] اور ۲۱ [illegible] شہروں [illegible] ۱۴ [illegible] قانون کے عناصر [illegible] ۲ [illegible]

نہیں جیل (JAILNOBAIL) اور عدلیہ کی عدم مداخلت۔

حقوق انسانی کمیشن کے چیرمین سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج جسٹس رنگناتھ مصرا نے اس قانون کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا ہے حقوق انسانی کمیشن کو متعدد متاثرہ علاقوں بشمول کشمیر، پنجاب، آندھرا پردیش کے جائزاتی دورے کے دوران حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کی خامی ایسی شہادتیں ملی ہیں جو اس قانون کی منسوخی کا تقاضا کرتی ہیں۔

جسٹس رنگناتھ مصرا عدلیہ کے بلند منصب پر فائز رہ چکے ہیں۔ ماہر قانون کی حیثیت سے ان کے موقف کے درجۂ استناد کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا ان کے نزدیک اس قانون کی لا قانونیت کی بنیاد درج ذیل نکات پر ہے۔

(۱) اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی ذمہ داری ملزم پر ڈالی گئی ہے۔ حالاں کہ مسلمہ اصول قانون یہ ہے کہ استغاثہ پر واجب ہے کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے اور وہ ایسا نہ کر سکے تو ملزم کو بری الذمہ اور بے قصور قرار دے دیا جائے۔

(۲) پولیس ملزم سے اذیت رسانی اور تعذیب (TORTURE) کے ذریعہ جو اقبال جرم کراتی ہے اسکو عدالت میں قابل قبول قرار دیا گیا ہے

(۳) دہشت گردی اور تخریبی کارروائی کی تعریف اور وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اور جو کی گئی ہے اس میں اتنی گنجائش ہے کہ پرائیویٹ اور پبلک یا تشدد اور غیر متشدد سارے سرگرمیاں اس میں سما جاتی ہیں۔

ایکٹ کی لا قانونیت کا بنیادی نکتہ شق نمبر ا اور شق نمبر ۲ ہیں۔

ہندی آج کو بیان دیتے ہوئے اندرونی سلامتی کے وزیر مسٹر راجیش پائلٹ نے کہا "اگر ضرورت ہوئی اور اس کا غلط استعمال جاری رہا تو حکومت اس کو منسوخ کرنے میں تامل نہ کرے گی۔ ہوم منسٹر مسٹر چاون نے ۱۷ اگست کو راجیہ سبھا میں اعتراف کیا کہ ریاستی حکومتوں کو ان کی تحریری ہدایت کے باوجود کہ معمولی جرائم کے سلسلے میں ٹاڈا کا استعمال نہ کیا جائے۔ ٹاڈا کا غلط استعمال،

جاری ہے۔ متعدد ارکان نے اس کی فوری منسوخی کا مطالبہ کیا۔ سماج کے ہر طبقے، سیاسی جماعت، حقوق انسانی کی عالمی تنظیمیں یکساں طور پر اس کی منسوخی کی پکار کر رہی ہیں۔

اسلام کے خلاف "بعنوان بنیاد پرستی" صف بندی سرگرم تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر ماڈا کے سیاق و سباق میں حقوق انسانی اور اجتماعی عدل سے متعلق اسلام کے اصول و ضوابط کا ایجاز و اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے۔

حقوق انسانی کے تحفظ اور عدل و قسط کے قیام کے سلسلے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہوئے عدل و قسط کو بہر حال ملحوظ رکھا جائے۔

اس اصول کی خلاف ورزی نہ ہو، اس کے لئے اس نے لازم گردانا ہے کہ ذمہ دارانہ مناصب ان لوگوں کو تفویض کئے جائیں جو ذمہ داری کے تقاضے پوری کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کریں۔ مزید یہ ہدایت تھی کہ دشمن کے خلاف بھی فیصلہ کرنا ہو تو اس کی دشمنی تم کو مشتعل کر کے انصاف کا حق ادا کرنے سے باز نہ رکھے۔ انصاف کی زد خواہ خود تمہاری اپنی ذات پر پڑتی ہو۔ تمہارے والدین پر پڑتی ہو (جن کو عزیز رکھنا تمہارا فرض بھی ہے) تمہارے قریب ترین اعزہ پر پڑتی ہو، بہر حال تم کو عدل و قسط سے انحراف نہ کرنا چاہیے۔ اس بات کو بھی تمہارے عادلانہ فیصلے پر اثر انداز ہونا چاہیے کہ فریق معاملہ دولت مند ہے یا بے زر و مال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کی مذکورہ بالا ہدایات کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ نو باتوں میں ایک یہ کلمۃ العدل فی الغضب والرضا، بات انصاف کی کہنا کسی سے، خفگی ہو یا خوشنودی۔ ہدایات کے ساتھ خبردار بھی کیا گیا ہے کہ اگر لگ لپیٹ کی بات کی اور عدل و انصاف سے روگردانی کی تو سمجھ رکھو کہ معاملہ کسی ہ شاہد بے خبر سے نہیں اس ہستی سے ہے جو تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (

(النساء ۵۸، المائدہ ۸، النساء ۱۳۵)

اسلامی ریاست میں کسی شہری کی آزادی نفس اور حرمت جان و مال و آبرو پر کوئی

دست درازی نہ کی جائے۔ جب تک اس پر (یا اس کے خلاف) کوئی جرم ثابت نہ کر دیا جائے اور وہ کھلی عدالت میں مجرم نہ قرار پا جائے۔ اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضابطے اور طریق کار متعین کر دیا۔ صرف استغاثہ کے بیان پر فیصلہ نہ ہونا چاہیئے۔ ملزم کو بھی پوری سہولت ملنی چاہیئے کہ وہ اپنی صفائی میں بیان دے سکے۔ مزید یہ کہ کسی بھی شخص کو بغیر واجب عدالتی کارروائی کے جیل نہ بھیجا جانا چاہیئے۔ قاضی کو ہدایت:

" جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر بیٹھیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے جس طرح پہلے کی سنی ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمے کے فیصلے میں تصریح کی "اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔"

مقدمے کی تفصیل یہ ہے کہ "عراق کے نو مفتوح علاقے میں جھوٹی جھوٹی شہادتیں کھڑی کر کے دوسروں کو پکڑوا رہے تھے۔ اس کی شکایت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائی گئی تو آپ نے اپنے فیصلے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بیان عدل سے مراد معروف عدالتی کارروائی ہے۔ یعنی آدمی کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کیا جائے۔ اور اسے صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔ اسکے بغیر اسلام میں کوئی شخص قید نہیں کیا جا سکتا۔"

" ۔۔۔ خوارج، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ چہارم کی حکومت و خلافت ہی کو برحق و جائز نہ مانتے تھے۔ آپ نے انہیں لکھا تم جہاں چاہو رہو، ہمارے تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون نہ بہاؤ اور بدامنی نہ پھیلاؤ اور کسی پر ظلم نہ کرو۔ اگر ان کاموں میں سے کوئی کام تم کیا تو میں تمہارے خلاف جنگ کروں گا۔" (نیل الاوطار)

یعنی خیالات تم جو چاہو رکھو تمہارے خیالات اور نیت پر گرفت نہ کی جائے گی البتہ اگر تم اپنے خیالات کے مطابق حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرو گے تو یقیناً تمہارے خلاف کاروائی کی جائے گی۔"

"ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اسلامی تصور [illegible] کسی حال میں بھی انتظامیہ کو یہ اختیار دینے کا روادار نہیں ہے کہ وہ معروف عدالتی کارروائی کے بغیر یوں ہی جس کو چاہیں پکڑیں جسے چاہیں قید کر دیں۔ ۔ ۔ ۔ اسلام میں صدر ریاست اور گورنروں اور اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس سب کے لئے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت ہے کسی کے لیے کوئی [illegible] نہیں ہے کسی کے لیے [illegible] قانون کی پکڑ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں خود اپنے آپ کو پیش کیا کہ جس کو میرے خلاف کوئی دعویٰ ہو وہ آئے اور اپنا حق وصول کرے۔ حضرت عمرؓ نے [illegible] جبلہ بن ایہم غسانی سے قصاص دلوایا۔ حضرت عمرو بن العاص نے گورنروں کے لئے قانونی تحفظ کا مطالبہ کیا تو حضرت عمرؓ نے اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اور عام لوگوں کو یہ حق دیا کہ جس حاکم کے خلاف انہیں شکایت ہو اسے کھلی عدالت میں لائیں۔"

(اسلامی ریاست ص ۲۸۹-۲۹۰)

اسلام کے عنوان بنیادی حقوق [illegible] کے [illegible] وہ باہمی [illegible] جنگ [illegible] ہیں۔

[illegible] بانگ [illegible]

[illegible]

[illegible] چراغ بجھا یا [illegible]

سلسلہ صفحہ ۲۹

نیا ادب خواہ نثر ہو یا نظم پچھلے ادوار کے ادب سے صرف مختلف ہی نہیں بلکہ کئی حیثیتوں سے ارتقا کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ نام نہاد جدیدیوں کی ایک بڑی تعداد نئی راہوں کی تلاش میں گمراہ ہو گئی ہے۔ اور ادب کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہے۔ [illegible] ضرورت نہیں۔ ہم میں باصلاحیت لوگ موجود ہیں۔ جو ادب کی تطہیر کر سکتے ہیں [illegible] سے [illegible] کر مقابلہ کر [illegible] ۔ ۔ ۔

مسز ثمینہ بشیر
لکچرار تاریخ،
انوار العلوم کالج حیدرآباد

قطب شاہوں کی مذہبی رواداری
اس دور کے تلگو ادب کی روشنی میں

گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت، اس کے قیام سے زوال تک اپنی مذہبی رواداری، بھائی چارگی اور انسانی اقدار کی ترویج و ترقی کے لیے جانی و مانی جاتی ہے۔ قطب شاہوں کی روا داری کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ بات خاص طور سے نوٹ کی جائے کہ گولکنڈہ کا سماج مختلف مذ اتوں اور طبقوں کو ماننے والوں پر مشتمل تھا۔ سوسائٹی میں غیر مسلمانوں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن غیر مسلمانوں میں ذات پات کی تقسیم موجود تھی۔ مسلمانوں میں بھی مختلف فرقے موجود تھے۔ یہ تاریخ کا عجیب اتفاق ہے کہ سولہویں صدی میں ہندوستان کی کم سے کم تین بڑی ریاستوں کے حکمراں ہندوستان کے بکھرے ہوئے سماج کو ایکجا کرنے اور انتشار میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ مغلیہ سلطنت کے عظیم شہنشاہ اکبر اعظم، عادل شاہی سلطنت کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ اور قطب شاہی سلطنت کے محمد قلی قطب شاہ نے اسی مسئلہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔

اِس سلسلے میں قطب شاہوں کو دوسروں کے مقابل زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اِسی لئے کہ قطب شاہوں نے کسی بھی مذہب کے آئین کو نہ بدلنے کی کوشش کی اور نہ کوئی نیا مذہب ایجاد کیا، بلکہ انہوں نے گولکنڈہ میں ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس میں انسانی اقدار کو

بت دی گئی۔ ایسی تہذیب کی بنیاد ابراہیم قلی نے رکھی۔

ابراہیم قلی نے دیجے نگر کی ہندو حکومت میں آٹھ برس اپنی جلاوطنی کا زمانہ گزارا تھا۔
لیے وہ وقت اُسے غیر مسلمانوں کے قریب رہنے اور انہیں سمجھنے کا موقع ملا تھا بلکہ اسے تلگو زبان اور
ں کے ادب سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی ابراہیم قطب شاہ جب گولکنڈہ کا بادشاہ بنا تو اس
ل کھول کر تلگو ادب کی سرپرستی کی۔ اس کی کوشش اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ اس دور کے ادب
ابراہیم قطب شاہ کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ جسے پڑھ کر نہ صرف قطب شاہوں کی مذہبی رواداری
ت ملتا ہے بلکہ غیر مسلمانوں کے قطب شاہوں سے روابط کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔

تلگو کے شعراء نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنی شاعری میں ملک ابراہیم کے نام سے مخاطب کیا ہے
شعراء کی ایک کثیر تعداد ابراہیم کے دربار سے وابستہ تھی۔ ابراہیم نہ صرف انکی سرپرستی
اُردو اور فارسی شعراء کے برابر اعزازات، انعام و اکرام نواز تا تھا۔ ان شعراء نے دل کھول کر ابراہیم کی مدح کی اور نظمیں لکھیں۔
مداد کافی زیادہ ہے۔ اسلئے ہم ان میں سے چند ایک ہی کا تذکرہ کر سکیں گے۔

گنگا دھران شعراء کی فہرست کا پہلا شاعر ہے۔ جس نے اپنی نظم تاپتی سمبھارنو پکھیانم
THPTI SAMBARANOPAKNAYONAM کو ابراہیم کے نام منسوب کیا۔
اید یہ تاریخ ہند کا پہلا مسلمان بادشاہ ہے جسکے نام سے تلگو شاعر نے اپنی نظم منسوب کی ہے۔ [1]
PONNIKANTI TELANGANA پونی کنٹی تلنگانہ نے بھی اپنی ایک
ے ملک ابراہیم کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ نظم جس میں آگے چل کر شاعر نے ابراہیم کے ایک افسر
کی بڑی تعریف کی۔ تعریف ان اشعار سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں شاعر ابراہیم کو بادشاہوں کا
شاہ اور سخاوت اور خوبصورتی کا نمونہ بتاتا ہے۔ [2]

اسی شاعر کی دوسری نظم میں پھر دو تین اشعار ایسے ملتے ہیں جس میں شاعر نے ابراہیم کی
ے یہ لکھ کر کی ہے کہ اس کے دشمنوں کو جب میدان جنگ میں شکست ہوئی تو انہوں نے ابراہیم
کی مدد مانگی۔ ابراہیم رحم دل بادشاہ ہے [illegible] اس نے ان کی سیاست اور [illegible]

واپس کردی۔ شاعر اس نظم میں لکھتا ہے کہ آدمی قابل ہو تو وہ قدر دان ڈھونڈھ ہی لیتا ہے (۳)
تاپتی گنگا دھر TAPTI GANGADHAR نے اپنی ایک نظم میں ابراہیم کی تعریف
اس قدر کی ہے کہ وہ کھلا مبالغہ بن گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ماننا ہی پڑے گا کہ، اس
کی نظم ابراہیم سے، اسکی محبت کا کھلا ثبوت ہے۔

اپنی نظم میں وہ لکھتا ہے کہ ابراہیم کی صورت میں رام نے کلیگ میں پھر ایک بار جنم
لیا ہے تاکہ دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کردے، آگے چل کر وہ ابراہیم کی تعریف یوں کرتا ہے کہ جب
ابراہیم گھوڑے پر بیٹھ کر محل سے باہر آتا ہے تو اسکے گھوڑے کے سموں سے اتنی دھول اڑتی ہے کہ
نہ صرف لوگوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں بلکہ یہ دھول سورج کو بھی اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہے
شاعر کے خیال میں ابراہیم رحم و کرم میں رام کے برابر، پاکیزگی میں اگنی کے برابر شاہی ذمہ داریوں کو
پورا کرنے میں شیر شاہ کے برابر اور تیر اندازی میں ارجن کے برابر ہے (۴) ظاہر ہے کہ ابراہیم کی
یہ تعریف سوائے مبالغہ کے کچھ نہیں ہے۔ لیکن کسی شاعر کا کسی بادشاہ کو اس کے اپنے دیوتاؤں
کا درجہ دینا شاعر کی بادشاہ سے محبت اور ادب نوازی کا کھلا ثبوت ہے۔ قطب شاہی
بادشاہوں اور خاص طور سے ابراہیم قطب شاہ نے ادب کو مذہب، فرقہ، زبان اور ذات پات
کی بندشوں سے آزاد ہو کر دیکھا اور ادب کی سرپرستی کی قطب شاہوں کی یہی رواداری انکے دور کی
تہذیب کی اساس بنی ابراہیم تلگو کے شعرا کی دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا۔ اس لئے اس دور میں
تلگو کے شعرا کی بڑی تعداد تھی۔ تاریخ کے صفحات پر اسکا بھی ذکر ہے کہ ابراہیم نے تلگو شعرا کا
ایک مشاعرہ اپنے دربار میں منعقد کیا جس میں اس دور کے سب ہی بڑے شعرا مدعو کیے گئے اس
مشاعرے کے بعد ابراہیم نے ان تلگو شعرا کو دل کھول کر نوازا۔ اس کی فیاضی کو تلگو کے ایک شاعر
نے مشاعرے کے بعد اسطرح نظم کیا ہے کہ اگر ابراہیم مسکرائے تو سائنس اور موسیقی کے اسکالرس
کو ہزاروں میں نوازے گا۔ اگر وہ کسی شاعر کو مدعو کرے گا تو وہ لاکھوں میں نوازے گا اگر اسے
دربار میں بٹھا کر اسکا کلام سنے گا تو کروڑوں میں دے گا (۵)

یہ شاعری میں مبالغہ تو ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ابراہیم تلگو شعرا کی داد و دہش میں کبھی کمی نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب دورنا اکوی نے ابراہیم کی شان میں نظم کہی اور اسے سنائی تو ابراہیم نے شاعر کو نام CHINTALA PALAM چنتا پالم گاؤں جاگیر میں دے دیا یہ گاؤں اب بھی اس شاعر کے خاندان میں ورثہ چلا آرہا ہے (۱)

ان شعرا کے علاوہ اس دور کے کئی ایسے تلگو شعرا ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں ابراہیم قطب شاہ کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ یہ تعریف مبالغہ کی حد میں قرار ہے لیکن ان نظموں کو پڑھنے کے بعد ماننا ہی پڑتا ہے کہ قطب شاہوں کی حکومت میں مذہبی رواداری اور انسانی دوستی بنیادی مقام رکھتی تھی۔ یہی حیدرآباد کی تہذیب کی اساس تھی جس کی حفاظت خاص طور سے اس دور میں ضروری ہے۔

حوالے :

(۱) تلگو لٹریچر اور قطب شاہی ہیں - واسوتی صفحہ ۵۸
(۲) واسوتی صفحہ ۶۰
(۳) واسوتی صفحہ ۶۰
(۴) قطب شاہی دور کے مسلم امراء۔ ڈاکٹر صادق نقوی۔ صفحہ [illegible]
(۵) ڈاکٹر صادق نقوی صفحہ ۵۴
(۶) ڈاکٹر صادق نقوی۔ صفحہ ۵۴

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

ترقی پسندی اور جدیدیت

ترقی پسند تحریک کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور رشید جہاں وغیرہ نے لندن میں ڈالی۔ دوسرے ہی سال ۱۹۳۶ء میں پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی اسی وقت سے ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا باضابطہ ابتدا ہوئی۔ پہلے منشور کے تحت انجمن کا مقصد یہ قرار پایا کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ وہ بنیادی مسائل بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی وغیرہ تھے۔ اسکے ساتھ رجعت پسندی، فرسودہ رسوم و رواج اور توہمات کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ انگارے کے نام سے جو افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا اسے ترقی پسند تحریک کے ہراول کی حیثیت حاصل ہے۔

ان اثرات کے تحت دوسری جنگ عظیم کے اوائل تک جو ادب پیدا ہوا وہ بہت ہمت افزا تھا کیونکہ اس تحریک نے اجتماعی حیثیت سے سماجی اور بنیادی فکر کو شعوری طور پر پروان چڑھایا لیکن اسکے بعد ہی ترقی پسندی کے نام پر اس تحریک کا ہتھیار کی طرح استعمال کیا جانے لگا۔ یہ تحریک ادبی سے زیادہ سیاسی ہوکر کمیونزم و سوشلزم کے مخصوص سیاسی نظریے کی مقصدیت کی اسیر ہوگئی۔ نتیجتاً اس پر ہر طرف سے تنقیدیں شروع ہوئیں ان تنقیدوں نے جدید ادب کو نئی سمتیں دیں جو جدیدیت کی صورت میں ہمارے سامنے آئیں۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ جدیدیت ترقی پسندی کی

توسیع ہے جو ترقی پسند ادب کے خلاف ایک رد عمل تھا۔ فرق یہ ہوا کہ جہاں ترقی پسندی ایک مخصوص سیاسی فکر کا پرو پگنڈا بن کر محصور و محدود ہو گئی وہاں جدیدیت کے دائرۂ فکر میں اپنے تمام موضوعات آگئے جو ذات سے لیکر کائنات تک کا احاطہ کرتے تھے۔

جدیدیت کیا ہے؟ اسکو کسی محدود تعریف و توضیح میں منضبط نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر فرسودہ اقدار و تصورات کے خلاف ایسی تحریکات کو جدیدیت کا نام دے دیا جاتا ہے جو ادب میں نئے تجربات کیطرف مائل رہی ہیں۔ آج جب ہم اپنے ادب میں جدیدیت کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ایسے ادب سے ہوتا ہے جو ترقی پسند ادب سے مختلف ہے اور ماضی سے انحراف اور عصری اقدار کی پرستش اسکے لازمی جزو ہیں۔ لیکن جدید ادب سے مراد ہر وہ ادب نہیں جو اس زمانے میں لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ادب مراد ہے جو نئے طرز کے احساس کا حامل ہو اور اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے کے تمام امکانات کے ساتھ برتا گیا ہو۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جدیدیت اور جدت پرستی میں فرق ہے۔ جدید تخلیقی ادب عصری ترات کے محاسبہ کا نام ہے جبکہ جدت پرستی جدت برائے جدت کی جذباتی کیفیت ہے۔

جدیدیت کسی ایک فکری دھارے کا نام نہیں بلکہ اسمیں بہت سے مختلف اور متضاد سمتوں سے بہتے ہوئے دھارے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو کبھی آگے پھیلتے ہیں اور کبھی پیچھے۔ چنانچہ جب جدیدیت بھی انتہا پسندی کی رو میں بہہ کر منفی حیثیت اختیار کر گئی اور اس نے بھی ادبی کلاسیکی اور تہذیبی روایات سے اپنے رشتہ توڑ لیا تو اسکی ادبی حیثیت بھی داغدار ہو گئی۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب کوئی نئی تحریک شروع ہوتی ہے تو صالح عناصر کے ساتھ تخریبی عناصر بھی اس میں در آتے ہیں یعنی باصلاحیت لکھنے والوں کے ساتھ ایسے افراد کا ہجوم بھی شامل ہو جاتا ہے جو محض فیشن کے طور پر اپناتا ہے۔ چنانچہ جدیدیت کے ساتھ بھی یہی ہوا اس دھارے کے ساتھ خس و خاشاک بھی بہہ نکلے یہاں تک کہ بے معنی تحریر کو پیش کرنا ہی جدیدیت سمجھا جانے لگا۔ ایسے افراد کے ہاتھوں جدیدیت بدنام ہوئی اور بدقسمتی سے انہیں کی تعداد زیادہ ہے۔

آج جدیدیت پر مختلف سمتوں سے جو تنقید ہورہی ہیں انکا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) جدیدیت مغرب کی کورانہ تقلید ہے ۔ اسکے پاس نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی منزل ہے ۔ یہ ایک منفی گمراہ کن تحریک ہے۔

(۲) جدید ادب کلاسکیت کی نفی اور روایات کی شکست و ریخت کرتا ہے۔

(۳) اس میں تنظیم کی جگہ انتشار ہے ۔ عزم و یقین کے بجائے بے یقینی ہے۔

(۴) غیر صحتمند رجحانات کو ادب کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے گویا غیر صحتمند ہونا ہی جدیدیت کی دلیل ہے۔

(۵) جدیدیت رومانیت سے انحراف کا دوسرا نام ہے ۔ جمالیاتی پہلوؤں کی طرف اس کا مسلک مخالفانہ ہے۔

(۶) جدیدیت پر سب سے بڑا الزام ابہام کا ہے یعنی صاف اور واضح اظہار کے بجائے جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ فہم سے بالاتر ہے پیچیدگی اور ژولیدگی کو فن سمجھا جاتا ہے تخلیق کار اور قاری کے درمیان خاصی دوری آ گئی ہے ۔ یہ ابہام جدیدیت کا اہم رجحان بن کر ادب کے ہر شعبے میں داخل ہو گیا ہے ۔

بالخصوص نظم گو شاعروں نے شعوری طور پر نظم کو مبہم بنانے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے یہاں ابلاغ و ترسیل [illegible] ہے۔ معنی ڈھونڈنے کی ہر کوشش رائگاں جاتی ہے۔ ایسے ابہام پرست شعرا خود نہیں جانتے وہ کیا کہہ رہے ہیں ۔ پھر اس نظم میں نثری شاعری در آئی اور اس نے اردو شاعری کے لوازمات مثلاً اوزان و بحر سے بھی نظم کو آزاد کرا لیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ پابند شاعروں کا ایک خاصا گروہ بھی اس میں شامل ہو گیا ہے۔ نثری شاعری کا سب سے بڑا فائدہ نا شاعروں کو پہنچا جو چور دروازے سے شاعروں کی صف میں داخل ہو گئے اور راتوں رات شاعر ہو گئے۔

غزل میں جدیدیت کی [illegible] آئی [illegible] سے پہلو بچا کر نہ کوئی پسندوں نے [illegible] کہ غزل اپنی کلاسیکیت اور رومانیت سے محروم ہو گئی ۔ موضوعات سے متصادم کر کے اس کی

تیاتی قدریں چھین لی گئیں۔ ترقی پسند گرفت سے آزاد ہونے کے بعد غزل نے کھلی ہوا میں سانس لی۔ آزاد غزل گوشعرا نے غزل کو روایت پرستی اور فرسودگی سے نکال کر اسکو عصری تمایلات سے ہم آہنگ کیا۔ مضامین غزل میں تنوع پیدا کر کے اسے کائناتی وسعت عطا کی۔ نئی لفظیات داخل کر کے اس کی معنویت میں اضافہ کیا۔ نیا اسلوب نیا لہجہ دیا۔

لیکن ابھی نئی غزل سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ نام نہاد جدیدیت نے اس پر چھاپہ مارا۔ غزل کو نیا پیرایہ دینے کے شوق میں نئی غیر مانوس علامتیں وضع کیں۔ ان علامتوں [illegible] غزل میں آئی اس نے بدترین قسم کے ابہام کو جنم دیا۔ ایسے ڈکشن کو غزل کی زبان بنایا گیا، غزل کی ملایت جسکی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ کھردرے الفاظ کو نئی غزل کا طرۂ امتیاز کہا گیا۔ جانوروں اور درندوں کے نام تک غزل میں داخل ہو گئے

غزل پر دوسری ضرب آزاد غزل کی صورت میں پڑی۔ مصرعوں کو آزاد نظم کے اصول پر چھوٹا بڑا کیا گیا غزل اپنی مستانہ روی کی جگہ لنگڑانے لگی لیکن یہ تماشا جلد ختم ہو گیا۔ آزاد غزل اپنی موت آپ مر گئی۔

اُردو افسانے زد میں آئے تو صورت حال کچھ اور ہی ہوئی افسانے ابتدا میں مارکسیت اور فرائیڈ سے متاثر ہوئے اور حقیقت نگاری کے پردے میں گھناؤنی جنسیت اور عریانیت تک پہنچ گئے۔ بعد ازاں ایک اور لغویت کا شکار ہوئی تجریدی اور علامتی افسانے کی صورت میں آج جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ عام قاری کی سطح سے بالاتر ہے یہ افسانے ذہنی تعیش کا سامان فراہم نہیں کرتے۔ ان میں سب کچھ ہوتا ہے افسانہ نہیں ہوتا۔

میں اپنے اس بیان کو سمیٹتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ بظاہر جدیدیت کی دنیا قاموی فتنہ غیر مربوط ہے، جدیدیت کے مثبت پہلوؤں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو بڑی حد تک آج کی ضرورتوں کے مطابق ہیں۔ اس تمام افراط و تفریط کے باوجود آج

ڈاکٹر محبوب راہی

نقیبؔ کی شخصی اور تخلیقی شناخت

سرِدست اس بحث کی گنجائش نہیں کہ ودربھ کی زمین تخلیقِ شعروادب کیلیے کس قدر زرخیز ہے یا کتنی بنجر۔ تاہم اگر زمین کی زرخیزی یا شادابی کو محض کثرتِ پیداوار پر محمول کیا جائے تو کھیت اور باغات کے مقابلے میں دشت و کہسار کو فوقیت حاصل ہوگی کہ وہاں مقابلتاً جھاڑ جھنکاڑ اور گھاس پھوس بکثرت اُگتا ہے۔ اس فطری حقیقت کے تناظر میں اگر ہم ودربھ کے شہر شہر، قریہ قریہ شاعر شماری کریں تو نتیجتاً استعجاب انگیز صورتِ حال سے دوچار ہونگے کہ اردو کا تقریباً ہر تیسرا حرف شناس بزعم خود شاعر ہے لیکن یہ جانے کا نہیں سینہ پیٹنے کا مقام ہے کہ یہ شادابی دشت و کہسار والی شادابی ہے۔ ہر طرف جھاڑ جھنکار اور گھاس پھوس کی بھرمار، معاذاللہ۔

ہم لاکھ فخر سے سینہ پھلائیں، گردن اکڑائیں۔ اپنی بڑائی کے ڈنکے پیٹیں ودربھ کو دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور بمبئی کے برابر بلکہ برتر ٹھہرائیں، جمہوریت ہے کس نے روکا ہے لیکن علاقہ پرستی اور جذباتیت سے اپنے آپکو ذرا سے الگ رکھکر حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں تو اس ناقابل تردید سچائی کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہر دور میں ودربھ کے ہر شہر میں قابلِ ذکر تخلیق کاروں کی تعداد ایک دو سے زیادہ نہیں رہی۔ اردو کی دو سو سالہ ادبی تاریخ پر نظر ڈالئے اور اب بتائیے، کتنے ایسے نام ہیں جنھوں نے ملک گیر پیمانے پر اپنی شناخت بنائی اور منوائی ہے تاریخ شعروادب میں کسوں نے اپنے لیے جگہ بنائی ہے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں کافی ہونگی ان کا شمار کرنے کے لیے۔ نام نہیں

اکر تعمیرِ امن کا خطرہ ہے۔ ماضی کے ان مایوس کن حالات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے
دورِ حاضر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو قدرے مسرت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ تخلیق کار
ل میں بانکپن اور یقین و اعتماد کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے اسے دیکھکر
ہی ہے کہ اس دور کے شعر و ادب کا مورخ دورِ جو کو نظر انداز نہیں کرسکے گا دورِ جو کے تقریباً
یا قصبہ میں ایک دو ایسے شاعر ضرور موجود ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں انہیں تاریخ میں زندہ
ضامن ہیں۔ اکولہ کے ایسے ہی ایک دو شاعروں میں فصیح اللہ نقیب کا شمار کیا جا سکتا ہے
ی کہ اس دور میں کہ (قدرے تصرف کے ساتھ) ؎

" ہر بوالہوس نے فکرِ سخن اختیار کی
اب آبروئے شیوۂ اربابِ فن گئی "

کے مصداق دنیائے شعر و سخن میں افراط و تفریط کا وہ عالم ہے شعرائے کرام کی اس قدر بھیڑ
اربابِ فکر و فن کا ایسا اژدھام ہے کہ گلی کوچے پٹے پڑے ہیں۔ دم گھٹتا ہے ایسے ہی
سچے فنکاروں کا انتخاب ویسا ہی ہے جیسے کوئی چند گہر ہائے آبدار نکالنے کے لیے مدتوں
ر کی عمیق گہرائیاں کھنگالے۔

ویسے بحیثیت فنکار نقیب کی قامت کا تعین کرنا سردست لایعنی اور قبل از وقت ہوگا
سکی فکر کے خدوخال پوری طرح اجاگر بھی نہیں ہوئے ہیں، ابھی تو وہ اپنی شناخت کی تشکیل
سے گزر رہا ہے تاہم اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی مراحل میں فکر و فن کے جو نقوش اس نے
یں ان پر ایک تجزیاتی نظر ڈالنے پر یہ رائے حتمی طور پر قائم کی جاسکتی ہے کہ نقیب اپنے
شاعروں کی اولین صفوں میں اپنے لئے نمایاں جگہ بنا چکا ہے۔

فصیح اللہ خاں اپنے والدین، بیوی بچوں، اعزا و اقربا، ہم چشموں، ہم نفسوں، ہم نوالوں اور
ں میں جتنا محبوب ہے نقیب اتنا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ اپنے پڑھنے اور سننے والوں میں
ہے دونوں حیثیتوں میں اس کی محبوبیت اور مقبولیت کی وجہ جاننے کے لئے جب ہم اس کے

معمولاتِ زندگی اور تخلیقی مشاغل پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ نقیب زندگی اور شاعری دونوں معاملوں میں ایک سنجیدہ اور متوازن رویہ رکھتا ہے۔ دونوں کے تعلق سے وہ تعمیری عمل اور مثبت ردِعمل کا مظاہرہ کرتا ہے اپنی عملی زندگی میں وہ بحیثیت ایک فرد جتنا ذمہ دار ہے بحیثیت شاعر بھی اپنی تخلیقات کے وسیلے سے وہ اتنا ہی ذمہ دار دکھائی دیتا ہے دراصل نقیب کی شاعری اور زندگی کے مابین اس اعتدال اور توازن کے پس پشت وہ عوامل کارفرما ہیں جن سے اس کا ماضی وابستہ ہے۔ فصیح اللہ نقیب کی شخصیت اور شاعری کی تشکیل و تعمیر میں اس کے ماضی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس کا ماضی جو اس کے اور میرے مشترک وطن پیپل گاؤں راجہ سے منسوب ہے وہ پیپل گاؤں راجہ جو صالح لوگوں کی بستی ہے وہ بستی جس نے دیرینہ صحتمند روایات کو آج تک پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ و تابندہ رکھا ہے اور علاقہ بھر میں اپنی ایک مخصوص شناخت قائم رکھا ہے اور جس کا ذکر نقیب نے اپنے پیش لفظ میں کیا ہے۔ نقیب کی شخصیت کی تربیت و تہذیب میں پیپل گاؤں راجہ کے جن عوامل کا عمل دخل ہے ان میں گرمیوں کی تعطیلات میں گیان ندی کی ریت پر رات گئے تک جمنے والی وہ تین چار نوعی غیر رسمی محفلیں بھی بے حد اہمیت کی حامل ہیں جن کا ذکر نقیب نے مذکورہ پیش لفظ میں قصداً یا سہواً نہ جانے کیوں نہیں کیا ہے اور جن میں راقم السطور یعنی محبوب راہی اور ماسٹر ہدایت اللہ خاں کے ساتھ نقیب کا حقیقی ماموں اور ہمارا یارِ غار عبداللطیف خاں جو ہماری نصف صدی کی رفاقت کے سارے بندھن توڑ کر ہمیں آدھا ادھورا چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا ہے شریک رہا کرتے تھے ان محفلوں میں مذہب سیاست، معاشرت، شعر و ادب، زندگی کے رموز و نکات اور اسرارِ حیات و کائنات الغرض دنیا جہان کے موضوعات اور ان کے مختلف پہلوؤں پر خوب گرما گرم بحثیں گھنٹوں جاری رہتیں اور حق تو یہ ہے کہ پلڑا ہمیشہ ہمارے مرحوم مغفور یار لطیف ہی کا بھاری رہتا۔ تو میں عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ ان محفلوں میں فصیح اللہ نقیب اکثر و بیشتر شریک رہا کرتا جسمانی اور ذہنی ہر دو اعتبار سے۔ یہ بھی بتاتے چلوں کہ فصیح مرحوم

ہے چھوٹا اور رشتے میں بھانجہ ہونے کے باوجود ان بحثوں میں برابر کا حصّہ دار ہوا کرتا تھا
ِ مدعا یہ کہ اکتسابی علم، مشاہدۂ کائنات اور روزمرہ کے معمولات کے ساتھ ساتھ مذکورہ مقلوں
اصل شدہ تجربات کے زیرِ اثر ایک لاشعوری طور پر رواں دواں رہتی ہیں تعمیری نظریات کے
ُبھا بجا اجاگر ہوتے ہیں اسکی شاعری صالح انسانی جذبات اور دلکش شاعرانہ احساسات
ین امتزاج کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جو قلب و نظر دونوں کو ایک خوشگوار احساس سے
اس کراتا ہے اسکی شاعری ایک ایسے حساس شاعر کے احساسات کا دلپذیر مرقع ہے جو گزرگاہ
، پر مختلف مراحل میں ہر موڑ پر قدم بہ قدم زندگی کے گوناگوں، کھٹے میٹھے اچھے بُرے تجربات سے
رہتا ہے جو جھتا رہتا ہے ' اپنے ان تجربات کو نقیب نے نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے اپنے
ار میں سمو دیا ہے وہ کھلی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کو دیکھتا ہے ' اپنے اندر جھانکتا ہے '
ا کرتا ہے اور من و عن پیش کر دیتا ہے۔

وہ دیکھ رہا ہے کہ ہر بوالہوس اظہارِ حق کے بہانے سچائی کا گھونٹا لگائے ہوتے ہے یہ جانے
رچ سے زیادہ کڑوی کوئی چیز نہیں اتنا کڑوا کہ ہر گھونٹ پر سو سو طرح چہرے بگڑیں وہ دیکھ
ہے کہ ذہنوں کی کھیتیوں میں ظلم کے دانے بوئے جا رہے ہیں جن سے بربریت کی فصل کا
ازمی ہے اور اس بربریت کے نتیجے میں وہ تمام جن کے بننے سنورنے کے دن ہیں ٹوٹ رہے
ور رہے ہیں وہ دیکھ رہا ہے کہ شہر شہر، قریہ قریہ مدرسے، مکتب، اسکول اور کالج کھل
، ہیں لیکن ان میں حمیت، اخوت اور حسنِ سلوک کے اسباق سیکھنے سکھانے والا کوئی نہیں،
نیا کے بازار میں ذہنوں کے سودے اور افکار کی تجارت ہوتے دیکھتا ہے وہ جینے کی
ہیں ہر رات مرتا ہے پھر ہر طلوعِ صبح بعد سجدۂ شکر ادا کرتا ہے۔ پیار کے پل دو پل
س میں وہ نفرتوں کی کئی صدیاں گزار چکا ہے۔ وہ اپنے گھر کے لئے، اپنے اربابِ فلن
حسبِ ضرورت وقت نہیں دے پاتا اور ہمہ وقت دنیا جہاں کے مسائل کی گتھیاں
انے میں لگا رہتا ہے جبکہ لوگ اس سے صرف غزل سرائی اور شعر گوئی کی توقع رکھتے

ہیں گونا گوں مسائل سے نبرد آزما رہتے ہوئے جب وہ غزل کہنے کے لئے لب کھولتا ہے تو حسین الفاظ کے پیروں میں تخیئل کے گھنگرو باندھ کر ایک جادو کا سا سماں پیدا کرتا ہے۔ معنویت سے بھر پور اسکے کلام کی گرہیں جیسے جیسے کھلتی جاتی ہیں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے زبان اردو کو ریشمی پلو میں باندھ رکھا ہے۔

دُھلی دُھلائی صاف، شفاف اور پاکیزہ زبان، دلنشین انداز بیان رمز و کنایہ کی ہمیت پرتوں تلے تہہ در تہہ معنویت، معاملہ بندی، محاوروں کی برجستگی تخیئل کی بلند پروازی جذبات و احساسات کی شگفتگی و شائستگی، اظہار کی بے ساختگی اور زبان کی سادگی و سلاست یہ چند خوبیاں نقیب کی شاعری کو ودیرا اعتبار عطا کرتی ہیں۔

شاعری کے تعلق سے نقیب کے اپنے کچھ نظریات ہیں جن کا اظہار وہ اپنے اشعار میں جابجا کرتا ہے اسے اعتراف ہے کہ وہ اپنا طرز سخن ابھی قطعی طور پر طے نہیں کر پایا ہے روایت اور جدیدیت کے درمیان وہ بھی اپنے آپ کو اس گومگو کے عالم میں پاتا ہے جس میں آج کا تقریباً ہر فنکار گھرا ہوا ہے۔ نام نہاد جدیدیت جو نا قابل فہم علامات، دور از کار تراکیب، ابہام اور ابہال کی آلودگی اور پیچ در پیچ طرز اظہار سے عبارت ہے لوگ اب اس سے اوب چکے ہیں اور پھر سے اس لازوال روایت کی طرف مراجعت کے لیے پر تول رہے ہیں جس پر پھبتی کسنا کبھی داخل فیشن سمجھا جاتا تھا۔ نقیب نے اس فیشن زدہ جدیدیت سے حتی الامکان احتراز کیا کیونکہ اسے اپنے تخلیقی سفر کے آغاز ہی سے اندازہ تھا کہ اس جدیدیت کے ہاتھوں مبہم اشعار کے دھواں دھواں الفاظ نے شعر و سخن کی فضاؤں کو کیسے آلود کر رکھا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ غزل کا تقدس اسکی تہہ داری اور ایمائی اور استعاراتی انداز میں ہے۔ وضاحت اور تشریح اسکے حسن کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ اور یہ بھی کہ شعر کہنا کوئی آسان کام نہیں، پتھروں کو آئینہ کرنے کا عمل ہے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ غزل اس صورت میں کہے کہ اس میں کیف غزل بھی شامل ہو اور چاہتا ہے کہ

انگشت میں ایسی غزل پہنائے جسے وہ نظریہ اپنی نشانی کہہ سکے اور چاہتا ہے کہ تحصیل علم کی سند کے حصول کی بجائے ارباب فن اسے معتبر جانیں لہٰذا اس کے اشعار کی شعریت اور حلاوت تمنے کا ذائقہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسکی غزل بغیر بھی ستوری دیہات کی کسی الھڑ دوشیزہ ۔جوانی کی طرح لگتی ہے وہ پہروں تخلیق کے کرب سے گزرتا ہے کسی اچھوتی زمین میں کوئی ۔ز تخلیق پارہ پیش کرنے کے لیے جو اپنی مثال آپ ہو اور پھر ناقدین فن کی آنکھوں میں ۔ڈال کر وہ نہایت پُر اعتماد لہجہ میں کہتا ہے کہ میرے فن کے تئیں تمہاری کج نگاہی کے ۔ر شعوری طور پر کچھ اس ڈھنگ کا فن تخلیق کرنا چاہتا ہوں جسے دیکھ کر تم لوگ بھی بے ساختہ کہہ اٹھو نتیجتاً اسکے ذہن پر تخیل کے موتیوں کی بارش ہوتی ہے جنہیں وہ اشعار بیوں میں بند کر کے غزل کی شکل میں اربابِ نقد و نظر کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

شاعری کی طرح نقیب کا نظریۂ حیات بھی بے حد کھلا ڈلا، صاف، واضح اور مثبت ہے۔ ۔نے جس بے طرح اسے برتا ہے اسکے نتیجے میں اپنی بوسیدگی کا اسے قدرے قلق بھی ہے۔ ۔ت کے اس اصول سے واقف ہے کہ زندگی میں سکھ تھوڑے اور دکھوں کی بہتات ہے۔ ۔یہ یقین بھی رکھتا ہے کہ شدتِ بے داد جس قدر فزوں ہو گی اس کا عزم جواں اور جواں ۔ہ اپنی خواہشوں کو چادر سے باہر ہاتھ پاؤں نکالنے کی اجازت نہیں دیتا لہٰذا ۔ن مال و زر سے بے نیاز اپنی حلال کی کمائی میں مست رہتا ہے عزتِ نفس کو نیلام ۔سے بچانے کے لئے وہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا ہے اسے اپنی اس خوبی پہ ناز ہے کہ ۔ہیں و ناکس کے در پر سجدہ ریز نہیں ہوتا اس کی خودداری اسے ایسے لوگوں سے ملنے سے ۔ہے جن کی پیشانیوں پر غرور کی تحریر کندہ ہوتی ہے کیونکہ اسکا نظریہ ہے کہ اگر خودی کے ۔ری دنیا بھی مل جائے تو سمجھئے عمر بھر کی کمائی غارت۔ عقل بارہا اسے درسِ عظمت دیتی ۔ہ دل کی بات مانتا ہے اور کلاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسے اطمینان ہے کہ ۔ا مزدور تیں زمانے بھر کی حاجتیں رکھنے کے باوجود اسکے ہاتھوں میں کشکولِ گدائی نہیں۔

اسباب اقتدار کو بحالتِ مجبوری وہ سب کچھ سوچنے پر آمادہ ہے بجائے اسکے کہ انکے ساتھ اپنی عزتِ نفس کا سودا کرنے۔ وہ زندگی کی تمام تر سختیاں ہنستے ہنستے جھیل جاتا ہے تاکہ میوں کے کڑوے گھونٹ نگلتے ہوئے اس کے منھ کا ذائقہ نہیں بگڑتا لیکن دل حساس کی بدولت کسی کا اپنائیت اور پیار بھرا برتاؤ اسے رلا دیتا ہے وہ یوں تو زندگی کے ہر محاذ سے سرخرو لوٹتا ہے اگر مات کھاتا ہے تو وہاں جہاں اس کا اپنا بھائی دشمن کے ساتھ مل کر اسکے خلاف سازش کے تانے بانے بنتا ہے باوجود اسکے کہ اسکی عمر کا بیشتر حصہ شہروں میں گزرا ہے وہ آج بھی اپنے گاؤں کی مٹی کی بو باس اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے دل کی شکستگی کے ساتھ اسے خدا کے گھر کے انہدام کا حادثۂ عظیم یاد آجاتا ہے اور اسکے ساتھ ہی "وجاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا" کی آیت اسکے کانوں میں گونجتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اب تذبذب کی دیرینہ روش چھوڑ کر باطل کو بابانگِ دہل باطل کہہ کر اعلانِ حق کر دینا چاہیے اسے اس تاریخی سچائی کا علم ہے کہ خدا نے رسولوں کو ہمیشہ دہشت گردوں کے بیچ بھیجا ہے اس اصولِ فطرت کے تحت کہ نور ہمیشہ اندھیروں ہی کی قسمت میں ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہر صبح کے ساتھ شام اور ہر عروج کے ساتھ ایک زوال وابستہ ہے لہٰذا باطل کے لعینوں میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود میدانِ کرب و بلا میں بالآخر حق ہی کو سرخرو ہونا ہے دنیا لاکھ اسے شکست خوردہ سمجھے غلبۂ حق کے خیال سے اسکے لبوں کا تبسم اسکے ناقابلِ احساس کی غمازی کرتا ہے وہ جذبۂ شہادت کے زیرِ اثر ہر محاذ پر آگلی قطاروں میں رہنا چاہتا ہے تاکہ جب اپنے بدن کے حصار سے نکلے شہادت کا وقار اسکی ذات سے ہم رشتہ ہو اور یہ سب اسلیے کہ اسکے وجود کی تشکیل و تکمیل صالح اقدار کے اس خمیر سے ہوئی ہے جو اسکے اسلاف و اجداد کا ورثہ ہے اسکے وہ اسلاف و اجداد جو اعلانِ جہاد سن کر محض اس خیال سے لشکرِ حق کے ساتھ روانہ نہیں ہوتے کہ باغوں میں پکی ہوئی فصل کے لیے دین سے نمٹ لیں پھر جہاد میں شریک ہو جائیں بعد میں جب انہیں اپنی غلطی کا اندازہ ہوتا ہے ایک احساسِ جرم کے تحت وہ خود اپنے آپ کو سزائیں دیتے ہیں۔

قوم سے علحدگی کا عذاب ہو گئے ہیں تا وقتیکہ خدائے برتر کی جانب سے ان کی برأت کی نوید نہیں آجاتی۔

جیسے کہ آغازِ کلام میں عرض کر چکا ہوں کہ سر دست نقیبؔ کی شاعری کا مکمل محاکمہ کرتے ہوئے اسکے مقام و مرتبہ کا تعین کرنا قبل از وقت ہوسکا کہ ابھی تو اسکے تخلیقی سفر کی شروعات ہی ہے ابھی تو اسے کئی مراحل طے کرنے ہیں، کئی اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزرنا ہے فکر کی گہرائیوں میں دور تک اترنا ہے اور فن کی ان بلندیوں کو چھونا ہے جہاں ہر کس و ناکس کے بالفاظ دگر پر جلتے ہیں۔ نقیبؔ کی تخلیقی امنگ اسکی فکر کی اڑان اور شوق و جستجو کی انتہا دیکھ کر پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ بہت جلد دورِ حاضر کے آسمانِ شعر و ادب پر سب سے زیادہ تابناک ستاروں میں ایک ہوگا آخر میں دعا کے لیے نقیبؔ ہی کا ایک مقطع پیش کرکے اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

روان ہو چلے ہو نقیبؔ اپنے فن میں
خدا حاسدوں کی نظر سے بچائے

سحر جلگانوی
(ایڈیٹر کاتب اردو پونا)
لکشمی روڈ۔ پونہ ۔۲

جلگاؤں!

شہر جلگاؤں بنا ظالم و مظلوم کا شہر
دورِ حاضر کے لئے حاکم و محکوم کا شہر

بہنا بائی نے جہاں گیت سہانے گائے
کبریٰ باجی نے جہاں دینی ترانے گائے
ملک نے سانے گروجی کے فسانے گائے
ٹھوسرے بال کوی نے جہاں گاتے گائے

شہر جلگاؤں بنا ظالم و مظلوم کا شہر
دورِ حاضر کے لئے حاکم و محکوم کا شہر

کتنی حیران مرے شہر کی آبادی ہے
آج اخلاق کی کس درجہ یہ بربادی ہے
کوئی رضیہ کوئی شیلا یہاں فریادی ہے
اپنی بدنامی کے ڈر ہی سے تو چپ سادھی ہے

شہر جلگاؤں بنا ظالم و مظلوم کا شہر
دورِ حاضر کے لئے حاکم و محکوم کا شہر

اک طرف جنس کے سودے بھی کریں جلگانوی
اک طرف ظلم کو سہتے بھی رہیں جلگانوی
آپ کے سامنے ہم کیسے کہیں جلگانوی
نام کے ساتھ لکھیں یا نا لکھیں جلگانوی

شہر جلگاؤں بنا ظالم و مظلوم کا شہر
دورِ حاضر کے لیے حاکم و محکوم کا شہر

داغ دامن میں نہیں خود سے سمیٹی ہوگی
ایک جلتی ہوئی شعلوں کی انگیٹھی ہوگی
کیفیت خاک میں پوچھوں مری بیٹی ہوگی
عین ممکن ہے مرے دوست کی بیٹی ہوگی

شہر جلگاؤں بنا ظالم و مظلوم کا شہر
دورِ حاضر کے لیے حاکم و محکوم کا شہر

جنس کو شرم و حیاداری کی دولت کہیے
اس کی عکاسی سراسر ہی ذلالت کہیے
اس میں جلگاؤں ملوث نہیں "سورت" کہیے
فحش منظر ہے یہ آثار قیامت کہیے

شہر جلگاؤں بنا ظالم و مظلوم کا شہر
دورِ حاضر کے لیے حاکم و محکوم کا شہر

بقیہ صفحہ ۱۵

شیخ ندوی کا اشہب قلم نصف صدی سے معروف جہاد ہے اس طویل مدت میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جتنے قضیے پیدا ہوئے شریعت اسلامیہ پر جتنے اعتراضات کیے گئے اور فکر اسلامی کے بارے میں جتنے شکوک و شبہات ظاہر کیے گئے ہر ایک کے بارے میں انہوں نے لکھا اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا حل پیش کیا خون جگر سے سیرت نبوی تصنیف کر کے امت اسلامیہ کو ایک دستور حیات دیا جس پر عمل پیرا ہو کر وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔

دعا ہے کہ شیخ کی عمر میں برکت دے، صحت و عافیت بخشے اور مسلمانوں کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ پھر تلفظ بدلہ دے (آمین)

جمیل نظام آبادی ایم-اے

غزلیں

سفر کا شوق اگر ہے تو ہم سفر لے جا   تو اپنے پاؤں میں باندھے ہوئے بھنور لے جا
لگا صحن میں مجھے میری آبیاری کر   میں سایہ دار شجر ہوں مجھے تو گھر لے جا
وفا تو جنس کی صورت میں بک رہی ہے یہاں   اگر تجھے ہے ضرورت خرید کر لے جا
میں اس صدی کا اثاثہ ہوں قیمتی ہوں بہت   مجھے سنبھال کے رکھنا ہے گر تو گھر لے جا
کہا ہے ڈوبتے تاروں نے مجھ سے آخرِ شب   اندھیری رات گزاری ہے اب سحر لے جا
جمیل شعر کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے
نیا خیال نئی فکر اور نظر لے جا

(۲)

کیسا سفر کہاں کا سفر لوٹ جاؤ تم   ہر موج میں چھپا ہے بھنور لوٹ جاؤ تم
تم نے ستارو ساتھ مرا رات بھر دیا   اب پھوٹتا ہے نورِ سحر لوٹ جاؤ تم
اُمید و آرزو میں وفاؤں میں پیار میں   کرنا پڑے گا خونِ جگر لوٹ جاؤ تم
بستی ہے قاتلوں کی کہاں پاؤ گے اماں   اچھا یہی ہے بھائی اگر لوٹ جاؤ تم
حسرت سے چاند تارے تمہیں دیکھنے لگے   لگ جائے نہ کسی کی نظر لوٹ جاؤ تم
اس شہرِ غریب شہر میں سچ بات مت کہو
بہتر ہے یہ جمیل کہ گھر لوٹ جاؤ تم

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

صلاح الدین نیر — فن اور شخصیت



Price 30/-

صلاح الدین نیّر — فن اور شخصیت

ماہنامہ **شاداب** حیدرآباد

نومبر ۱۹۹۴ء جلد (۱۱) شمارہ (۱۱) قیمت: ۱۴ روپے

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری۔ جائنٹ ایڈیٹر: مومن خاں شوق، رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر ——— محمد نہال احمد صدیقی

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ ۷۵ روپے	۲ سال ۱۴۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
خلیجی ممالک	〃 ۲۰۰ 〃	〃 〃 ۳۷۰ 〃	〃 ۳۷۰۰ 〃
امریکہ	〃 ۴۰ ڈالر	〃 〃 ۷۰ ڈالر	〃 ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	〃 ۲۵ پونڈ	〃 〃 ۴۵ پونڈ	〃 ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	〃 ۱۷۵ پاکستانی روپے	〃 ۳۰۰ روپے	〃 ۳۰۰۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ:

"ماہنامہ شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱، ریڈ ہلز۔ حیدرآباد-۴

ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر، محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے بلاک پرنٹرز چتہ بازار میں چھپواکر دفتر "شاداب" ۱۴۷-۵-۱۱، ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

ترتیب و تزئین

بلندیاں اتر آتی تھیں جس کے آنگن میں
زمیں پہ رہتا تھا جو شخص آسماں کی طرح

مرحوم عابد علی خاں

منتخب شعر

تم تو چشمِ نم کو آنکھوں میں چھپا کر لے گئے
میں کھڑا ہوں جس جگہ اس موڑ پر دیکھے گا کون

مجھے عزیز ہے ہر لمحہ اس کی دلجوئی
وہ سب کو چھوڑ کے آیا ہے کیا کیا جائے

نظر ملا کے کہاں تم نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ بے قرار نگہ آج تک بھی پیاسی ہے

وہ سرکش گل سے بھی ہٹ کر کبھی چلا ہوگا
کہ اس [illegible] اک زخم کا نشان بھی تھا

ہاشم حسن سعید ایم۔اے
پرنسپل کالج آف لینگویجس، وجے نگر کالونی۔
حیدرآباد۔

صلاح الدین نیّر ـــــ
ایک شاعر ـــ ایک انسان

صلاح الدین نیّر پر اب تک بہت سوں نے لکھا ہے اور کہا ہے لیکن میں نے
تک کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ نیّر سے میری ۳۵ سال کی رفاقت ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں
ان کا پوچھنا بجا بھی ہے کہ آخر نیّر پر میں نے کیوں نہیں لکھا۔ جبکہ نیّر کے ایک
مجموعۂ کلام کو پڑھ کر یا مشاعروں میں ان کی چند ترنم ریز غزلیں سن کر ہر کوئی
نہ کچھ لکھ دیتا ہے۔ لیکن یہ بات تو صرف میں جانتا ہوں کہ نیّر پر یا نیّر کی شاعری
میں نے قلم کیوں نہیں اُٹھایا آج جب کہ مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں نیّر کے
اور شخصیت پر کچھ اظہارِ خیال کروں، تو میں نے سوچا چلئے اس سربستہ راز کا
شاف کرہی دوں جو میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ـــــ

مجھے کہنے دیجئے، نیّر شاعر بہت بعد میں ہیں پہلے وہ ایک اچھے انسان
۔ ایک اچھے انسان ہونے کے ناطے وہ جو کچھ سوچتے ہیں یا کہتے ہیں اسی کا پرتو
کی شخصیت اور فن میں ملتا ہے۔ وہ بہت ہی صاف گو اور صاف دل آدمی ہیں
نہ کپٹ اور چھل چھبل سے کوسوں دور ـــــ وہ نہ کسی کی حق تلفی کرتے ہیں اور
سی کی حق تلفی ہونے دیتے ہیں۔ حق و صداقت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے
میں "جرأتِ رندانہ" بھی ہے اور آئینِ جواں مردی کی بے باکی بھی۔ ان کی صاف

گوئی ایسا ادقات دوسروں کو ناگوار خاطر بھی گزرتی بلکہ خود ان کے لئے بھی "مصیبت" بن جاتی ہے۔

نیتر ایک شریف النفس شخص ہیں۔ ان کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ اپنے بد خواہوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ آپسی رنجش و اختلاف اپنی جگہ پر لیکن جب زبان و ادب کا سوال ہوتا ہے تو وہ اپنا دستِ تعاون دراز کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ انہیں کرسی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی بلکہ وہ ہمیشہ کرسی نشینوں کی اس طرح تعظیم و تکریم کرتے ہیں کہ کرسی نشین سچ مچ اپنے آپ کو اس کرسی کا اہل سمجھنے لگتے ہیں۔

نیتر ساری دنیا کا غم بانٹ لیتے ہیں لیکن اپنے غم میں کسی کو حصہ بننے نہیں دیتے۔ وہ ہر صدمہ کو خاموشی سے سہہ لیا کرتے ہیں۔ ان کا یہ شعر اسی رویہ کا مظہر ہے۔

پلکوں میں چھپا لوں گا اُمنڈتے ہوئے آنسو
لیکن ترے دامن کو میں آواز نہ دوں گا

نیتر سے میری ملاقات اُن دنوں ہوئی جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا اور وہ اور نیشنل اُردو کالج کے طالب علم تھے۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ یادیں تو بہت پرانی ہیں مگر جب سوچتا ہوں تو تازہ لگتی ہیں۔ اس زمانہ میں بین الاقوامی اُردو فیسٹول کا خوب شہرہ تھا۔ یہ فیسٹول ہر سال شاندار طریقہ پر منایا جاتا تھا جو شامِ نغمہ، شبِ تمثیل اور کل ہند مشاعرہ پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ہر پروگرام کے لئے ایک الگ کنوینر منتخب کیا جاتا تھا۔ نیتر اُس سال کل ہند مشاعرہ کے کنوینر تھے۔ یہ مشاعرہ نہایت نظم و ضبط کے ساتھ منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں مجروح، ساحر، فراق اور جاں نثار اختر شریک تھے اور

ـ علاوہ دوسرے بہت سے جوبلی کے شعراء بھی۔ ساحر، فراق اور جاں نثار
ختر، ویکاجی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم سب طلباء اُن سے ملاقات کرنے
ز اُن کا تازہ کلام سننے کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ نیّر نے بحیثیت کنوینر ان
م مہمان شاعروں کی خوب خاطر مدارات کی اور مشاعرہ میں واہ واہ کی صدائیں سُن
ا ایسا لگا کہ بس اب چھتیں اُڑنے والی ہیں۔ یہ سب نیّر کے حُسنِ انتظام کا نتیجہ
ھا۔ ان ہی دنوں میری اور نیّر کی ملاقات ایک ایسی ہستی سے ہوئی جس نے اپنے
دار اور اخلاق سے ہم دونوں کو گرویدہ کر لیا۔ نیّر کو تو ایسا لگا جیسے گُل کا شباب
ـٹ کر اس ہستی میں آگئی ہو۔ اور یہی ہستی آگے چل کر "گُلِ تازہ" کی تخلیق کا
رک بنی۔ "گُلِ تازہ" کے بارے میں مجھے کہنے دیجئے یہ کوئی تخیلی پیکر نہیں ہے
گوشت و پوست کا مجسم پیکر ہے یہ دوسروں کے لئے ماورائے تصور ہو سکتا
۔ لیکن کم از کم میرے لئے نہیں ہو سکتا۔ آپ نیّر کا سارا کلام دیکھ لیجے ہر جگہ
ی "گُلِ تازہ" کی مہک ملے گی۔ حتیٰ کہ ہر مجموعۂ کلام کے نام میں تک خوشبو کے
سعر کا تسلسل موجود ہے۔ حسرت کی شاعری میں "بوئے پیراہن" اور فیض کی شاعری
ں "طوق و سلاسل" جس طرح علائم کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اسی طرح "گُلِ تازہ"
ر کی شاعری میں ایک علامت بن گیا ہے۔ نیّر کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ
یہ "گُلِ تازہ" نہ تو ان کے اور نہ میرے گلے کا ہار بن سکتا ہے۔ بلکہ یہ دوسروں کی
نت ہے اس کا تحفظ کرنا انہوں نے اپنا فرضِ عین سمجھا۔ نیّر کے جذبہ کی یہ پاکیزگی
کے شریف النفس ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مگر ساتھ ہی انہیں اس کی
لگی رہتی تھی۔ ؎

ہم تو محروم نصیب ہی ٹھہرے
تیرا کیا ہوگا اے گُلِ تازہ ؟

نیتؔر کی شاعری کا محور "گلِ تازہ" ضرور ہے لیکن ان کے تخیل کی وسعت انہیں اسی میں محصور نہیں رکھتی۔ وہ جذبات سے بالاتر ہو کر فکر کے اس دریچہ کو کھول دیتے ہیں جہاں سے وہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کو دیکھ سکتے ہیں وہ جس فضاء میں سانس لیتے ہیں اس میں ہلکا سا ارتعاش بھی ان کے احساسات کو مہمیز کرتا ہے۔ اس کا اظہار ان کی غزلوں میں بھی ملتا ہے اور نظموں میں بھی۔

مئے خانہ کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے
رندوں میں یہ کیوں آخر شب پھوٹ پڑی ہے
خوشبوئے بہاراں درِ زنداں پہ کھڑی ہے
میں ہوں کہ مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

نیتؔر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ویسے انہوں نے بہت پیاری نظمیں بھی کہی ہیں جو داخلی اور خارجی دونوں رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ یعنی یہ نظمیں ان کے سیاسی اور سماجی شعور کے علاوہ ان کے واردات قلبی کی بھی مظہر ہیں۔ نیتؔر کی غزل بڑی ترنم ریز ہوتی ہے۔ وہ الفاظ اور تراکیب کی موسیقیت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مشاعرہ میں اپنے مخصوص لہجہ اور ترنم سے غزل سناتے ہیں تو ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ترنم سے کئی مشاعرے لوٹ لیئے ہیں۔

نیتؔر کی شاعری کے ظاہری بانکپن میں باطنی حسن ہر جگہ جھلکتا ہے۔ ان کا کلام صفحۂ قرطاس پر آکر بھی اتنا ہی جاذب نظر لگتا ہے جتنا سننے میں پُر اثر ہوتا ہے۔ وہ بیشک ایک غنائی شاعر ہیں لیکن ان کی غنائیت ان کے افکار اور احساسات پر غالب نہیں ہے۔ اس غنائیت کی تہہ میں درد و کرب بھی ہے۔ انجانے اندیشے بھی، پیلم النشاط بھی ہے اور تلخ حقیقتوں کا اظہار بھی۔ جمالیاتی شاعری میں یہ نیتؔر کا منفرد رنگ و آہنگ ہے جو ان کے معاصرین میں بہت کم ملتا ہے۔ ● ●

"سخنستان" 1/336-4-21 گلاب شکوبلی.
حیدرآباد ۲۔۔۔۵"

رئیس افتر

صلاح الدین نیّر

بہترین شاعر — بہترین دوست

(اقتباس)

کسی اچھے دوست کے فن اور شخصیت پر قلم اُٹھانا جتنا مشکل ہے اتنا آسان بھی ہے۔ مشکل اس لئے ہے کہ کہیں ازدیادِ خلوص میں قلم غلو نہ کرجائے۔ آسان اس لئے ہے کہ اُس کی زندگی کے تمام پہلو ایک آئینہ کی طرح پاک و صاف نظر آتے ہیں۔

صلاح الدین نیّر کی اور میری دوستی کی عمر زائد از (۲۴) سال کی ہے۔ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ ساری شعراء برادری میں صلاح الدین نیّر میرا سب سے زیادہ قریب ترین دوست ہے، البتہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ نیّر مجھے اپنے تمام دوستوں میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ہماری دوستی کا آغاز مشاعروں کی ملاقات سے ہوا ۔ی شاعری کے ابتدائی دور میں ہم اکثر بیدر، ظہیرآباد، کلیانی اور گلبرگہ میں ہونے والے ۔شاعروں میں ساتھ ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ اضلاع کے مشاعروں میں عقل کلیانوی ۔بسوا کلیان) حکیم جالی (ظہیرآباد) رشید احمد رشید (بیدر) صابر شاہ آبادی (شاہ آباد) ۔ر گلبرگہ کے مشاعروں میں سرور مرزائی، عبدالرحیم آرزو اور راہی قریشی مشاعروں ۔ں شریک رہتے تھے۔ 'دیارِ ادب' کے علاوہ بیدر کی کچھ اور انجمنوں کی جانب سے ۔ب کبھی بیدر میں مشاعرے ہوتے، نیّر حیدرآباد کے شاعروں میں ضرور شامل رہتے۔ جب ہندوستان پر چین نے حملہ کیا تو اُن دنوں آندھرا پردیش کے صاحب رہا فنیؒ

چیف منسٹر تھے۔ اُس زمانے میں سارے ملک میں چین کے خلاف جلسے اور موضوعاتی مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اُن دنوں جناب قادر علیخاں ضلع رنگا ریڈی کے کلکٹر تھے (جو بعد میں سٹے ملی کے صدرنشین رہے) اُنہوں نے مجھے اور نیّرؔ کو تلگو کے دو اور شاعروں کے ساتھ ضلع کے مختلف مقامات پر ہونے والے جلسوں میں قومی نظمیں سُنانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس ایک ہفتہ کے دوران نیّرؔ اور میں ساتھ ساتھ رہے۔ تب مجھے نیّرؔ کو سمجھنے کا زیادہ موقع ملا۔ حیدرآباد میں میری پہلی ملاقات نیّرؔ سے اُس وقت ہوئی جب میں جامعہ عثمانیہ میں بی۔اے، سال اول کا طالبِ علم تھا اور میاں مشک ہاسٹل کے کمرہ نمبر (۳۰) میں مقیم تھا۔ اسی ہاسٹل میں جناب محمد عبدالعلیم الدین (ریٹائرڈ اسسٹنٹ سکریٹری پنچایت راج) بھی تھے۔ میں اپنی کم آمیزی کی وجہ سے ، حیدرآباد کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا تھا لیکن صلاح الدین نیّرؔ کے مسلسل اصرار پر میں حیدرآباد میں مختلف انجمنوں کی جانب سے ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرنے لگا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری دوستی کے اتنے طویل سفر میں ہم میں کسی وقت بھی اختلاف نہیں رہا۔ میں نے دوستی کے ہر مرحلہ پر نیّرؔ کو اپنا ایک بہترین دوست پایا۔ پھر ہماری دوستی مثالی بن گئی۔ ہم شہر کے مشاعروں کے علاوہ اضلاع کے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ اُس زمانے میں آندھرا پردیش اور سابقہ ریاست حیدرآباد کے اضلاع اور تعلقہ جات کھمم، کتہ گوڑم، یلندو، ورنگل، کریم نگر، کرنول، کڑپہ، نندیال، وجے واڑہ، سنگاریڈی، ظہیرآباد، عادل آباد، محبوب نگر، نلگنڈہ کے علاوہ بیدر، گلبرگہ، پربھنی، سلیاتی، ناندیڑ وغیرہ میں کثرت سے مشاعرے ہوتے تھے۔ ہم اکثر مشاعروں میں ساتھ ساتھ رہتے۔

صلاح الدین نیّرؔ اپنی دیانت داری، اُصول پسندی اور عمدہ صلاحیتوں کی بناء ۱۹۵۹ء سے روزنامہ "سیاست" سے وابستہ ہیں (جب کہ وہ اُردو کالج

میں بی۔ایس۔ای کے طالب علم تھے) سنہ ۱۹۵۹ء میں نیر اُردو کالج کی بزمِ اُردو ادب کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہوئے اور آخری بین کلیاتی اُردو فیسٹول (سنہ ۱۹۶۵ء) کے بھی بلا مقابلہ معتمدِ مشاعرہ منتخب ہوئے۔ صلاح الدین نیر ایک طویل عرصہ (سنہ ۱۹۶۶ء) سے ادبی ٹرسٹ سے بھی وابستہ ہیں ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں نیر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

صلاح الدین نیر مینجنگ ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ جناب عابد علیخاں (مدیر سیاست) کے دستِ راست کی حیثیت سے ادبی ٹرسٹ کے قیام (سنہ ۱۹۴۶ء) ہی سے بلا معاوضہ ادبی ٹرسٹ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ صلاح الدین نیر نے جناب عابد علی خاں مدیرِ سیاست اور جناب محبوب حسین جگر شریک مدیر روزنامہ سیاست کی نظروں میں مکمل اعتماد حاصل کیا۔ نیر پورے اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ آج بھی ادبی ٹرسٹ اور سیاست سے متعلقہ اپنی ذمہ داریوں کو سلیقہ سے نبھا رہے ہیں۔ بزمِ سعدی (فارسی انجمن) (۱۹۵۹ء) کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ ادارہ اتحاد الشعراء (سنہ ۱۹۶۶ء) بزمِ جیون اور ادارۂ قدرِ ادب کے معتمدِ عمومی رہ چکے ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن (سنہ ۱۹۶۹ء) کے ۲۵ سال سے بانی جنرل سکریٹری ہیں۔ ادارۂ شعر و حکمت سے (جس کے صدر ڈاکٹر مغنی تبسم ہیں) زائد از ۲۵ سال سے معتمدِ عمومی ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد (سنہ ۱۹۶۶ء) سے بھی وابستہ ہیں۔ محفلِ خواتین کے قیام (سنہ ۱۹۷۱ء) سے ہی مشیر کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ ماہنامہ "خاتونِ دکن" ۱۹۷۲ء کے دس سال تک مدیرِ اعزازی رہے۔ ماہنامہ "شگوفہ" کی مجلسِ ادارت میں شامل ہیں۔ "میرا شہر میرے لوگ" اور "نقش ناتوانی دکن" کے جنرل سکریٹری ہیں۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے احیاء سنہ ۱۹۸۷ء کے وقت سے

سال تک شریکِ معتمد انجمن رہے۔ ان کے علاوہ بھی نیّر کی ادبی، شعری، و تہذیبی خدمات دیگر انجمنوں کی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ بی۔ او۔ ایل۔ کی طالبِ علمی کے زمانے میں تمام کالجس اور جامعہ عثمانیہ کے مشاعروں کے علاوہ تنظیمی اعتبار سے بھی مکمل تعاون کیا کرتے تھے۔ اُردو مجلس (انجمن ترقی اُردو) کے ۱۸ سال تک معتمد عمومی رہ چکے ہیں۔ صلاح الدین نیّر کے تقریباً تمام شعری مجموعوں پر ملک کی مختلف اُردو اکیڈمیوں اُتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور آندھرا پردیش سے ایوارڈز مل چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شہر کی ادبی و تہذیبی انجمنوں اور حکومت کی سطح پر بھی نیّر کا ستمان کیا گیا۔ نیّر کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں تلگو یونیورسٹی نے ۱۹۹۱ء میں ادبی ایوارڈ دیا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تلگو یونیورسٹی سے کسی اُردو شاعر کو ایوارڈ دیا گیا۔ تلگو یونیورسٹی کی جانب سے شروع کئے جانے والے ایم۔ اے۔ اُردو کورس کی تدوین کے سلسلے میں بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن رہ چکے ہیں۔

صلاح الدین نیّر ملک بھر کی تقریباً تمام ریاستوں کے کل ہند مشاعروں میں کلام سُنا چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ریاستی و مرکزی مشاعروں میں شریک رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سعودی عربیہ (جدّہ)، ریاض، دوحہ، قطر، کویت کے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ حال ہی میں جدّہ میں منعقدہ مشاعرہ ۱۳ ڈسمبر ۱۹۹۲ء میں شرکت کی ہے۔ جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔

صلاح الدین نیّر معاشی طور پر مستحکم شاعر ہے۔ سکریٹریٹ میں گزیٹڈ عہدیدار رہ چکے ہیں۔ دورانِ ملازمت بے شمار اہلِ غرض اصحاب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ اعلیٰ افسروں (چیف سکریٹری کی سطح تک کے عہدیداروں) سے

اپنی شاعری اور سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے مراسم بڑھے خاص طور پر حسبِ ذیل اعلیٰ افسروں نے نیّر کی جائز سفارشات کی پذیرائی میں کبھی تامل نہیں کیا۔ ایس۔ اے۔ قادر، رائے کنج بہاری لال، بھارت چند کھنہ، ہاشم علی اختر نریندر لوتھر، غلام احمد، ایس۔ اے۔ واسع، محمد تاج الدین، صادق احمد، رشید قریشی، مبشر احمد، تراب الحسن، عزیز تر، غلام دستگیر قریشی، حسن الدین احمد، خواجہ حمید احمد، بی۔ پی۔ واگھرے، گرو داس، ہاشم علی خان، غلام جیلانی، رمن راؤ، خالد انصاری، اسد اللہ سعید وغیرہ۔

صلاح الدین نیّر کے تاحال (۸) شعری مجموعے (گلِ تازہ سنہ ۱۹۶۵ء)، زخموں کے گلاب (سنہ ۱۹۷۲ء)، صنم تراش (سنہ ۱۹۷۴ء)، تسکین درشکن (سنہ ۱۹۷۹ء) خوشبو کا سفر (سنہ ۱۹۸۳ء)، رشتوں کی مہک (سنہ ۱۹۸۶ء)، سفر جاری ہے (سنہ ۱۹۸۸ء) اور "یہ کیسا رشتہ ہے" (سنہ ۱۹۹۱ء) شائع ہو چکے ہیں۔ نیّر، عظمتِ غزل (عظمت عبدالقیوم ۔۔ فن اور شخصیت) اور عظمتِ خیاباں (عظمت عبدالقیوم) کے مؤلف بھی ہیں۔ سنہ ۱۹۹۴ء میں "سلسلہ پھولوں کا" کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح لکھی ہے۔ "کیا کیا جائے" (مجموعۂ کلام زیرِ اشاعت ہے) اس کے علاوہ صلاح الدین نیّر کی نگرانی میں شاعر اور ادیب دوستوں کی زائد از (۵۰) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نیّر کی کتابوں کی رسمِ اجراء تقاریب شایانِ شان طور پر انجام پائیں، اکثر تقاریب کا کنوینر میں ہی رہا۔ مہمانوں میں قابلِ ذکر ریاست کے دو گورنرس محترمہ کمود بین جوشی اور جناب کرشن سکانت کے علاوہ پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد، مسز عابد علی خان ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی، ہاشم علی اختر، نواب شاہ عالم خان، جسٹس سردار علی خان گوپال راؤ ایکبوٹے، ڈاکٹر سید عبدالمنان، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر زینت ساجدہ ایم۔ باگا ریڈی، ڈاکٹر حسن الدین احمد، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر [illegible]

اور پروفیسر مغنی تبسم قابل ذکر ہیں۔

حیدرآباد میں اُردو ہندی کے ملے جلے مشاعرے صلاح الدین نیّر کی شخصی دلچسپی سے گذشتہ ۲۰ برس سے منعقد ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اُردو کے مشاعروں میں راقم الحروف (رئیس اختر) اور ہندی کے شاعروں میں جناب نہپال سنگھ درما کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ اُردو ہندی مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں شریک مدیر روزنامہ "سیاست" جناب محبوب حسین جگر کی سرپرستی اور مشاورت کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔

صلاح الدین نیّر سے مختلف یونیورسٹیوں کے اسکالر علمی و ادبی کاموں میں تعاون حاصل کرتے ہیں۔ گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ایک طالب علم نے "صلاح الدین نیّر۔ حیات اور ادبی خدمات" کے زیرِ عنوان ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ صلاح الدین نیّر گزشتہ ۱۵ سال سے اضلاع کے مشاعروں کے سلسلے میں ایک اہم اور قابلِ تحسین اقدام کر رہے ہیں۔ جب ہم نئے نئے شاعر تھے تو ان دنوں اضلاع کے مشاعروں میں منتظمینِ مشاعرہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ شعراء کے لئے جام و مینا کا انتظام کریں لیکن جب سے صلاح الدین نیّر کے تعاون سے اضلاع میں مشاعرے ہونے لگے ہیں، صلاح الدین نیّر نے ان مشاعروں میں یہ اصلاح لائی کہ شراب کے بجائے شعراء کو معاوضہ دیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ایسے ہم خیال شعراء جو ہمارے ساتھ مشاعرے پڑھتے ہیں وہ شغلِ ساغر و مینا سے دُور ہیں۔

صلاح الدین نیّر ایک ایسا کامیاب شاعر ہے جس کی شاعری میں زندگی کی روشن علامتیں، اُجالوں کی سرزمین کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں اُجالوں کی تمنّا، پیار، محبت کی پاسداری اور سر اُٹھا کر چلنے کا پیغام ملتا ہے۔ خوشبو کا سفر ہو کہ رشتوں کی مہک، نیّر کا سفر جاری ہے۔

نیّر کی شاعری چونکہ دل کی شاعری ہے اس لئے دامنِ شعر و ادب میں نیّر کا نام ایک گلِ تازہ کی طرح ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ پتہ نہیں نیّر میں قدرت نے وہ کونسی طاقت، حوصلہ اور صلاحیت عطا کی ہے کہ نیّر زندگی کے ہر موڑ پر ایک تازہ دم سپہ سالار کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ جو شخص صبح کی اولین ساعتوں سے رات دیر گئے تک علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتا ہو اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا بھی اعتراف شعبۂ حیات سے وابستہ حضرات کرتے ہی رہتے ہیں۔ نیّر ہمیشہ متحرک، فعال اور رواں دواں رہتے ہیں۔ جس شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ علمی و ادبی اور تہذیبی خدمات میں گذرتا ہو اُس شخص کا نام لینا ہی ان محفلوں کے استحکام کے لئے کافی ہے۔

شخصیت کے تعین میں لوگ عمریں گزار دیتے ہیں لیکن نیّر خوش نصیب ہیں کہ معاشرہ کا تقریباً ہر اہم شخص اُن کی صلاحیتوں کا معترف ہے۔

منتخب شعر

○

سب اک مقام پہ رہا جنوں پسند آدمی
زمین تنگ جب ہوئی تو آسماں پہ چھا گیا

○

کیا بتاؤں تمہیں پردیس میں وہ بات نہ رہی
میں نے جو خاکِ وطن گھر میں بچا رکھی تھی

○

تم اپنے ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دینا
بہت سے ہاتھ کٹے ہیں دراز دستی میں

رحمٰن جامی
"الحراء" 3/7/93-2-12، پل کالونی،
مہدی پٹنم۔ حیدرآباد۔

صلاح الدین نیّر کی شعری و ادبی خدمات

صلاح الدین نیّر بنیادی طور پر زندگی کا شاعر ہے۔ نیّر کی شاعری میں زندگی کے سارے تقاضے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ ملتے ہیں۔ نیّر کی شاعری میں رومانیت بڑے خوبصورت انداز میں در آئی ہے۔ اس رومانیت میں سستی اور بازاری قسم کی ہلکی سی اشاریت بھی نہیں ملے گی، بلکہ نیّر کی رومانیت میں پاکیزگی اور شائستگی جابجا اپنا جلوہ دکھاتی ہوئی نظر آئے گی۔ نیّر کی شاعری میں انسان دوستی اور دردمندی اپنی تمام تر دل پذیری کے ساتھ موجود ہے۔ نیّر نے کہیں کہیں اساتذہ کی تقلید بھی کی ہے لیکن اس روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بڑی چابک دستی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

صلاح الدین نیّر کی تنظیمی صلاحیتوں کا لوہا ہر وہ شخص مانتا ہے جو نیّر کو قریب سے جانتا ہے۔ حیدرآباد کی کم و بیش درجن بھر انجمنوں سے وابستگی اور ان کا کامیاب انصرام و انتظام اور ان کی برجستہ برموقع اور مستقل کارکردگی صلاح الدین نیّر کی مرہونِ منت ہے۔

نیّر کی ادبی سرگرمیوں میں مختلف ادبی انجمنوں کی سرپرستی اور وابستگی کے علاوہ مشاعرہ برپا کرنا اور مشاعرہ برپا کروانا بھی شامل ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کا کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا شاعر صلاح الدین نیّر سے تعاون حاصل کرتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ان کی ادبی سرگرمیوں میں دوستوں کی کتابوں کی اشاعت میں اپنے بیش بہا مشوروں

کے ساتھ یہ نفسِ نفیس اپنے آپ کو بھی اس کے کام کے لئے وقف کر دینا بالکل اسی طرح جس طرح خود صلاح الدین نیّر کی اپنی کتاب شائع ہونے جا رہی ہو، چنانچہ کئی کتابیں خود مدون اور مرتب کیں اور شائع کروائیں (ان کی کتابت سے لے کر طباعت اور دیگر مراحل میں سرتاپا پیش پیش رہ کر اس کی تکمیل تک نیّر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔)

صلاح الدین نیّر کے بغیر کوئی مشاعرہ کامیاب اور مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ مشاعرہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے جس کے معتمد یا ناظمِ مشاعرہ نیّر ہوتے ہیں۔ حیدرآباد سے باہر کے مشاعروں میں حیدرآبادی شاعروں کو لانے اور لے جانے کی تمام تر ذمہ داری صلاح الدین نیّر کے سپرد ہوتی ہے۔ مجھے نیّر کے ساتھ ان گنت مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نیّر کے اصرار کی وجہ سے بالخصوص اضلاع کے مشاعروں میں شریک رہنا پڑا۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ نیّر جیسا باسلیقہ مہتمم اور منتظم میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ میں نے دورانِ سفر نیّر کو ہمیشہ ہمدرد اور خیال رکھنے والا ساتھی پایا۔ نہ صرف یہ کہ وہ مخلص دوست ثابت ہوا بلکہ ایماندار محاسب بھی پایا ہے۔ نیّر پر ادبی اور تنظیمی معاملات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے بلکہ میرے نزدیک وہ انتظامیہ بے حد خوش نصیب ہے جس کو صلاح الدین نیّر کا تعاون حاصل ہے۔ صلاح الدین نیّر کی شخصیت کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ صلاح الدین نیّر ایک نہایت مخلص، ہمدرد اور با اعتماد دوست، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت اور آرام پہنچانے والا ساتھی اور فائدہ پہنچانے والا ہمدم دیرینہ ہے۔ میں نے صلاح الدین نیّر کو ہمیشہ اپنا بے لوث دوست پایا۔

صلاح الدین نیّر کی ادبی ٹرسٹ اور شخصی مشاعروں کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت ہے۔ بہ قول عابد علی خاں مدیر سیاست ــــ

" وہ (صلاح الدین نیّر) تنہا میرے معاون ہی نہیں ان کی زندگی کا

بڑا حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزرتا ہے اور
ان کی صبح "سیاست" سے شروع ہو کر شام یہیں
ختم ہوتی ہے۔"

اوروں کی بات تو میں نہیں جانتا، البتہ میری نظر میں صلاح الدین نیر دکن کا
کوہِ نور ہے جس کی چمک ہند و پاک کے علاوہ دیگر اردو دنیائے شعر و ادب کی
کو خیرہ کئے ہوئے ہے۔

جہاں تک مجھے مختلف جلسوں اور تقریبات میں صلاح الدین نیر کے بار
میں حکومت کے سربراہوں کے خیالات جاننے کا اتفاق ہوا، جن میں مختلف
ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹریوں، چیف سکریٹریوں، وزیروں، چیف منسٹروں او
گورنروں کی رائے بھی شامل ہے وہ یہ ہے کہ صلاح الدین نیر دکن کا وہ ممتا
و منفرد شاعر ہے جس کی خاندانگی اور رسائی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک ہے جو
والوں کے لئے باعث فخر و منزلت ہے۔ سکریٹریٹ میں جب تک تھے کئی سفارشا
میں نے مختلف لوگوں کی مختلف اوقات میں نیر سے کی تھی اور الحمدللہ ہر
کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ صلاح الدین نیر کی مقبولیت کی وجوہات میں میرے نزدیک
سب سے بیّن وجہ، نیر کی انتھک محنت و جستجو اور اپنے فن سے انتہا کو
اور خلوص اور ایک اہم بات یہ ہے کہ نیر کو اپنی ذات پر بھروسہ اور اپنے آپ پ
کامل اعتماد ہے اور اس کے علاوہ مسلسل کام اور اپنے آپ سے پیار نیر
کامیابی اور مقبولیت کا راز ہے جو نہ صرف نیر کو مقبول و ممتاز بنائے ہوئے ہ
بلکہ صحت مند و جوان رکھے ہوئے ہے۔

نیر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اردو، ہندی اور تلگو
کو اکثر و بیشتر ایک اسٹیج پر جمع کرتے رہتے ہیں اور ایسے کئی لسانی مشاعروں میں

نے مجھے گھیٹا ہے اور میں مشاعروں کی کامیابی کا چشم دید گواہ ہوں۔ نیر کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ نیر مزاجاً شائستہ، سیدھا سادا، مخلص اور بے لوث ہونے کے علاوہ حیدرآبادی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا نمونہ اور اخلاق و آداب، شرافت کا مجسم پیکر اور دکن کی روایات کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شمالی ہند کے مشاعروں میں بھی بے حد مقبول ہے۔

بہرحال میں اپنا مضمون اس شعر پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ؎

تو سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

"سلسلہ پھولوں کا" ● ——— ● صلاح الدین نیر

○ ہمیں اپنے معاشرہ میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو زندگی کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ جن کی سانسوں کی گرمی اور جن کے فکر و خیال کی خوشبو پیراہنِ جسم و جاں کو ہمیشہ مہکاتی رہتی ہے اور جن کی لمحاتی گفتگو بھی صدیوں کا سفر طے کرتی ہے۔ ایسے لوگ ہمارے آس پاس بھی رہتے ہیں جو اپنا دکھ درد آپس میں بانٹ لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ اپنی پہچان کے لئے احساس کے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ رشتے ایک دوسرے کی پہچان اور سماج کے نظام کیلئے بنائے گئے ہیں لیکن کسی بھی رشتے کے درمیان اگر محبت نہ ہو تو رشتوں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ محبت رشتوں کو نہ صرف باقی رکھتی ہے بلکہ رشتوں کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ انسان کا دیگر انسانوں سے رشتہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کم فہمی کی بنا پر رشتے [illegible] نہیں پاتے۔ اصل محبت مرکز ہے اور رشتہ دائرہ ۔۔۔ یہ منتشر لوگ بے تعلق [illegible] کی طرح پاکیزہ محبت کا احترام کرتے ہوئے رشتوں کے تقدس کا تحفظ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو [illegible] دو [illegible] ہی [illegible]۔ کہیں دیکھیں تو لگے آس کے دروازے [illegible] ہوتی [illegible] کا آنچل ڈھلک ہی جاتا ہے۔ رشتوں کا [illegible] [illegible] اس [illegible] کسی نام سے پکارا جائے کیونکہ جذبۂ محبت تمام رشتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ●

مرتب: مومن خان شوق

صلاح الدین نیر کا شعری ادبی و تہذیبی سفر

(اقتباس)

نام: صلاح الدین نیر ـــــ والد کا نام: الحاج محمد شمس الدین (خطیب جامع مسجد تعلقہ)

مقام پیدائش: تعلقہ چنتا آباد ضلع بیدر شریف۔ جس کا تعلق ریاستوں کی تقسیم (۱۹۵۶ء) سے پہلے حیدرآباد سے تھا۔ ـــ

تاریخ پیدائش: ۲۵؍ جنوری ۱۹۳۵ء۔

آباو اجداد۔ زمیندار و تجارت پیشہ۔

حیدرآباد میں سکونت: ۱۹۴۸ء سے، بہ سلسلۂ اعلیٰ تعلیم حیدرآباد آیا تھا۔ (میں مقیم تھا) اپنے ذاتی مکان 11-3-824/7، جدید ملے پلی، ہاشم گراونڈ۔ فون نمبر: 228802،

تعلیم: میٹرک (مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) پوسٹ گریجویشن ـــ (عثمانیہ یونیورسٹی) اردو عالم، اردو فاضل (ادارۂ ادبیات اردو) منشی فاضل (جامعہ نظامیہ) دبیر کامل (مسلم جامعہ اردو علیگڑھ)

مطبوعات: مجموعۂ کلام ـــ "گلِ تازہ" (۱۹۶۵ء) "زخموں کے گلاب" (۱۹۷۲ء) "صنم تراش" (۱۹۷۸ء)
"شکن در شکن" (۱۹۷۹ء) "خوشبو کا سفر" (۱۹۸۳ء) "رشتوں کی مہک" (۱۹۸۶ء) "سفر جاری ہے" (۱۹۸۸ء) "یہ کیسا رشتہ ہے" (۱۹۹۰ء) "کیا کیا جائے" (مجموعۂ کلام) زیر اشاعت ہے۔

نثری مطبوعات: "سلسلہ پھولوں کا" (خود نوشت سوانح ۱۹۹۲ء) "خوشبو کی پرچھائیں" (مضامین، خاکے، سفرنامے وغیرہ ۱۹۹۳ء) "قطرے یادوں کے" (المیہ تحریریں ۱۹۹۳ء)

تالیف: "عظمت عبدالقیوم۔ فن اور شخصیت (سنہ ۱۹۸۸ء)
"عظمتِ خیاباں (عظمت عبدالقیوم۔ مضامین، افسانے، شاعری سنہ ۱۹۸۹ء)
صلاح الدین نیّر سے متعلق کتابیں: "قافلہ چلتا رہے گا"۔ صلاح الدین نیّر۔ فن اور شخصیت سنہ ۱۹۹۲ء (از صالحہ الطاف/ڈاکٹر صابرہ سعید) "نیّر گیا نو" ۱۹۷۵ء۔
"گلِ تازہ کی منتخب غزلوں کا منظوم ترجمہ) مترجم شمس الدین کودی۔
(تزئین کار۔ ہیرا لال موریا)

- تاحال زائد از (۱۰۰) کتابیں زیرِ نگرانی شائع ہوئیں۔
- میری تمام کتابوں پر (سوائے گلِ تازہ) چونکہ سنہ ۱۹۷۵ء میں اُردو اکیڈیمیاں قائم نہیں ہوئی تھیں) ملک کی اُردو اکیڈیمیوں سے انعامات مل چکے ہیں۔
- گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ایک طالبِ علم جعفر خواجہ معین الدین نے سنہ ۱۹۹۲ء میں صلاح الدین نیّر۔ فن اور شخصیت۔ شعری اور ادبی خدمات کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ایم۔فل کی امتیازی ڈگری حاصل کی ہے۔

اعزازات:

- "زخموں کے گلاب"۔ اُترپردیش اُردو اکیڈیمی ۱۹۷۳ء
- "شکن در شکن"۔ آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی ۱۹۸۰ء
- "خوشبو کا سفر"۔ اُترپردیش اُردو اکیڈیمی۔ بہار اُردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی ۱۹۸۴ء
- رشتوں کی مہک۔ اُترپردیش اُردو اکیڈیمی، بہار اُردو اکیڈیمی، اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۱۹۸۷ء
- سفر جاری ہے۔ اُترپردیش اُردو اکیڈیمی، مغربی بنگال اُردو اکیڈیمی، اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۱۹۹۰ء

• یہ کیسا رشتہ ہے — اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش — ۱۹۹۰ء

شعری، ادبی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات :-

۱۔ پونٹری ایوارڈ ۔ آندھرا پردیش کلچرل اسوسی ایشن سکریٹریٹ — ۱۹۷۷ء

۲۔ پوئیٹ آف انگریشن ایوارڈ ۔ ضلع گرندھالیہ سمستھا کھمم — ۱۹۸۲ء

۳۔ یونٹی ایوارڈ ۔ یونائیٹڈ ہندو مسلم فرنٹ حیدرآباد — ۱۹۸۵ء

۴۔ نیشنل انٹگریشن ایوارڈ ۔ بھارتیہ کلچرل اکیڈیمی۔ آندھرا پردیش — ۱۹۸۸ء

۵۔ شانِ حیدرآباد ایوارڈ ۔ حیدرآباد آرٹس اینڈ کلچرل سوسائٹی — ۱۹۸۸ء

۶۔ قلی قطب شاہ ایوارڈ ۔ (مومنٹو) اولڈ سٹی یوتھ فیسٹول — ۱۹۹۰ء

۷۔ مشاعرۂ دکن ایوارڈ ۔ (مومنٹو) مجاہد آزادی کونڈا لکشمن باپوجی — ۱۹۹۰ء

۸۔ مشاعرۂ دکن ایوارڈ ۔ (مومنٹو) 〃 〃 〃 〃 — ۱۹۹۱ء

۹۔ فخرالدین علی احمد قومی یکجہتی ایوارڈ — ۱۹۹۱ء

۱۰۔ جیمس آف حیدرآباد ایوارڈ — ۱۹۹۲ء

۱۱۔ ستا بیس آندھرا پردیش گورنمنٹ ایوارڈ (کوئی سیلق) — ۱۹۹۴ء

۱۲۔ بسٹ پوئیٹ ایوارڈ ۔ شاہانہ ایجوکیشن اسکیم۔ گولکنڈہ — ۱۹۹۴ء

۱۳۔ تلگو یونیورسٹی نے اُردو شعری خدمات کے اعتراف میں ۱۹۹۱ء ایوارڈ دیا

یہ ایوارڈ حیدرآباد میں اُردو کے پہلے شاعر کو مِلا۔

مشاعروں کے سلسلے میں بیرونِ ملک کے دورے :-

۱۔ جدّہ میں مشاعرہ (حیدرآباد کے ۴۰۰ سالہ تقاریب ۱۹۹۰ء) جدّہ میں مشاعرہ

۲۔ دوحۂ قطر میں مشاعرہ (۱۹۸۸ء) ریاض میں مشاعرہ (۱۹۹۰ء) کویت میں مشاعرہ

• زائدازلہ ۳۵ سال سے کئی ہند مشاعرہ پڑھ رہا ہوں۔ زائد از ۳۵ سال سے آ
ریڈیو حیدرآباد سے کلام سُناتا ہوں۔ دور درشن کے ریاستی پروگرام کے علا
نیشنل (قومی سطح کے) مشاعرے پڑھتا رہا ہوں۔

ادبی سرگرمیاں : • ہندوستان و پاکستان کے تقریباً تمام ادبی رسائل میں گزشتہ ۰

سے میرا کلام شائع ہو رہا ہے ۔

- اُردو مجلس (انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش) کا (۱۸) برس تک جنرل سکریٹری رہا ۔
- سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کا ۲۵ برس (سنہ ۱۹۴۹ء) بانی سکریٹری ہوں ۔
- سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے ادبی رسالہ کا مدیر رہ چکا ہوں ۔ (اس سے پہلے سکریٹریٹ میں کوئی اُردو رسالہ شائع نہیں ہوا)
- بزمِ سعدی کے قیام (۱۹۵۹ء) کا بانی شریکِ معتمد ہوں ۔
- محفلِ خواتین کا اس کے قیام کے زمانے سنہ ۱۹۷۰ء سے مشیر ہوں ۔
- ایک ادبی رسالہ (ماہنامہ خاتونِ دکن ۔ ۱۹۶۲ء) کا دس برس تک مدیرِ اعزازی رہ چکا ہوں ۔
- اتحاد الشعراء (۱۹۷۰ء) کا معتمد عمومی رہ چکا ہوں ۔
- بزمِ جیون (۱۹۷۰ء) کا معتمد رہ چکا ہوں ۔
- روزنامہ سیاست سے بہ زمانہ طالب علمی سنہ ۱۹۵۹ء سے وابستہ ہوں ۔ (شعبہ شاعری) کا انچارج ہوں ۔
- قیامِ ادبی ٹرسٹ (۱۹۶۶ء) سے ہی آفس سکریٹری کی حیثیت سے تاحال کام کر رہا ہوں ۔
- ادارۂ شعر و حکمت کا گزشتہ (۲۷) برس سے معتمدِ عمومی ہوں ۔
- تلگو یونیورسٹی میں اُردو ایم ۔ اے ، کورس کے سلسلے میں بورڈ آف اسٹڈیز کا رکن ہوں ۔
- دیارِ ادب کا گزشتہ دس برس سے مشیر ہوں ۔
- انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے وقت سنہ ۱۹۸۶ء کے بعد سے ۵ سال تک شریکِ معتمد رہا ہوں ۔
- "میرا شہر میرے لوگ" کا گزشتہ (۷) برس سے بانی سکریٹری ہوں ۔

- مشاعرۂ دکن کا (۱۹۸۹ء) سے بانی سکریٹری ہوں۔
- سنہ ۱۹۹۳ء سے اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا رکن ہوں۔
- جشن گولکنڈہ سوسائٹی کے قیام سے ہی شریک معتمد ہوں۔
- ایوان پرنس معظم جاہ شجیع۔ جنرل سکریٹری۔
- ادارۂ ذہنِ جدید کے سرپرستوں میں شامل ہوں۔
- شنکر جی میموریل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام منعقدہ مشاعروں کی ۱۵ برس تک میرے ذمّہ رہی۔
- ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے سلسلے میں میری وابستگی ۳۰ برس سے (حسب ہدایت سکریٹری)
- زندہ دلانِ حیدرآباد سے سنہ ۱۹۶۶ء سے وابستہ ہوں۔ گزشتہ ۷ برس سے کمیٹی کا کنوینر ہوں۔
- شگوفہ (طنز و مزاحیہ رسالہ) کی مجلسِ ادارت میں گزشتہ ۵ برس سے
- بہ زمانۂ طالب علمی بی۔او۔ایل (اُردو اورینٹل کالج) بزمِ اُردو کا (۵۹
مقابلہ صدر منتخب ہوا ہوں۔
- آخری اُردو فیسٹول (۱۹۶۰ء) میں بلامقابلہ کنوینر و معتمدِ مشاعرہ منتخب
- روزنامہ نظام گزٹ سے (۱۹۵۹ء) میں وابستہ رہا (ہفتہ واری اشعار کا انتخاب میرے ذمّہ تھا)
- اولڈ سٹی یوتھ فیسٹول کا جنرل سکریٹری (شعبۂ اُردو) رہا۔
- تقریبًا تمام صدورِ جمہوریۂ ہند کو کلام سنا چکا ہوں۔
- حکومت آندھرا پردیش کے اکثر ادبی و تہذیبی پروگراموں میں میری شرکت شامل رہتی ہے۔
- ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کے طلباء کو مقالوں کے سلسلے میں

کرتا ہوں۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے شاعروں کو کبھی مشورۂ سخن دیا کرتا ہوں۔

- شہر کی ادبی انجمنوں 'میرا شہر میرے لوگ'، 'مرکز ادب'، 'عصری ادب'، 'دیار ادب'، اور مکتبۂ شاداب کے ادبی مذاکروں کے بانیوں میں سے ہوں۔
- شہر کے بھیانک فسادات (۱۹۹۲ء) کے دوران دور درشن سے ایمرجنسی حالات کے سلسلے میں امن کے لئے پیام دے چکا ہوں۔

مختصر یہ کہ گزشتہ ۳۵ برس سے زندگی کا بڑا حصہ اُردو زبان، اُردو شعر و ادب کی سرگرمیوں میں گزر رہا ہے۔ ●●

● ــــ کئی مرتبہ مجھے نیّرؔ سے کہنا پڑا کہ سروجنی نائیڈو کی سالگرہ تقریب منعقد ہو رہی ہے، آریہ بھٹ فضاء میں داغا گیا ہے، شہر میں کرفیو ہے، حیدرآباد کی تہذیب متاثر ہو رہی ہے، نیا سال آرہا ہے اور تمہیں شعر کہنا ہے۔ نیّرؔ نے ہر ایسے موقع پر شعر کہے ہیں محفلوں میں پڑھا ہے اور خوب داد و تحسین حاصل کی ہے۔

نیّرؔ حیدرآباد کے ہر مشاعرے کے نہ صرف ایک لازمی شاعر ہیں بلکہ ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے کُل ہند مشاعروں میں پہلے پڑھنے والے بھی وہی ہیں۔ وہ تقدیم و تاخیر سے بے نیاز ہیں، وہ اپنے کلام اور ترنم دونوں سے مشاعرے کی فضاء بناتے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں وہ میرے معاون و مددگار ہیں۔ "سیاست" کے حصّۂ شعر کی ترتیب میں وہ مسلسل تعاون کر رہے ہیں اور ان سب سے زیادہ ادبی ٹرسٹ اور ویک ڈیلو کے کام میں وہ تنہا میرے معاون ہیں۔ انکی زندگی کا بڑا حصّہ شعر و ادب کی خدمت میں گزرتا ہے اور انکی صبح "سیاست" سے شروع ہو کر شام یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ ●

عابد علی خاں — "خوشبو کا سفر"

مرکزِ ادب کے ادبی ا
کی
(رُوداد)

صلاح الدین نیّر
فن اور شخصیت

آج سے پچیس برس پہلے جس شاعر کی کج کلاہی، وضع داری، طرحداری، مر
شناسی اور بانکپن سے میں معترف ہوا اُس کی طرزِ حیات، تیز روی اور مخلصانہ رویّے
آج بھی کچھ فرق نہیں آیا بلکہ آج بھی میرا پسندیدہ شاعر صلاح الدین نیّر ان تمام خو
سے اور سربلند ہوگیا ہے۔ صلاح الدین نیّر بذاتِ خود ایک تہذیب یافتہ اور پُر اثر شخ
کے حامل انسان ہیں۔ لیکن عابد علیخاں صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب کی ۳۰ سالہ ر
ذہنی تربیت اور ادارۂ سیاست سے والہانہ وابستگی نے صلاح الدین نیّر کی شخصیت
نمایاں کیا۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے بھرپور مواقع فراہم کئے۔ بزرگوں
رسم و راہ کے طور و طریق، دوستوں سے روابط میں وارفتگی، اپنی شناخت، تو
رکھ رکھاؤ، عزتِ نفس اور منفرد دیدہ وری نے زبان و ادب کی خدمت کر
ذوق پیدا کیا۔ ایسا متحرک، فعال شاعر ہماری شعری و ادبی محفلوں کے لئے ناگز
جاتا ہے۔ صلاح الدین نیّر کی شاعری تمام اُردو دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ میر
امریکہ، مڈل ایسٹ اور دیگر بیرونی مقامات سے بعض دانشوروں اور احباب
خطوط آتے رہتے ہیں۔ جب حیدرآباد کی ادبی محفلوں کا ذکر آتا ہے تو صلاح ا
کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں ضرور لکھا جاتا ہے۔ میں صلاح الدی

کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کا سفر بلکہ خوشبو کا سفر اسی طرح جاری رہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ادارہ مرکز ادب کی جانب سے ۱۰؍اگسٹ ۱۹۹۴ء کی شام مکتبۂ شاداب میں صلاح الدین نیّر ۔۔ فن اور شخصیت کے عنوان پر منعقدہ تہنیتی اجلاس میں کیا جس کی انہوں نے صدارت کی۔ اس پُر اثر محفل کے مہمانِ خصوصی پروفیسر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی ورنگل تھے۔ مقررین میں جناب ہاشم حسن سعید پرنسپل کالج آف لنگویجیس، جناب رحمن جامی اور جناب نہپال سنگھ ورما شامل تھے ۔۔۔ پروفیسر جعفر نظام نے کہا کہ میں صلاح الدین نیّر کو گزشتہ ۳۰ برس سے پڑھتا اور سنتا آرہا ہوں۔ ان کی پُر اثر شاعری اور متاثر کن ترنم میں اس قدر ہم آہنگی ہے کہ انکی شاعری دو آتشہ ہوجاتی ہے۔ صلاح الدین نیّر اپنے مخصوص ترنم میں ڈوب کر شعر سناتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ صلاح الدین نیّر نے مجھے حیدرآباد کی ادبی محفلوں سے روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ چاہے وہ راج بھون کی محفلوں میں شعر سناتے ہوں کہ ادبی ٹرسٹ، شنکر جی مشاعرہ میں کلام سناتے ہوں، اُن کی خود اعتمادی میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ جناب عابد علیخاں کو جس پُر اثر انداز میں نیّر صاحب نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کا اثر آج بھی میرے دل پر ہے۔ شہر کے تمام اعلیٰ علمی و ادبی اداروں کے سربراہوں سے ان کے مخلصانہ اور دوستانہ روابط ہیں۔ گورنر آندھرا پردیش جناب کرشن کانت کے یہ پسندیدہ شاعر ہیں۔ راج بھون کی تقریباً ہر تقریب میں صلاح الدین نیّر مدعو رہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والوں سے ان کی صاحب سلامت ہے۔ ان کی حرکیاتی شخصیت، حیدرآباد کی تہذیبی روایات، شعر و ادب کی سرگرمیوں میں اہم حصہ ادا کررہی ہے۔ صلاح الدین نیّر کی مقبولیت اور شہرت میں ان کی ملنساری، بے لوث ادبی خدمات، اپنے بزرگوں کا احترام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں واقف ہوں کہ عابد علیخاں مرحوم، صلاح الدین نیر کی دیانتدارانہ طرزِ حیات، وفادا طور و طریق، اور ان کی سیاست، سے والہانہ وابستگی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے
جناب ہاشم حسن سعید نے کہا کہ صلاح الدین نیر کی شاعرانہ پہچان کا پہلا مینا کلیاتی اُردو فیسٹول (۱۹۵۹ء) ہے جبکہ وہ اُردو کالج میں بی۔ او۔ ال کے طالب تھے۔ بزمِ اُردو وادب کے صدر اور فیسٹول کے مشاعرہ کے بلا مقابلہ معتمدِ مشاعرہ منتخب "گلِ تازہ" سے لے کر "یہ کیسا رشتہ ہے" تک کا شعری سفر ۱۹۶۰ء سے شروع ہوتا ہے صلاح الدین نیر طالب علمی کے زمانے سے ہی ایک مقبول شاعر کی حیثیت سے تمام کی فضاؤں میں اُبھر آئے۔ ان ۳۴ برسوں میں صلاح الدین نیر ایک پختہ کار شاعر سے ادبی دنیا میں ایک اہم مقام بنا چکے ہیں۔ گلبرگہ یونیورسٹی سے صلاح الدین نیر فن اور شخصیت پر ایک طالبِ علم نے ۱۹۹۱ء میں ایم۔ فل کیا ہے۔ تلگو یونیورسٹی نے اُر بہترین شاعر کے ٹائیٹل سے یونیورسٹی ایوارڈ دیا ہے۔ تلگو یونیورسٹی نے بورڈ آف اسٹ (اُردو کورس ایم۔ اے) رکن منتخب کیا ہے نیر صاحب اور ان سے متعلق ۱۲ نثر و شاعری میں (۱۲) کتابیں شائع ہو چکی ہیں یہ سب اعزازات ہمارے لئے باعثِ فخر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور پر عبدالقادر سروری، صلاح الدین نیر کی صلاحیتوں کی قدر کرتے تھے۔ پروفیسر حبیب صلاح الدین نیر کی اُردو مجلس کی خدمات سے مسرت محسوس کرتے تھے۔ جناب رحمٰن نے کہا کہ صلاح الدین نیر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ منصبِ شعر و ادب پر فائز ہے۔ جہاں صلاح الدین نیر کا دوست ہونے پر فخر ہے وہیں ایک کامیاب مقبول ترین شاعر تسلیم میں بے حد مسرت محسوس ہوتی ہے۔ نیر کی اُصول پسندی، مقصد برآری تک جدوجہد کا آن بان کے ساتھ اپنی شخصیت کے تحفظ میں باخبری، عزتِ نفس، خودداری اور حیدر روایات کی پاسداری ان کی اہم خصوصیات ہیں۔

جناب نہال سنگھ ورما نے کہا کہ حیدرآباد میں گذشتہ ۲۰ برس کے دوران اُردو

ندی کی محفلوں خاص طور پر اُردو ہندی کے ملے جلے مشاعروں کے لئے صلاح الدین نیّر کی خدمات قابلِ فراموش ہیں۔ حیدرآباد ہی نہیں ملک کے ہندی حلقوں میں صلاح الدین نیّر کی شاعرا نہ ت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ہندی حلقوں میں اُردو کے مقبول شاعر ہیں۔ نیّر صاحب کی میری ستی زائد از ۲۵ برس کی ہے۔ میں نے اس طویل مدت میں کبھی انہیں بھی ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا نہیں ۔ارتقائی منازل اور مقبولیت سے انہیں خدا نوازتا جارہا ہے۔

جناب صلاح الدین نیّر نے اظہارِ تشکر کے طور پر کہا کہ ادبی حلقوں میں میری خت ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ قادری، عابد علی خان، محبوب حسین جگر کی سرپرستانہ یے سے ہوئی۔ ادارۂ سیاست سے میں گذشتہ ۳۳ برس سے وابستہ ہوں۔ میری ذہنی ت، میری نشست و برخواست، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے وابستگی میں سیاست نے ہ دیا ہے۔ ایسے موقع پر میں اپنے محسنوں اور بزرگوں کا کھُلے دل سے اعتراف کرتا ۔ میں شکرگزار ہوں کہ ادارۂ مرکزِ ادب کے ذمہ داروں نے میری حوصلہ افزائی کے نیتی تقریب کا اہتمام کیا۔

ابتداء میں صدر ادارۂ جناب عزیز بھارتی نے تعارفی و خیر مقدمی تقریر کی۔ نائب ادارہ جناب قمرالدین صابری نے ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی۔ اجلاس کے بعد رئیس اختر کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مسرز رحمٰن جامیؔ، سکندر محسن (کھمم) راللہ پروگرام اگزیکیٹو دوردرشن اور پرنس شہامت جاہ نے مہمانانِ خصوصی کی سے شرکت کی۔ مسرز رئیس اختر، رحمٰن جامیؔ، صلاح الدین نیّرؔ، صادق نوید ملہ ورما، عزیز بھارتی، سکندر محسن (کھمم) پرنس شہامت جاہ، مومن خان شوقؔ، ری، مدان منظور، قمرالدین صابری، ڈاکٹر محسن، دل ہاشمی، جلال شاہ جلال، م دیباٹیوی نے کلام سُنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ معتمدِ مشاعرہ جناب مومن خان مشاعرہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ ▲▲

خراجِ عقیدت

(عابد علیخاں)

○

ہر ایک رت میں جو ملتا تھا مہرباں کی طرح
ہوائیں لے اُڑیں اُس کو بھی بادباں کی طرح

بلندیاں اُتر آتی تھیں اُس کے آنگن میں
زمیں پہ رہتا تھا وہ شخص آسماں کی طرح

اچانک آپ کا محفل سے اس طرح جانا
کبھی یقیں کی طرح ہے کبھی گماں کی طرح

ہمیں تو کوئی نہ مطلب تھا دھوپ چھاؤں سے
ہمیشہ رہتا تھا اک شخص سائباں کی طرح

تلاش کرتی ہے اب اُس کو آبلہ پائی
جو شخص کل تھا یہاں میرِ کارواں کی طرح

مسافرانِ شبِ غم کی رہبری کے لئے
تمام رات وہ رہتا تھا کہکشاں کی طرح

وہیں پہ رُکتے تھے نیّر تھکے تھکے سے قدم
کہ اُس کا در تھا فقیروں کے آستاں کی طرح

○

ہمارے سامنے قاتل ہے کیا کیا جائے
وہ اب بھی زینتِ محفل ہے کیا کیا جائے

تمام عمر دیا میں نے جس کو درسِ جنوں
وہ آج میرے مقابل ہے کیا کیا جائے

وہ چاہتا ہے کہ اُس کی نظر کی حد میں رہوں
یہ اختیار اُسے حاصل ہے کیا کیا جائے

حصارِ ذات سے آگے نکل گیا ہوتا
نظر میں صاحبِ منزل ہے کیا کیا جائے

میں جانتا ہوں مجھے تم بھلا نہیں سکتے
یہی تو میری بھی مشکل ہے کیا کیا جائے

میں ایک پل کے لئے بھی نہ رُک سکوں گا کہیں
ہوا کے دوش پہ محمل ہے کیا کیا جائے

وہ جس کو ہم سبھی دہشت پسند کہتے ہیں
وطن پرستوں میں شامل ہے کیا کیا جائے

تمام شہر ہے بیمار، دھواں دھواں منظر
یزید اپنے مقابل ہے کیا کیا جائے

بہت سے ڈوبنے والے تو بچ گئے نیّر
ہمارا گھر لبِ ساحل ہے کیا کیا جائے

○

دیوانگی شیریں کی محبت میں ملی ہے
یہ کوہ کنی ہم کو وراثت میں ملی ہے

جس نسبتِ دیرینہ کو ڈھونڈا کیا برسوں
وہ بھی تو تری چشمِ مروّت میں ملی ہے

پیراہنِ تازہ میں بھی، کیا کچھ نہیں لیکن
خوشبو تری شائستہ روایت میں ملی ہے

کب ہم تھے یہاں پہلے، نظر والوں میں شامل
یہ خوش نظری آپ کی چاہت میں ملی ہے

کس موسمِ تازہ کا ہے تحفہ، نہیں معلوم
نرمی تری، پھولوں کی نزاکت میں ملی ہے

اِک عمر سے میں بھی ترے رشتے میں بندھا ہوں
کیا شئے ترے چہرے کی وجاہت میں ملی ہے

اعزاز ہے نیّر یہ مری حیثیتِ معنی کا
یہ خلعتِ زرّیں بھی خلافت میں ملی ہے

○

○

صدیوں کا یہ جھگڑا ہے آپس میں مِلا دیجے
بارش کا ہواؤں سے سمجھوتہ کرا دیجے

پھر آپ کی چوکھٹ پر اِک پل بھی نہ ٹھہروں گا
مجھ کو مرے ماضی سے اِک بار مِلا دیجے

خود غور سے پڑھ لیجے احباب کے چہروں کو
دشمن کی طرح ہوں تو رستے سے ہٹا دیجے

سمجھوتے کی منزل ہے ملنے سے تامّل کیوں
دل صاف اگر ہے تو پھر ہاتھ بڑھا دیجے

میں دخل نہیں دوں گا جب آپ کی مرضی ہے
دل ٹوٹ گیا ہو تو آئینہ بنا دیجے

بدلے ہوئے موسم کا ہم کو بھی ہو اندازہ
روٹھی ہوئی کلیوں کو شبنم سے مِلا دیجے

تہذیبِ نظر مجھ کو ورثے میں مِلی نیّر
گستاخ نظر ہوں تو محفل سے اُٹھا دیجے

○

فصیلِ شہر کو جب تک گِرا نہیں دیں گے
ہمیں یہ لوگ کبھی راستہ نہیں دیں گے

جو تجھ سے چھن گئی مسند تو تُو کہیں بھی بیٹھ!
تجھے ہم اپنا کبھی بوریا نہیں دیں گے

تمام عمر جو چہرے کو اپنے پڑھ نہ سکے
ہم اُن کے ہاتھوں میں اب آئینہ نہیں دیں گے

گھٹن ہو ایسی کہ تم کھُل کے سانس لے نہ سکو
تمہیں ہم اِس سے زیادہ سزا نہیں دیں گے

تجھے ڈبوئیں گے خود تیرے حاشیہ بردار
ہم اپنی راہ سے تجھ کو ہٹا نہیں دیں گے

یہ بزمِ شعر و ادب کب کسی کی ہے میراث
جو نسل گونگی ہو ہم زباں نہیں دیں گے

وہ جن کے نام سے ہم زہر پی گئے نیّر
ہم اُن کے حق میں کبھی بددعا نہیں دیں گے

با تو نہیں ہے کہ محلِ تر نہیں دیکھا
یکھا ہے مگر اس طرح بے گھر نہیں دیکھا

ہ ڈالی ہے جس نے نئی تاریخِ شہادت
نا ہے بلند آپ نے وہ سر نہیں دیکھا

ـ ہاتھ میں تسبیح تھی اک ہاتھ میں تلوار
ں دن سے کسی نے اُسے گھر پر نہیں دیکھا

تیں بھی کئی پیٹھ پہ گھوڑے کی گزاریں
ا ایسا مجاہد کبھی بستر نہیں دیکھا

ب ٹوٹ گیا رشتہ غلاموں کی زمیں سے
د دار تھا اتنا کبھی مُڑ کر نہیں دیکھا

موں کی عمارت تھی وہ رہتی وہیں قائم
ہ لوگوں نے نزدیک سے جا کر نہیں دیکھا

ہی گنہ گاروں کی بخشش ہوئی آساں
، جیسا کہیں میں نے تونگر نہیں دیکھا

دگی خطرہ میں ہے جس شخص کی خاطر
طرح کا میں نے تو قلندر نہیں دیکھا

را ہوا لمحہ تھا قریب آیا تھا نیّر
بس کہ میں نے اُسے چھو کر نہیں دیکھا

مجھ سے نہ تھا اُسے مری غزلوں سے پیار آ
وہ شخص اجنبی تھا مگر غمگسار تھا

اُس کی ہتھیلیوں میں بھی کانٹوں کے زخم ہیں
جس کے گلے میں کل یہاں پھولوں کا ہار تھا

پتھر کہاں سے آگئے لوگوں کے ہاتھ میں
موسم بہار کا تو بہت خوشگوار تھا

لگتا ہے وہ بھی اپنے قبیلے کا آدمی
وہ شخص غم زدہ تھا مگر باوقار تھا

نظریں ملیں تو اور بھی نزدیک ہوگئے
دل کے معاملے میں کسے اختیار تھا

لوگوں کی سنگ باری سے زخمی ہوا بدن
کچھ اپنے دوستوں کا بھی بھرپور وار تھا

کرتا تھا کل جو شہر میں پھولوں کا اہتمام
نیّر! وہی تو قاتلِ فصلِ بہار تھا

○

اعلیٰ ظرفوں کی جگہ کم ظرف جب پانے لگے
اپنا آنگن چھوڑ کر مرکز سے ٹکرانے لگے

خود فریبی کا ذرا یہ بھی تماشہ دیکھئے
کیسے کیسے لوگ اب اوتار کہلانے لگے

اونچی کرسی کی ہوس میں کچھ نے کفر نواز
خالی شیشوں کی طرح آپس میں ٹکرانے لگے

ایسے ویسوں کے سروں پر تاج کچھ سجتا نہیں
جانے کیسے لوگ ہیں جو خود کو بہلانے لگے

مجرمِ اقدارِ رفتہ، قاتلِ تہذیبِ نو
زندگی کا نام لے کر زہر پھیلانے لگے

جب ہوا تیغِ یزیدی لشکروں کا سامنا
سر ہمارے اور اونچائی سے لہرانے لگے

○

اِس فصلِ گُل کا ایسا ہی اک حادثہ ہوں میں
پھولوں کی پتیوں سے بھی کٹنے لگا ہوں میں

مسند نشیں ہوں آج تو حیرت ہے کس لیے
فرشِ نگاہِ دوست بھی برسوں رہا ہوں میں

بے وجہ وضع داری پہ الزام آگیا
حالانکہ تیرے ساتھ ہی چلتا رہا ہوں میں

بادِ صبا کی طرح جو چھو کر گزر گئی
اب بھی اُسی نگاہ کا اک سلسلہ ہوں میں

کب تک رکھو گے مجھکو اندھیروں میں دوستو
برسوں تمہارے شہر میں جلتا رہا ہوں میں

خوشبو تمہارے ہاتھوں کی دل میں اُتر گئی
جتنے خطوط پاس تھے لوٹا رہا ہوں میں

جب تاج ہی نہیں ہے تو بن باس کس لیے
نیّرؔ خود اپنے گھر سے نکالا گیا ہوں میں

وست! کئی بار یہاں ٹوٹ چکا ہوں
کے ترے شہر میں آئینہ بنا ہوں

احبابوں کی ہو تقسیم برابر
ن کے لئے میں بھی اندھیروں میں رہا ہوں

ہے نظروں کو تشفی نہیں ہوتی
میں برسوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں

نے کہا مجھ کو ہے کونین کی خواہش
سی ترے دل میں جگہ ڈھونڈ رہا ہوں

کبھی آپ کی آنکھوں میں کچھ آنسو
تے سے میں آج ملک بھیگ رہا ہوں

فا پی کے بھی خاموش ہوں نیّر
کس جرم تمنا کی سزا ہوں

ہر قدم پر ہے شکستِ تازہ
جب سے بکھرا ہے دل کا شیرازہ

آرزوئے فصلِ گل کی کون کرے
دل کا ہر زخم ہے ترو تازہ

صبحِ روشن خریدنے والو!
ہے تمہیں شامِ غم کا اندازہ

ڈوبتے ڈوبتے ستاروں نے
چہرۂ شب پہ مل دیا غازہ

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے
تیرا کیا ہوگا اے "گلِ تازہ"

سب تبسم پرست ہیں نیّر
کس کو ہے میرے غم کا اندازہ

○

متاعِ ہوش یہاں سب نے بیچ ڈالی ہے
تمہارے شہر کی تہذیب ہی نرالی ہے

ہم اہلِ درد ہیں تقسیم ہو نہیں سکتے
ہماری داستاں گلشن میں ڈالی ڈالی ہے

نہ جانے بزم سے کس کو اُٹھا دیا تم نے
تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے

تعلقات کو ٹوٹے ہوئے زمانہ ہوا
وہ اک نگاہ مگر آج بھی سوالی ہے

خلوص بانٹتا میں سب کے گھر گیا لیکن
تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے

کسی کی شمعیں سرِ شام بجھ گئیں نیّر
کسی کے شہر میں لیکن ابھی دیوالی ہے

○

ہر رُت میں ایسے لوگ متاعِ چمن رہے
جو اپنے گھر میں رہ کے غریب الوطن رہے

ہر زخم اپنی ذات کا آپس میں بانٹ لیں
ہم میں کم از کم اتنا تو دیوانہ پن رہے

خاکِ وطن نے اُن کو گلے سے لگا لیا
جو لوگ قتل ہو کے یہاں بے کفن رہے

اِس طرح کج کلاہی کو اپنی سنبھالیئے
دشمن سے گفتگو میں بھی اک بانکپن رہے

ہم نے لہو دیا ہے نئی روشنی کے نام
ہم بھی تمہاری طرح سے زخمی بدن رہے

ہم اپنی وضع داری پہ قائم ہیں آج بھی
کچھ مرحلوں پہ ہم بھی روایت شکن رہے

نیّر رہے گئے جب بھی صلیبوں کے درمیاں
مٹی وطن کی ہاتھ میں سر پہ کفن رہے

○

خانے کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے
ں میں یہ کیوں آخرِ شب پھوٹ پڑی ہے

وئے بہاراں درِ زنداں پہ کھڑی ہے
مول کہ مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

ت محبت کے تقاضوں کو تو سمجھو
لِ تمنا کے لئے عمر پڑی ہے

دیکھ رہا ہوں تمہیں کچھ کہہ نہیں سکتا
ش محبت کی سزا کتنی کڑی ہے

ہوئے دل کو نظر انداز نہ کیجے
دیہ چھوٹی ہے مگر بات بڑی ہے

تا سفر سے ابھی واقف نہیں شاید
سے تری منزل ترے قدموں پہ پڑی ہے

ہ دستار سنبھالے ہوئے رکھنا
ہ شریفوں پہ قیامت کی گھڑی ہے

○

مسندِ سجادگی جب چھین کر لائی گئی
تھی قلندر کی امانت اس کو لوٹائی گئی

صبحِ آزادی اُجالوں کی ضمانت تھی مگر
اِس ادا سے روشنی آئی کہ بینائی گئی

ریزہ ریزہ جب ہوئے ہم آئینوں کے شہر میں
ہم کو اپنی دوسری تصویر دکھلائی گئی

مطمئن تھے ہم کہ موسم بدل جانے کے بعد
فصلِ گل کی پھر وہی تاریخ دُہرائی گئی

آپ جب بھی اپنے گھر میں اجنبی سے ہو گئے
آپ کے گھر میری برسوں کی شناسائی گئی

آتے آتے آپ نے کچھ اِس قدر تاخیر کی
آپ کے آنے تلک چہرہ کی رعنائی گئی

اِتنی ہی تیز ہے خوشبو کے سفر کی داستاں
[illegible]

شعر کہتا ہوں ہمیشہ ہٹ کے طرزِ عام سے
ہر غزل کی ابتداء کرتا ہوں تیرے نام سے

بح تو ہونے لگی ہے جانے کیا انجام ہو
ل بہت گھبرا رہا ہے روشنی کے نام سے

پ سے ہم مطمئن تھے دشمنی جب تک رہی
ر کوئی دھوکہ نہ دینا دوستی کے نام سے

سہ دریوزہ دے کر اہلِ فن کے ہاتھ میں
ندگی سوئی ہوئی ہے کس قدر آرام سے

رموں کی طرح کب تک ہم پسِ پردہ رہیں
ب تلک تیر چبھیں گے مصلحت کے نام سے

کب مرا ٹوٹا ہوا گھر پھر مکاں ہو جائے گا
کب زمیں پہ رہنے والا آسماں ہو جائے گا

آپ تو جائیں گے لیکن میں نے یہ سوچا نہ تھا
زندگی کا ہر سہارا بے زباں ہو جائے گا

تب میں سو جاؤں گا تنہائی کی چادر اوڑھ کر
سایۂ ابرِ رواں جب سائباں ہو جائے گا

کس کو اب پہچان لوگے کس کو ڈھونڈو گے یہاں
ہر پرانا زخم ہی جب بے زباں ہو جائے گا

انتظارِ دوست کی جس وقت بھی ٹوٹے گی آس
میرا جینا مرنا سب کچھ رائیگاں ہو جائے گا

کیا کروں سب کچھ ہی اب سہتے ہوئے خاموش ہوں
اک نہ اک دن وہ بھی مجھ پر مہرباں ہو جائے گا

اپنے گھر رکھوں گا تیر ایک مہماں کی طرح
درد بڑھتے بڑھتے جب بھی بے کراں ہو جائے گا

○

کیا جانے اب کے رُت یہاں کیا کام کر گئی
چادر نئی بہار کے سَر سے اُتر گئی!

تم اک لکیر کھینچ کے ہی مطمئن رہے
حدِّ تعیّنات سے آگے نظر گئی

گھبرا کے آسماں کی طرف دیکھتا ہوں میں
اب کے بھی خالی ہاتھ دعائے سحر گئی

پچھلی روایتوں کو بچانے کے باوجود
احساس زندہ رہ گیا تہذیب مر گئی

گلشن میں پھول، کلیوں کا بٹوارہ جب ہوا
پہلو بچا کے سب سے نسیمِ سحر گئی

اِس دورِ تشنگی کا کرشمہ تو دیکھئے
ہر ایک صبح، شامِ غریباں سے ڈر گئی

تا صبح شمعِ آرزو جلتی رہی مگر
راتوں کا زہر پی کے نہ جانے کدھر گئی

نیّر! یہی ہے غم کہ اُسے چھو نہیں سکا
تازہ ہوا قریب سے ہو کر گذر گئی

○

مہماں بن کے آئے مگر گھر میں رہ گئے
کچھ پھول تیری زلفوں کے بستر میں رہ گئے

محنت کے ہاتھ چومتا رہتا ہوں اس لئے
کچھ پھول تیرے ہاتھ کے پتھر میں رہ گئے

جانا تھا جن کو جا چکے میدان چھوڑ کر
ہم جیسے سرفروش ہی لشکر میں رہ گئے

کون اب کرے گا صحرا نوردوں سے گفتگو
کانٹے بہارِ نو کے گلِ تر میں رہ گئے

ملنے لگا ہے اب مری پیاس کا ثبوت
کچھ تیرے اشک بھر کے ساغر میں رہ گئے

نیّر ہے جن سے نسبتِ دیرینہ آج بھی
کچھ ایسے خار پھولوں کی چادر میں رہ گئے

○

O

نیند اُڑ گئی تو خواب کی تعبیر رہ گئی
وہ جا چکے ہیں مسند پہ تصویر رہ گئی

اِک نسل میرے سامنے ہے کیا جواب دوں
ٹوٹے ہوئے مکانوں کی تعمیر رہ گئی

سورج کو لے کے ہاتھ میں ہم مطمئن رہے
آنگے اندھیرے بڑھ گئے تنویر رہ گئی

جو نقش تھے حیات کے سب مٹ گئے مگر
کتبہ پہ اپنے نام کی تحریر رہ گئی

نظریں ملیں جو تم سے تو بس دیکھتا رہا
لیکن تمہاری آنکھوں کی تفسیر رہ گئی

نیّر! ہوا کا جھونکا تھا آکر چلا گیا
لیکن اُس ایک خوشبو کی تاثیر رہ گئی

O

O

کیا ضروری ہے کہ شعلوں کو ہوا دی جائے
کیوں نہ اِس شہر سے یہ رسم اُٹھا دی جائے

ہم کو جینا ہے یہاں خونی کے رشتوں کی طرح
فاصلے ہوں تو یہ دیوار گرا دی جائے

جرم ثابت ہو تو سُولی پہ چڑھا دو مجھ کو
کیوں مرے جرم کی اوروں کو سزا دی جائے

تُو جو بجھ جائے تو ہر سمت اندھیرا ہوگا
زندگی! کیوں نہ تری عمر بڑھا دی جائے

اُتنا ہی پاؤں سے زنجیر کا رشتہ ہوگا
جس قدر قید کی معیاد بڑھا دی جائے

کون قاتل ہے یہاں اپنے رفیقوں کے سوا
سب بھلے لوگ ہیں کس کس کو سزا دی جائے

گھر کی دیوار تھی پُرکھوں کی امانت نیّر
کس نے چاہا تھا دیوار گرا دی جائے

O

بے نیازانہ قلندر کی طرح رہتا ہوں
میں جہاں بھی ہوں ہر اک فکر سے بیگانہ ہوں

مجھ کو یہ ناز ہے آواز نئی لایا ہوں
مجھ کو بھی فخر ہے اِس دور کا سرمایہ ہوں

میرے اسلاف کی خوشبو ہے مری سانسوں میں
میں بھی اُس شمع فروزاں ہی کا پروانہ ہوں

جذب جب ہو گئی دروازہ پہ دستک میری
تب کہیں جا کے ترے در سے پلٹ آیا ہوں

میں تری بزم تبسم سے بڑی مشکل سے
آبروئے دیدۂ پُرنم کی بچا لایا ہوں

زندگی یوں نہ مجھے چھوڑ کے جانا تنہا
اک نظر دیکھ لے میں بھی ترا ہمسایہ ہوں

خانقاہوں کی امانت کو میں لے کر نیّر
اپنی مسند پہ قلندر کی طرح بیٹھا ہوں

ایک دن آئے گا ایسا بھی کرشمہ ہوگا
تیرے چہرہ پہ مری پلکوں کا سایہ ہوگا

کٹ گئی عمر مگر نام کوئی دے نہ سکا
زندگی! تجھ سے مرا کون سا رشتہ ہوگا

بے دیا گھر ہے سرِ شام ہی سو جاتا ہوں
اک نہ اک دن تو مرے گھر میں اُجالا ہوگا

اِس توقع پہ کہ دستک کی صدا آئے گی
پاس دروازے کے اب تک کوئی بیٹھا ہوگا

زندگی خانہ بدوشوں میں بھی گذری ہوگی
تب کسی نے تمہیں مسند پہ بٹھایا ہوگا

مٹ گئی ہو گی کئی چہروں کی تیری پہچان
آئینہ ٹوٹ کے جب فرش پہ بکھرا ہوگا

○

کب میں نے کہا دل میں چھُپانے کے لئے ہے
یہ خاک تو ماتھے پہ لگانے کے لئے ہے

فردوس یہ داماں سبھی یہ سارے محلّے
کب تیری گلی چھوڑ کے جانے کے لئے ہے

ہم جیسے فقیروں کی پگھلتی ہوئی آواز
تم جیسے رئیسوں کو جگانے کے لئے ہے

بے وقت کی برسات یہ سیلاب یہ طوفاں
بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے کے لئے ہے

اب صحنِ گلستاں تہی دامن نہ رہے گا
یہ بادِ صبا پھول کھِلانے کے لئے ہے

نیّراؔ کبھی غم اپنا سرِ بزم نہ کہنا
کیا داغِ وفا سب کو دکھانے کے لئے ہے

○

○

نیند اپنی چھوڑ کر خوابوں کا بستر لے گیا
کوئی گھر آ کر مرے سب کچھ اُٹھا کر لے گیا

اب تو آنگن میں مرے خوشبو کا جھونکا بھی نہیں
میرے گھر کی ساری خوشیاں دیدۂ تر لے گیا

جانے کیسی آس تھی احساسِ محرومی لئے
آستانِ یار جب چھوٹا تو گھر گھر لے گیا

جس نے آہٹ بھی نہ چھوڑی اُس کو اب ڈھونڈوں کہاں
اپنی خوشبو تک وہ آنچل میں چھپا کر لے گیا

جب کبھی ترکہ میں سجادہ نشیں اُلجھے رہے
ساری پونجی خانقاہوں کی قلندر لے گیا

فرش پہ چلتے ہی نیّر پاؤں زخمی ہو گئے
آئینوں کے گھر میں جانے کون پتھر لے گیا

○

○

لبِ خاموش ہوں، ناگفتنی ہوں
بھری محفل میں رہ کر اجنبی ہوں

اندھیروں کے حوالے کرنے والو
کسی محفل کی میں بھی روشنی ہوں

تمہارے ساتھ ہی رہتا ہوں لیکن
مجھے سمجھو تو میں بھی دیدنی ہوں

مجھے تم سوچ کر زیراب دینا
کسی پیاسے لبوں کی تشنگی ہوں

جو مرجھائے گئے ہیں فصلِ گُل میں
اُنہیں پھولوں کی میں بھی تازگی ہوں

اجل سے لمحہ لمحہ ڈرنے والو!
مجھے دیکھو سراپا زندگی ہوں

ہمیشہ بھیگتا رہتا ہوں نیّر
نہ جانے کس کی پلکوں کی نمی ہوں

○

کسی کے ساتھ جہاں دوستی بھی کرتے ہیں
اُسی حساب سے ہم دشمنی بھی کرتے ہیں

سفر طویل ہے تم احتیاط سے رہنا
جو رہنما ہیں وہی رہزنی بھی کرتے ہیں

ہم اسلئے کہ سلامت رہے یہ میخانہ
تمہارے نام کبھی تشنگی بھی کرتے ہیں

کہیں نہ تم پہ کبھی ہم ظاہر ہوں ہم بھی پوری طرح
تمہارے ذکر میں ہم کچھ کمی بھی کرتے ہیں

حصارِ شہر میں رہ کر بھی روشنی کے نقیب
رہینِ تشنہ لبی، زندگی بھی کرتے ہیں

وہ زندگی کے اچھوتے، شگفتہ لمحوں کو
قریب لانے کبھی بے رُخی بھی کرتے ہیں

کبھی تو نیّرِ تاباں کو جاکے دیکھ بھی لو
سُنا ہے اِن دنوں وہ شاعری بھی کرتے ہیں

○

مجھے اپنی تباہی شکایت ہے
تمہارے ساتھ کیا دھوکہ ہوا ہے

زمانہ زندگی کا زہر دے کر
پتہ مجھ سے اجل کا پوچھتا ہے

جو پیمانہ کبھی رِندوں کا دل تھا
سرِ میخانہ وہ ٹوٹا پڑا ہے

مری تنہائیاں مجھ سے نہ چھینو
مرے ہاں ویسے بھی اب کیا رہا ہے

اجل سے زندگی کے راستے تک
محبت درمیانی فاصلہ ہے

جسے محفل سے اُٹھوایا گیا تھا
زمانہ اُس کو اب تک ڈھونڈتا ہے

بہت تاخیر کی آنے میں نیّر
مری دنیا میں اب کیا رہ گیا ہے

تشنگی جب کبھی مے خانے میں لے آتی ہے
آپ کی پیاس مرے ہونٹوں پہ جم جاتی ہے

آپ نے اِتنے کچھ احسان کئے ہیں ہم پر
زندگی آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے

یادِ محبوب کو اللہ سلامت رکھے
خلوتِ دل کے ہر اک گوشے کو مہکاتی ہے

جب بھی اِس سمت سے گزرے ہے نسیمِ سحری
میرے آنگن میں بھی کچھ دیر ٹھہر جاتی ہے

پابرہنہ ہے مری زیست تو حیراں کیوں ہے
زندگی خانہ بدوشوں کو بھی گھر لاتی ہے

جاتے جاتے کبھی مُڑ کر تو نہ دیکھو مجھ کو
میں اگر چُپ بھی رہوں دل بڑا جذباتی ہے

زندگی دشت نوردی ہی میں خوش تھی نیّر
اپنے گھر لوٹ کے اور بھی پچھتاتی ہے

مرا دل چلتے چلتے جب رُکے گا
تمہیں اک آخری آواز دے گا

بساطِ گُل ہو یا دامانِ صحرا
جنوں کا قافلہ چلتا رہے گا

ترے دامن کی شہرت تو بہت ہے
مرے اشکوں کی قیمت کون دے گا

دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں
چراغِ آرزو جلتا رہے گا

جسے بے چین رہنے کی ہے عادت
سکونِ دل ملے تو کیا کرے گا

اگر یادیں بھی ہم سے چھین لو گے
ہماری زندگی میں کیا رہے گا

اندھیرے گھر میں کون آئے نشترؔ
فریبِ روشنی جب تک رہے گا

○

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں
آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں

زخموں کو میرے پھول سمجھتے ہیں سب مگر
پلکوں پہ اپنے کوئی انہیں رولتا نہیں

غم بھی یہ قدرِ حوصلہ ملتا ہے دوستو
بازار میں یہ جنس کوئی تولتا نہیں

ہر زخم تیرے نام سے سہتا تو ہوں مگر
بات اپنے دل کی مصلحتاً بولتا نہیں

مانوس ہوں کچھ اتنا غمِ زندگی سے میں
دل فرطِ انبساط سے بھی ڈولتا نہیں

نشترؔ خود اشک زینتِ مژگاں بنے مگر
موتی سمجھ کے کوئی انہیں رولتا نہیں

○

اس طرح دوستی کا اثر چھوڑ جاؤں گا
چہرے پہ تیرے عکسِ نظر چھوڑ جاؤں گا

ماتھے کا زخم تجھ کو دلائے گا میری یاد
آئینہ تیرے گھر میں اگر چھوڑ جاؤں گا

زخمی ہوں ایسے حال میں اب جاؤں گا کہاں
جب بھی بھریں گے زخم تو گھر چھوڑ جاؤں گا

تجھ سے بچھڑ کے پھر کبھی رونا اگر پڑا
دامن میں تیرے دیدۂ تر چھوڑ جاؤں گا

قربت رہے گی ترکِ تعلق کے بعد بھی
جاتے ہوئے میں رختِ سفر چھوڑ جاؤں گا

تنہائیوں میں جب بھی ترا دل اُداس ہو
تیرے لئے میں نورِ سحر چھوڑ جاؤں گا

تنہا رہوں گا کتنا اکیلا میں اُس گھڑی
جس دن میں اُن کی راہ گزر چھوڑ جاؤں گا

تم بھی یہیں تھے اپنے مکانوں میں ک
لُٹنے سے پہلے قافلے والوں میں کب

خنجر کی دھار پر تھی قبیلے کی
اِس کے سوا بھی خانہ بدوشوں میں

ذہنی تحفظات تھے تم خود نہ پڑ
دیوانِ میرؔ جیسی کتابوں میں کیا

جس موڑ پر بھی جائیے میخانے
پہلے ہمارے شہر کی راتوں میں کیا

تم ابتداء سے خود ہی قناعت پ
ورنہ قلندروں کی دعاؤں میں

محلوں کی روشنی سے نکل کر تو
نیّرؔ! ہمارے گھر کے اُجالوں میں کب

مکتبہ شاداب میں کتب برائے فروخت

		قیمت
۱۔ مواعظِ ہادی	(سید محی الدین قادری ہادی)	15=00
۲۔ صوتِ ہادی	(〃 〃 〃)	20=00
۳۔ مختصر تاریخ ادب عربی	(〃 〃 〃)	10=00
۴۔ مختصر احوالِ علماء و اولیائے حیدرآباد	(〃 〃 〃)	25=00
۵۔ تذکرۂ اجدادِ ہادی	(〃 〃 〃)	35=00
۶۔ چشمِ معتبر	(عزیزیہ بھارتی)	30=00
۷۔ یہ کیسا رشتہ ہے	(صلاح الدین نیّر)	50=00
۸۔ سلسلہ پھولوں کا	(〃 〃 〃 〃)	30=00
۹۔ قافلہ چلتا رہے گا	(〃 〃 〃 〃)	30=00
۱۰۔ پھر وہی پرچھائیاں	(〃 〃 〃)	25=00
۱۱۔ خوشبو سا سفر	(〃 〃 〃)	16=00
۱۲۔ شکن در شکن	(〃 〃 〃)	12=00
۱۳۔ عظمتِ خیاباں	(〃 〃 〃)	40=00
۱۴۔ حیدرآباد کے علمی اور ادبی ادارے	(شفیعہ قادری)	20=00
۱۵۔ تعارف	(〃 〃)	12=00
۱۶۔ اب کے برس	(فاطمہ تاج)	20=00
۱۷۔ آس پاس	(〃 〃)	25=00
۱۸۔ امانت	(〃 〃)	40=00

۱۹۔ دلاسا	(ناظم تاج)	30=00
۲۰۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (حیات و خدمات)	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن خاں	60=00
۲۱۔ خیالی پلاؤ	(رشیدالدین)	15=00
۲۲۔ آبِ دیدہ	(راشد آذر)	10=00
۲۳۔ جمع و خرچ وفا	(〃 〃)	16=00
۲۴۔ منزلِ شوق	(〃 〃)	25=00
۲۵۔ خاکِ انا	(〃 〃)	10=00
۲۶۔ پہچان	(کویتا کرن)	15=00
۲۷۔ سوغات	(〃 〃)	30=00
۲۸۔ حیدرآباد میں افسانہ نگاری	(انیس قیوم فیاض)	8=00
۲۹۔ شجرِ صدا	(سریندر شجر)	40=00
۳۰۔ شعلۂ مینا	(متین سروش)	15=00
۳۱۔ جالیات	(بدرالحسن بدر جالی)	60=00
۳۲۔ ضربِ آگہی	(محمد آفاق صدیقی)	48=00
۳۳۔ رات کے ہزار ہاتھ	(علی ظہیر)	15=00
۳۴۔ بہ گردنِ راوی	(ایم۔ اے۔ وحید)	18=00
۳۵۔ زخمِ آگہی	(محمد اعظم اثر)	10=00
۳۶۔ دیوانِ مسعود	(محمد مسعود صدیقی مسعود)	30=00
۳۷۔ بہارِ غزل	(اقبال حسین اقبال)	8=00
۳۸۔ گھر کی دیوار	(انیس قیوم فیاض)	8=00
۳۹۔ کیف و سرور	(غلام محی الدین خاں کیف)	15=0.0

۴۰۔ شہداب	(رؤف خیر)	40=00
۴۱۔ سونے چاندی کے بُت	(خواجہ احمد عباس)	45=00
۴۲۔ چار شہر ایک کہانی	(وحید انور)	20=00
۴۳۔ ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات	(محمد عبدالرزاق فاروقی)	30=00
۴۴۔ نذرِ رزاق فاروقی	(" " ")	75=00
۴۵۔ مشورے	(" " ")	50=00
۴۶۔ ہمارا ہما پرندہ	(مظہر الزماں خاں)	10=00
۴۷۔ آخری زمین	(" ")	30=00
۴۸۔ تصویرِ حیات	(بشیر امجد)	50=00
۴۹۔ کنواں آدمی اور سمندر	(عوض سعید)	50=00
۵۰۔ دین و دنیا (دوم)	(امیر حیدر بہار)	20=00
۵۱۔ سازِ مغرب	(حسن الدین احمد)	20=00
۵۲۔ مفہوم القرآن (پارہ ۲ تا ۹) (چہارم تا ہفتم)	(" " " ")	4=00
۵۳۔ محفل حسن اکیڈمی	(" " ")	20=00
۵۴۔ زبانِ اشعار (دوم)	(" " ")	20=00
۵۵۔ قرآن فہمی (آسان راستہ)	(" " ")	15=00
۵۶۔ انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	(" ")	50=00
۵۷۔ وہ ذہن جسکی تعمیر قرآن کرتا ہے	(ڈاکٹر سید عبداللطیف)	50=00
۵۸۔ سازِ مشرق (اوّل)	(حسن الدین احمد)	20=00
۵۹۔ " " (دوم)	(" " ")	20=00
۶۰۔ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ اوّل	(میر محمود علی قیصر)	25=00

۶۱- ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ (دوم)	(میر محمود علی قیصر)	25=00
۶۲- سکندرآباد کی ادبی دستاویز	(محسن جلگانوی)	50=00
۶۳- پسِ مرگ	(سلطان نقشبندی)	10=00
۶۴- انسان، سائنس اور ماحول	(محمد یوسف مڑکی)	60=00
۶۵- فرہنگ غلط العلوم	(ادیب حیدرآبادی)	25=00
۶۶- گاندھی جی کے اقوال	(// //)	14=00
۶۷- تاثرات (منظوم پیش کش)	(سعادت نظیر)	20=00
۶۸- پھول ہی پھول	(// //)	15=00
۶۹- آب و رنگ	(// //)	15=00
۷۰- تعلیمی مسائل	(محمد اسحاق)	50=00
۷۱- گلشنِ نارسا	(شفیع اقبال)	30=00
۷۲- وابستگی	(حلیم بابر)	35=00
۷۳- نشاطِ آرزو	(مومن خاں شوق)	40=00
۷۴- میں کتھا سناتا ہوں	(عاتق شاہ)	35=00
۷۵- تحقیق نقوش	(ڈاکٹر محمد علی اثر)	75=00
۷۶- کلیاتِ ایمان	(// // //)	40=00
۷۷- مدحِ ساقیٔ کوثر	(حسن فیاض مدراسی)	10=00
۷۸- چبھک اُٹھی لفظوں کی چھاگل	(وزیر آغا)	300=00
۷۹- مسلکِ باقیات	(ظہیر احمد باقوی راہی فدائی)	10=00
۸۰- کڑپہ میں اُردو	(// // // //)	10=00
۸۱- خود رَو	(سید بشارت علی)	80=00

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

ڈسمبر ۱۹۹۴ء — جلد (۱۱) — قیمت ۶ روپئے

شمارہ (۱۲)

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

جائنٹ ایڈیٹرز

مومن خاں شوق ـ رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر:ـ محمد نہال احمد صدیقی

مجلسِ مشاورت

زرِ تعاون

ہندوستان	سالانہ	۲۵ روپے	۲ سال ۱۲۰ روپے	تاحیات ۱۵۰۰ روپے
بیرونی ممالک	"	۲۰۰ "	" ۳۶۰ "	" ۳۷۰۰ "
امریکہ	"	۴۰ ڈالر	" ۷۰ ڈالر	" ۷۰۰ ڈالر
انگلستان	"	۲۵ پونڈ	" ۴۵ پونڈ	" ۴۰۰ پونڈ
پاکستان	"	۱۷۵ پاکستانی روپے	" ۳۰۰ روپے	" ۳۰۰۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ "شاداب" ۱۱-۵-۱۴۷، ریڈ ہلز، حیدرآباد-۴

ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر، محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے

سے پرنٹ [illegible] دفتر "شاداب" ۱۱-۵-۱۴۷ ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

محمد قمرالدین صابری
ایڈیٹر شاداب

نسخۂ کیمیا

سورہ بنی اسرائیل قرآن کریم کا ۱۷ واں سورہ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں معراج کا ذکر ہے۔ گویا یہ آیت معراج کے بعد نازل ہوئی معراج کے تقریباً ایک سال بعد حضور اکرمؐ نے ہجرت فرمائی۔ اس طرح یہ سورۃ اس ایک سال کے عرصہ میں نازل ہوئی جبکہ مسلمان مکہ میں سخت بے کسی اور مظلومی کی حالت میں تھے۔ چند مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے تھے اور باقی پر مکّہ میں عرصہ حیات تنگ تھا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جان خطرہ میں تھی۔ بظاہر باطل کا غلبہ تھا اور حق کے غالب آنے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ مشکلات کے طوفان میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہیں۔ کفر کے ساتھ مصالحت کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ نیز مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ کفار کے ظلم وستم اور ان کی کج بحثیوں سے صبر وسکون کو اپنے ہاتھ سے نہ دیں۔ اور تبلیغ و اصلاح کے کام میں اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔

اس سلسلے میں اصلاح و تزکیہ نفس کے لئے مسلمانوں کو نماز کا نسخہ بتایا گیا، پانچوں فرض نمازوں کی تلقین کی گئی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جہاں لے جائیں صداقت و راحت کے ساتھ لے جائیں۔ جہاں سے نکالنا چاہیں صداقت و راحت کے ساتھ نکالیں اور مسلمانوں کو غلبہ و اقتدار دیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت

مدد بھی ہو۔ اِس دُعا کے ساتھ ہی اِس کی قبولیت کی بشارت دی گئی کہ حق آگیا
باطل چلا گیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ خود قرآن پاک ایمان والوں کے لئے شفاء اور
ت ہے اور یہ انھیں غلبہ و اقتدار دلانے کے لئے کافی ہے۔

آج ہندوستان کے مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں' یہ بالکل ایسے ہی
لات ہیں جن سے ہجرت سے پہلے مکہ کے مسلمان دوچار تھے۔ انھوں نے قرآن کو
مضبوطی سے تھاما' نمازیں قائم کیں' تلقین شدہ دُعاؤں کی التجا کی اور ہجرت کے چند
ال بعد ہی فتح مکہ سے نوازے گئے۔ اصلاح و تزکیہ نفس کی ترکیب اور حصول غلبہ و
تدار کا گُر' نمازوں کے قیام کو بتایا گیا ہے۔ سورہ کے نویں رکوع میں فرمایا گیا:

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْآنَ
الْفَجْرِ ط إِنَّ الْقُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝

(نماز قائم کیجئے زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے
قرآن کا بھی التزام کیجئے کیونکہ فجر کا قرآن مشہود ہوتا ہے)

مکلات و مصائب کے ذکر کے فوراً بعد نماز قائم کرنے کا حکم دے کر یہ اشارہ فرمایا
ہے کہ وہ ثابت قدمی' جو اِن حالات میں ایک مومن کو درکار ہے' اقامت صلوٰۃ
سے حاصل ہوتی ہے۔

فجر کے لغوی معنی "پو پھٹنا" ہیں یعنی وہ وقت اول اول سپیدۂ صبح
ت کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے۔ "فجر کے قرآن" سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن
میں نماز کے لئے کہیں تو لفظ "صلوٰۃ" استعمال ہوا ہے اور کہیں اس کے مختلف اجزا
سے کسی جز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ مثلاً تسبیح' حمد' ذکر' قیام
ع' سجود وغیرہ۔

قرآن فجر کے مشہود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اس کے گواہ بنتے ہیں

یوں تو فرشتے ہر نماز اور ہر نیکی کے گواہ ہیں لیکن نماز فجر کی قرأت پر ان کی گواہی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز میں طویل قرأت کا طریقہ اختیار فرمایا۔

اس آیت میں مجملاً یہ بتایا گیا ہے کہ پانچ نمازیں جو معراج کے موقع پر فرض کی گئیں۔ ان میں ایک نماز تو طلوع آفتاب سے قبل پڑھی جائے اور باقی چار زوال آفتاب کے بعد سے ظلمت شب تک پڑھی جائیں۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹

(اور رات کو تہجد پڑھا کیجئے یہ آپ کے لئے "نفل" (زاید چیز) ہے بعید نہیں کہ آپ کا رب آپ کو "مقام محمود" میں جگہ دے)

تہجد کے معنی نیند توڑ کر اٹھنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ رات کا ایک حصہ سونے کے بعد پھر اٹھ کر نماز پڑھی جائے۔ "نفل" کے معنی ہیں "فرض سے زاید" اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ پہلی پانچ نمازیں فرض ہیں اور یہ چھٹی نماز یعنی فرض سے زاید ہے۔

نمازوں کی ادائی کے حکم کے بعد بشارت دی گئی ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا۔ جسے مقام شفاعت کبریٰ بھی کہا گیا ہے۔ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقام شفاعت پر کھڑے ہوں گے اور تمام خلائق کے حساب کتاب کی شفاعت ہوگی۔ "مقام محمود" سے اشارہ قریب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلد مکی زندگی کی مشکلات و مصائب ختم ہوں گے اور مدینہ کی شاندار زندگی شروع ہوگی (جہاں جلد ہی) اسلام کے منشور کے مطابق اسلامی ریاست قائم ہوگی جہاں سے ملک بلکہ پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اور بہتری و بھلائی کا کام شروع ہوگا

ان کی شفاعت کا سامان پیدا ہوگا۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝

(اور آپ یوں دُعا کیجئے کہ اے رب! مجھ کو جہاں بھی لے جائیو، سچائی کے ساتھ لے جائیو اور جہاں سے بھی نکالیو، سچائی کے ساتھ نکالیو۔ اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجیو جس کے ساتھ نصرت ہو۔)

یہاں التجا اور تفویض اِلیٰ اللہ کا حکم ہے، اس دُعا کی تلقین کی گئی کہ جہاں لے جانا ہو، صداقت و راحت کے ساتھ لے جائیو اور جہاں سے نکالنا ہو صداقت و راحت کے ساتھ نکالیو۔ اس ادخال و اخراج کی چار طرح سے تعبیر کی گئی ہے۔

۱۔ موت میں دخول اور حشر میں خروج، جن ایمان والوں نے نماز قائم کر کے اپنی اصلاح اور تزکیہ نفس کر کے روحانی عروج حاصل کر لیا ہے وہ ہر ادخال و اخراج پر صداقت و راحت پاتے ہیں۔

۲۔ مدینہ کی نئی شاندار زندگی میں ہجرت کے بعد ادخال اور مکہ کی ظلم و زیادتی میں پھنسی ہوئی زندگی سے اخراج۔ یہ دُعا ایسے وقت تلقین کی گئی جبکہ مکی زندگی کی مصیبت و مشقت سے چھٹکارے کے آثار ظاہر نہ تھے اور مدینہ کی کامیاب زندگی بھی مستقبل کے پردہ میں پوشیدہ تھی۔

۳۔ تیسری تعبیر بھی ہجرت ہی سے متعلق ہے کہ مدینہ میں ادخال اور مکہ سے خروج صداقت و راحت کے ساتھ ہوں۔ اس میں مدینہ کے غلبہ و اقتدار کی خواہش ہو نہ مکہ والوں کے خلاف غصہ اور ان سے بدلہ لینے کا خیال ہو بلکہ یہ مقصد ہو کہ مدینہ کا غلبہ و اقتدار پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال ہوگا اور مکہ فتح مکہ والوں کیلئے

م معافی کا باعث بنے گی۔

ا۔ عام ایمان والوں کے لئے ان کی زندگی کے ہر مرحلہ پہ ادخال اور اخراج حق وصداقت
کے ساتھ ہو۔ ہر ادخال پہ راحت وسکون ملے اور ہر اخراج پر ظلم وزیادتی سے چھٹکارا ملے
جیسے کہ آج ہندوستان بلکہ پوری دُنیا کے مسلمان اِسی دورِ ابتلا وامتحان سے گذر
رہے ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔ اُوپر بتائی ہوئی دُعا کریں۔ اور
راحت وسکون کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔

ہر دُعا میں اللہ کی نصرت و مدد ہونی چاہیئے۔ دُنیا میں کامیابی کے لئے
بظاہر کتنے ہی سامان کئے جائیں کامیابی ظاہری سامان پہ نہیں بلکہ صرف اور صرف
اللہ کی مدد ونصرت پہ منحصر ہوتی ہے۔ اِسی لئے اللہ کی مدد سے دُنیا کے غلبہ واقتدار
کی التجا ہے تاکہ اللہ کے قانونِ عدل کو جاری کیا جاسکے۔ فواحش ومعاصی کو بند
کیا جاسکے اور دنیا کے بگاڑ کو روکا جا سکے۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ
زَهُوْقًا ۝

(اور کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل تو مٹنے ہی والا ہے)

یہ اعلان اِس وقت کیا گیا جبکہ مسلمان سخت بے کسی اور مظلومی کی حالت میں تھے۔
د حضور صلعم کی جان خطرہ میں تھی، اس وقت بظاہر باطل کا غلبہ تھا اور حق کے
غلبہ کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل پرستوں نے اس اعلان پر کوئی
اہمیت نہ دی مگر حضور صلعم نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی اور چند سال بعد فاتح
کی حیثیت سے مکہ لوٹے تو کعبہ سے بتوں کو ہٹا کر باطل کو مٹا دیا۔ فتح کے دن
حضور صلعم کعبہ کے بتوں پہ ضرب لگاتے اور زبان سے فرماتے جاتے کہ:

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ
وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۸۲

(اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کر رہے ہیں کہ وہ ایمان والوں کیلئے تو شفا اور رحمت ہے مگر ظالموں کے لئے اس میں نقصان اور خسارہ کے سوا اور کچھ اضافہ نہیں ہوتا ۔)

گویا جو قرآن کو مانتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں' ان پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور عقاید و اعمال فاسدہ سے شفا ہوتی ہے ۔ قرآن ان کے لئے تمام ذہنی نفسانی' اخلاقی اور تمدنی امراض کا علاج ہے اور جو ظالم اسے رد کر کے اس کی رہنمائی سے منہ موڑ لیتے ہیں' ان کے لئے قرآن مزید خسارے کا باعث ہے ۔ جب تک قرآن سے واقف نہ تھے اس کے مطابق عمل سے معذور تھے ۔ اب واقف ہو کر انکار کر رہے ہیں تو اپنی گمراہی کے پورے ذمہ دار ہیں اور اس طرح مزید خسارے اور نقصان میں پڑ رہے ہیں۔

یہ آیات ہجرت سے پہلے ایسے وقت نازل ہوئیں جبکہ مسلمانوں پر مکہ والوں کا ظلم و جبر ایسی انتہا کو پہنچ چکا تھا جو برداشت سے باہر تھا۔ اسی مظلومی اور بے بسی کی حالت میں کامیابی کا یہ نسخہ تجویز کیا گیا کہ نماز قائم کر کے پانچوں فرض نمازیں پڑھی جائیں اور چھٹی نفل نماز تہجد بھی پڑھی جائے اور تلقین کی ہوئی دعا مانگی جائے تبھی اللہ کی نصرت آئے گی ۔ حق آئے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ چنانچہ مسلمانوں نے کفار مکہ کے ظلم وستم پر صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اپنے جذبات کو قابو میں رکھا' اپنی اصلاح و تزکیہ نفس کے لئے نمازیں قائم کیں' تلقین کی ہوئی دعائیں مانگیں اور بہت جلد کامیابی سے سرفراز ہوئے ۔

آج ہندوستان کے مسلمان بلکہ پوری دنیا کے مسلمان انہی حالات سے

دوچار ہیں۔ جو حالات ہجرت سے پہلے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی کامیابی وکامرانی کے لئے وہی عمل کریں جو اوپر کی آیتوں میں انھیں بتایا گیا تھا اور جس پر عمل کرکے وہ غلبہ وکامرانی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ نسخہ کیمیاء ہمارے ہاتھ میں ہے اور کامیابی ہمارے انتظار میں۔

ذیابطیس (شوگر) کے مریضوں کے لئے

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا

۲½ ماہ تک بلاناغہ ۳ مرتبہ صبح اور ۳ مرتبہ شام یہ آیت پڑھ کر پانی پر دم کرکے پیجئے

آدمی زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو اسے کامیابی حاصل کرنے اور ناکامی اور پریشانی سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اعمال کے احتساب سے غافل نہ ہو اور اس پر گہری نظر رکھے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے صحیح ہے یا غلط اور جو مقصد وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اس نے درست تدابیر اختیار کئے ہیں یا نہیں۔ اور جب آدمی اپنے اعمال کا احتساب کرتا رہے گا تو اسے اپنے مقصد میں ناکامی بہت کم ہوگی اور جز وقتی ناکامی بھی اس کے لیے کامیابیوں کی راہ ہموار کرے گی۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی
دہلی یونیورسٹی

اسلام

۲۱ ویں صدی میں

اکیسویں صدی دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اہل سیاست نے ہمیں بہلانے کو ایک اور کھلونا دے دیا ہے جیسے ایک مفلس ماں اپنے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کو تسلی دینے کے لئے خالی ہانڈی چولہے پر چڑھا کر کہہ دے کہ بس اب کھانا پک جائے گا تو تمہیں کھلائیں گے۔

پہلے یہ سوچئے کہ ۲۱ ویں صدی ہے کیا؟ اس کا سیدھا سا مطلب تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی ولادت کو دو ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ یہ مغربی تہذیب سے ہماری مغلوبیت کی علامت ہے کہ ہم تاریخ تہذیب سیاست، معاشرت، ہر شعبہ زندگی کو، ان کے آغاز و انجام کو مغرب کے حوالے کر چکے ہیں۔ تاریخ کو محض یاد رکھنے کے لیے کسی بڑے حادثے یا واقعے سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے کعبہ پر ابراہہ کے حملے کا سال عام الفیل کہلاتا ہے اسلام سے پہلے عام الفیل کو ایک نقطۂ آغاز سمجھ کر تاریخ کا حساب کیا جاتا تھا مثلاً یوں لکھتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت عام الفیل کے آغاز سے ۴۴ دن بعد ہوئی تھی۔ یا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ سے مدینے کو ہجرت ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ اسے نقطۂ آغاز مان کر ہجرت ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ اسے نقطہ آغاز مان کر ہجری تقویم بنالی گئی۔ بعض

مقامی حوادث بھی مرکزی نقطہ بن جاتے ہیں جیسے ایک حیدرآبادی بزرگ نے کہا کہ رود موسیٰ میں طغیانی آئی تو میں آٹھ برس کا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور بھی نہایت اہم اور دوررس نتائج پیدا کرنیوالا واقعہ ہے۔ مگر ساری دنیا کی ہر ملک اور ہر قوم کی سیاست اور معاشرت یا اس کی خوشحالی اور بدحالی اس واقعہ سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ یہ صرف وقت کو ناپنے کا ایک پیمانہ ہے۔ دنیا کے حوادث یا قلت کا کارخانہ کیلنڈر دیکھ کر نہیں چلتا۔

اب یہ دیکھیے کہ وقت یا زمان یا دہر کیا ہے؟ یہ ازل سے ابد تک ایک اکائی ہے انسان نے اپنی سہولت کے لیے اسے خانوں میں بانٹ لیا ہے اس نے دیکھا کہ دن اور رات کا تعلق سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے ہے تو رات اور دن کا تعین کر لیا اور اسے ۲۴ گھنٹوں میں بانٹ لیا۔ پھر گھنٹوں کے منٹ اور منٹوں کے سکنڈ بنا لیے۔ ورنہ اسی زمین پر وہ علاقے بھی ہیں جہاں چھ مہینے کا دن رہتا ہے چھ مہینے رات رہتی ہے۔ زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تصویریں فضا میں محفوظ رہتی ہیں۔ اگر کبھی انسان اتنی نازک اور حساس مشینیں ایجاد کر سکا کہ ان تصویروں کو اپنی گرفت میں لے آئے تو ہم سو پچاس کیا لاکھ دو لاکھ سال پہلے کی انسانی حرکات کو بھی اسکرین پر اسی طرح دیکھ سکیں گے جیسے آج ٹی وی دیکھتے ہیں۔ شریعت کی زبان میں اسی بات کو یوں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعضا ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

زمانہ کو نے ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے مگر قدیم فلسفہ بھی یہ کہتا ہے کہ حال کوئی زمانہ نہیں ہے ہر لمحہ مستقبل پر قابو پا سکتے ہیں یعنی جو کچھ ہو گیا اسے کالعدم نہیں کر سکتے اور جو ہونیوالا ہے اسے وقت مقررہ سے پہلے وجود میں نہیں لا سکتے۔

وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمہا الا ھو کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہمارے لئے ماضی اور مستقبل دونوں ہی غیب ہیں۔ مرزا غالب نے کہا تھا۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں ؟

جب ہم دو غیبوں کے درمیاں لٹکے ہوئے ہیں تو سوچئے کہ شہود کہاں ہے ؟
حقیقت کیا ہے !

یہ تو فلسفیانہ بات ہوئی اب یہ دیکھئے کہ اسلام میں وقت کا تصور کیا۔
قرآن کریم میں ایک سورۃ کا نام ہی الدھر ہے دہر زمان و مکان دونوں کا حاشر
اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

" ان کو ہم نے ہی پیدا کیا ہے اور ان کے بندھن مضبوط باندھ دیے ہیں
اور جب ہم چاہیں ان کی جگہ پر انہی جیسے دوسرے لے آئیں گے "

(الدھر۔ ۲۸)

کسی کوفلاسفر تجدد امثال کا نظریہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسری بحث
پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

" اور یہ ایّام زمانہ ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان اولتے
بدلتے رہتے ہیں " (آل عمران ۱۴۰)

پھر ایک موقع پر قدرت وضاحت سے کہا
کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ اُن سے پہلے ہم نے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک
جنہیں زمین پر اقتدار دیا تھا۔ ایسا اقتدار جو تمہیں بھی نہیں دیا۔ ہم نے آسمان سے
پر خوب بارشیں برسائیں کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہو گئیں۔ پھر ان کے گناہوں
پاداش میں انہیں ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ پر دوسری قوموں کو لا کر بٹھا دیا۔"

(سورہ الانعام ۶)

یہ اور ایسی دوسری متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو گردشِ ایام خو

زمانے کی الٹ پھیر اور نشیب و فراز سے حالات کی تشکیل نہیں ہوتی، اللہ ہی فعّال لِمَا یُرِیدُ ہے وہی موثر حقیقی ہے۔

آز مذی کی ایک حدیث میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی زمانے کو بُرا نہ کہے

کیوں کہ حقیقت میں اللہ ہی زمانہ ہے "

اس مختصر گفتگو کے بعد موضوع گفتگو پر آتا ہوں۔

"اسلام ۱۲ ویں صدی میں" یہاں یہ غور کرنا ہوگا کہ اسلام کیا ہے وہ کوئی جامد اور منجمد شے ہے یا متحرک اور تغیر پسند نظریہ ہے۔ آج کل اغیار نے اسلام پر چاروں طرف سے یلغار کر رکھی ہے یہ ایک انتقامی ذہن کام کر رہا ہے جو ذرائع ابلاغ پر قبضہ کر کے عام لوگوں کو یہ سبق پڑھا رہا ہے کہ اسلام فرسودہ مذہب ہے اس کے احکام ظالمانہ ہیں۔ یہ کچھ ملاؤں کا دین ہے وغیرہ۔ اس انتقامی کارروائی کا نام رکھا ہے بنیاد پرستی یہ نئی اصطلاحیں گھڑنے ان سے کھلواڑ کرنے اور ان میں الجھا کر عوام کو گمراہ کرنے یا جاہل بنانے کا بڑا فریب طلسم ہے۔ ہر مذہب کیا، ہر علم اور ہر فن کی ایک بنیاد ہوتی ہے اسکی پابندی اور پیروی کر کے ہی وہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے ہمارے ملک میں فن موسیقی کے بڑے تیس خاں قسم کے استاد پڑے ہوئے ہیں ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ موسیقی کی بنیاد یعنی سارےگاما پا دھانی سے کر۔ اگر وہ مٹا کر دکھا دیں۔ اگر نہیں مٹا سکتے تو اسلام پر ہی بنیاد پرستی کا لیبل کیوں لگایا جا رہا ہے، موسیقی کی مثال تو محض شرافت کو طعنہ دکھ کر دی ہے ورنہ ان الزام لگانے والوں کی مذہبی بنیاد پرستی پر بھی عمل جراحی خوب ہو سکتا ہے مگر کیا کریں۔

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اسلام کا جوہر ہے قرآن اور اس کے اغراض ہیں حدیث فقہ، تفسیر سیرت وغیرہ بنیاد بہرحال قرآن ہے وہ جس دن پہلی آیت نازل ہوئی تھی کہ :

"پڑھیے اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا ہے جس نے

انسان کو ایک لوتھڑے سے بنا دیا ہے۔"

اس دن سے آج تک وہی قرآن ہے اسکی حفاظت خود اللہ کر رہا ہے اور اس نے کہہ دیا ہے کہ نہ اس میں آگے پیچھے سے کہیں باطل گھس بیٹھ کر سکتا ہے نہ کوئی اس جیسا دوسرا لکھ سکتا ہے اسلام کا شعار کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ دنیا کا سب سے پہلا مسلمان بھی یہی الفاظ ادا کر کے حلقۂ اسلام میں شامل ہوا تھا اور دنیا کا آخری مسلمان بھی یہی شہادت دے کر مسلمان ہو سکے گا۔

اس اعتبار سے ذرہ بھر شرم کیے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہنا چاہیئے کہ اسلام سخت جامد و منجمد غیر تغیر پذیر اور اٹل مذہب ہے اس میں کسی کی مروت یا لحاظ سے کسی خوف یا لالچ سے کسی دباؤ یا مصلحت سے کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی ۱۲ ویں صدی کیا دو کروڑویں صدی اگر آئے گی تو وہ بھی اسلام کو ایسا ہی اتنا ہی پائے گی۔ اللہ اس دین کی تکمیل کر چکا ہے :

"آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا"

(سورۃ المائدہ)

تکمیل کے بعد اس میں اضافے پیدا کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی ڈاکٹر سارے ٹسٹ کرنے اور مریض اس میں اپنی طرف سے ایک دوا اور بڑھا لے۔ جو ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دواؤں کو بے اثر بنا دے کیا ایسے مریض کو آپ عقلمند سمجھیں گے یا پاگل کہیں گے۔

اس بات پر مخالف تو مطمئن ہوں گے کہ لو ہماری تائید ہو گئی۔ یہ خود کہہ رہے ہیں کہ اسلام جامد مذہب ہے یہ ٹس سے مس ہونا نہیں جانتا، ممکن ہے ہمارے

بعض مسلمان بھائیوں کو بھی یہ خیال ہضم نہ ہو سکے اس لیے اب میں اس کا دوسرا پہلو لیتا ہوں۔

اسلام ایک قوت ہے یہ ہر جمود کو توڑنے والی انقلاب پیدا کرنے والی، زندگی بخشنے والی حرکت و عمل پیدا کرنے والی قوت ہے۔ اس کی تفصیل میں جاؤں تو بات بہت طویل ہو جائے گی نہایت اختصار کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام وہ ہے جو ایک یتیم و بیسر بچے، ایک بے سہارا انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے آیا۔ ہر طرح کی تکلیف، ایذا اور قربانیوں کے باوجود زندہ رہا۔ جلاوطن کیا گیا۔

نئے شہر مدینہ منورہ کی گیارہ سال میں کایا پلٹ دی، سارے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا۔ آدھی صدی گزری تھی کہ جزیرہ نما سے نکل کر ایران اور مصر پہنچ گیا ایک صدی میں دنیا کے تین براعظموں پر چھا گیا جس نے سماج کی ہزاروں برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، ایک سو سال میں لاکھوں حافظ، قاری، محدث، مفسر، فقیہ، مورخ، جغرافیہ داں، فلسفی، منطقی، ریاضی داں، ماہر فلکیات، طبیب اور سائنس داں پیدا کر دیے ہزاروں مدرسے قائم ہو گئے صدہا کتابیں تالیف ہو گئیں، دوسری زبانوں سے علوم اخذ کر کے انہیں بھی محفوظ کر دیا۔ ایک ایسا معاشرہ بنا دیا جس میں تعلیم اور تربیت شانہ بشانہ چلتے تھے۔ ہمارے قدیم علماؔ کی زندگیوں کا خوب گہری نگاہ سے جائزہ لے لیجئے۔ ان میں سے ایسے آبرو باختہ لوگ شاید ہی ملیں۔ جیسے آج کی علمی دنیا میں بغیر ڈھونڈے مل جاتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھ لیجئے خودکشی کا کوئی واقعہ شاذ و نادر ہی مل سکے گا۔ اس کے مقابلے میں تاریخ اخلاقِ یورپ پڑھ لیجئے جہاں اجتماعی خودکشی کے سینکڑوں واقعات مل جائیں گے یا اپنے وطن عزیز کی تاریخ کا جائزہ لے لیجئے پھر یہ دیکھئے کہ پچھلے ہزار سال میں جہاں اسلامی حکومت رہی ہے وہاں کتنے فرقہ وارانہ فسادات بھی ہوئے۔

کیا اتنی بڑی اور نمایاں تبدیلیاں کسی ایسے مذہب کے ذریعے ہو سکتی تھیں جس میں روح انقلاب کا فقدان ہو جو لکیر کا فقیر بن کر جینا سکھاتا ہو، جس میں ہر ظالمانہ و جابرانہ نظام سے لڑنے کی قوت نہ ہو، جو اپنے پیروؤں کو توہمات اور خرافات کا اسیر بنانے والا ہو؟

آپ دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ کا جائزہ لے لیجئے کسی نے اتنی تھوڑی مدت میں زمین کے اتنے بڑے رقبے پر اور مختلف نسلی تہذیبی معاشرتی گروہوں پر اتنا فوری اور ایسا دیرپا اثر نہیں ڈالا جیسا آپ اسلام کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہوئے پائیں گے صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا گاندھی جی ہوں یا ڈاکٹر امبیڈکر یا ہمارے عہد کے دوسرے مفکرین اور مصلحین سب یہ کہتے رہے ہیں لکھتے رہے ہیں کہ چھوت چھات بڑا گناہ ہے سب انسان برابر ہیں سب کے حقوق برابر ہیں اس کے خلاف تو آواز کسی نے بھی نہیں اٹھائی۔ پھر قانون بھی بنا دیا گیا آپ کسی انسان سے یہ کہہ دیجئے کہ تم ذلیل نسل کے ہو، اور آپ کو پولیس پکڑ کر بند کر دے گی۔ مگر اپنے ماحول پر نگاہ ڈال کر خود سے دیکھئے، کیا واقعی چھوت چھات ختم ہو گئی؟ کیا سچ مچ سب انسان برابر ہو گئے؟ کیا ہر ایک کو اس کا حق مل گیا؟ کیا ایک برہمن کسی خاکروب کے ساتھ کھا سکتا ہے دھیان سے وہ آواز بھی سنئے جو میدان عرفات میں جبل رحمت سے آرہی ہے

ترجمہ: کسی عرب کو کسی غیر عرب پر کسی گورے کو کسی کالے پر
کوئی برتری حاصل نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی
سے بنائے گئے تھے۔ برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے؟

کیا اس اعلان کے بعد اسلامی معاشرت میں کوئی نسلی تفریق اور ایسی نفرت نظر آتی ہے جیسی آج بھی یورپ اور امریکہ میں کالے اور گورے انسانوں کے درمیان دیکھی جا سکتی ہے؟

یہ ہے اسلام کی انقلاب آفریں قوت، یہ ہے اس کا قوت و حرکت سے بھرپور اثر

اگر میں نے یہ کہا کہ اسلام ایک جامد و منجمد نظریہ ہے جو علی الاطلاق ہر زمان و مکان کے لیے یکساں ہے پھر یہ کہا کہ اس میں روح انقلاب ہے، تاثیر اور قوت ہے تو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ دیکھئے سورج غیر متحرک ہے، اپنی جگہ ثابت ہے۔ مگر سارے نظام پر اثر انداز ہو رہا ہے اس کی حرارت اور روشنی سے زندگی کی گہما گہمی اور چہل پہل قائم ہے۔ اسی کی تاثیر دانے بیج کو چھتنار درخت بناتی ہے۔ وہی پھول کھلاتی ہے، فصلیں پکاتی ہے،

باران رحمت بن کر چھا جاتی ہے اللہ نے اس کی جو ڈیوٹی مقرر کر دی ہے وہ نہایت وفاداری سے انجام دے رہا ہے اگر خود مسعود ج یں تغیر نہیں پائینگے تو کیا آپ اس کی عالمگیر تاثیر اور انقلاب آفریں قوت کے منکر ہو جائیں گے ؟

میں پھر یہ کہوں گا کہ بہت سی خرابیاں اسی لیے آگئی ہیں کہ مسلمان بنیاد پرست نہیں رہا اس لیے جو اس کی خوبی ہوتی ہے وہی طعنہ بن گئی ہے ۔ مسند احمد بن حنبل، ق ا ئی اور دارمی کی روایت ہے۔

ترجمہ : ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا : یہ اللہ کا راستہ ہے ۔ پھر اس لکیر کے دائیں بائیں جانب کچھ اور خطوط کھینچے اور فرمایا " یہ سب دوسرے راستے ہیں ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہے اور تمہیں بلاتا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو اور مختلف راستوں کے پیچھے مت بھاگو ورنہ تم راہ راست سے بھٹک جاؤ گے ۔"

وہ زمانہ جسے تاریخ اسلام میں خیر القرون کہا گیا ہے عہد رسالت تھا، پھر خلافت راشدہ کا دور آیا پھر تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ، اس وقت اسلام تاریخ تہذیب معاشرت غرض زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا اور سب کچھ اس کے زیر نگیں تھا ۔ پھر آہستہ آہستہ وہ زمانہ آ گیا کہ مختلف تہذیبیں اور معاشرتیں اسلامی سوسائٹی پر اثر انداز ہونے لگیں ۔ اب تو یہ حال ہے کہ بقول اکبر الہ آبادی ۔

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا دھرا ہے جناب قبلہ من
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولیس
ہے زبان گرم، قلب ٹھنڈا ہے

(باقی آئندہ شمارہ)

مولانا محمد ناظم ندوی سابق عمید دار العلوم ندوۃ العلوم

تقویم ناسوتی اور تقویم ملکوتی

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی

(ذیل کا مضمون حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے رفیق قدیم ادب عربی کے محقق وزبان کے اداشناس مولانا محمد ناظم صاحب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اور اور سابق شیخ الجامعہ بہاولپور و سابق اُستاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا ایک فکر انگیز مضمون ہے "تقویم ناسوتی اور تقویم ملکوتی کے درمیان کیا فرق ہے" عنوان سے ہمیں اندیشہ ہوا کہ عنوان دیکھ کر ہمارا متوسط عوامی دینی طبقہ جو اس قسم کی چیزوں کے پڑھنے سے کم دلچسپی رکھتا ہے' وہ اس دلچسپ مضمون کو نہ پڑھے جس میں زندگی کا پیغام اور ہمت و حوصلہ پیدا کرنے والی چنگاریاں موجود ہیں۔ اسلئے عنوان کے بعد جلی حرفوں میں اقبال کا شعر لکھ دیا گیا ہے جو ہر بندہ مومن کو منزل کی تلاش کی دعوت دیتا ہے ۔)

"تقویم ملکوتی" کے حساب سے کمیونزم کی روس میں مدت زندگی صرف ایک گھنٹہ ۴۸ منٹ تھی۔ مندرجہ ذیل مضمون میں اس کو قرآن کریم کی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔

اس وسیع لامتناہی و لامحدود خلاء (SPACE) میں مختلف قسم کے ایام پائے جاتے ہیں جو مختلف قسم کے طویل و طویل تر مدارات (ORBITS) پہ مختلف سیارگان کی گردشوں سے بنتے ہیں۔ کائنات میں "یوم" کا وہی تصور قائم ہوتا ہے جو

سیارہ کی گردش سے بنتا ہے اور ذی شعور انسان اسی "یوم" کو زمانہ کی اکائی قرار دیتا ہے اور سے زمانہ سمجھتا ہے۔ زمانہ کی یہ مدتیں، یعنی اکائیاں کائنات میں علیحدہ علیحدہ اور مختلف ہیں، زمانہ کے متعلق ایک زمینی تصور یعنی اہل زمین کو جس طرح نظر آتا ہے جو صبح و شام، رات دن کے آنے جانے سے انسان کے ذہن میں آتا ہے اس زمینی نظام الاوقات میں ایک دن کو ۲۴ گھنٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر گھنٹہ ۶۰ منٹ اور ہر منٹ ۶۰ سکنڈ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سات دن سے ہفتہ اور ہفتوں سے مہینہ اور ۱۲ ماہ سے سال بنتا ہے۔ ہم کرہ ارض پہ آباد انسان اسی کو زمانہ سمجھتے ہیں۔ اس نظام الاوقات یا زمینی توقیت کو میں "تقویم ناسوتی" سے تعبیر کرتا ہوں۔

اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا نظام الاوقات ہے جس کو میں تقویم ملکوتی سے تعبیر کرتا ہوں۔ یقیناً یہ دوسرا نظام الاوقات بھی اسی کائنات میں پایا جاتا ہے۔ اس دوسرے نظام الاوقات یعنی تقویم ملکوتی کے وجود پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے " وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (سورۃ الحج)۔ ترجمہ: یا تحقیق۔ ایک دن تیرے پروردگار کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ تمہارے شمار کے اعتبار سے قرآن کریم میں یوم تدبیر کا بھی ذکر ہے۔ یہ دن بھی ہمارے تقویم ناسوتی کے حساب سے ایک ہزار برس کے برابر ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ امر کا انتظام کرتا ہے۔ آسمان سے زمین تک پھر وہ عروج کرتا ہے۔ اس کی طرف ایک دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے تمہارے شمار کے اعتبار سے۔

غالباً تحقیق کائنات میں یہی دن معتبر ہے یعنی آسمان و زمین کی تخلیق کی

اللہ تعالیٰ نے کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ مدت ۶ یوم ہے۔ یعنی ۶ ہزار سال میں آسمان وزمین اور ان کی بقاء و استمرار کے وجود کے لئے " اقوات" یعنی اسباب حیات پیدا کئے ہیں۔ یعنی تخلیق کا عمل بھی تدریجی ہوا ہے کہ حکمت تخلیق کا یہی تقاضا تھا۔ قرآن کریم کی سات سورتوں میں آسمان وزمین کی تخلیق کی مدت ۶ ر دن بیان کی گئی ہے

یہ بات قابل ذکر ہے جیسا کہ میں نے اوپر اجمالاً ذکر کیا ہے' اس نیلی چھتری کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم نہیں کتنے ایام ایک دوسرے سے طویل تر پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام ایام جو زمانہ کی مختلف اکائیاں ہیں اور جو مختلف (ORBITS) مدارات پہ مختلف سیارگان یعنی مختلف متحرک پیمانوں سے بنتی ہیں انھیں زمانہ کہا جاتا ہے۔ الغرض ایک وجود ممتد اور مستمر کی جس طرح تقسیم ہوتی ہے " مدارات "کے حدود میں زمانہ کا ایک تصور پیدا ہوتا ہے اور وہاں کی ذی شعور مخلوق کے نزدیک وہی زمانہ ہوتا ہے جس طرح ہمارے نظام شمسی کے مدار پہ متحرک سیارہ سے بنے ہوئے دن رات کو زمانہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارا انسانی ذہن اسی کو ذہن سمجھتا ہے۔ زمانہ کی حقیقت کیا ہے یہ ایک بہت ہی دقیق موضوع ہے۔ اس پر میرا ایک مقالہ ہے جس کا عنوان زمان و مکان اور قرآن کریم ہے۔ اس کے مطالعہ سے مرے زیر نظر مضمون کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ لہذا ہر "مدار" پہ گردش سیارہ سے جو زمانہ کی ایک وحدت بنتی ہے۔ وہاں کی ذی شعور مخلوق کے نزدیک وہی زمانہ ہے۔ معلوم نہیں اس لامحدود اور لامتناہی خلاء میں کس قدر طویل سے طویل مدارات ہوں گے جس کا ہم اندازہ نہیں کرسکتے۔

تدبیر عالم کا (یعنی تقویم ملکوتی) کے حساب سے ایک دن ہمارے تقویم ناسوتی کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔

سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِّنَ اللهِ ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ

خمسین ألف سَنَة۔" (سورۃ المعارج)

ایک سوال کرنے والے نے سوال کیا ایک ایسے عذاب کے متعلق جو کافروں پر واقع ہونے والا ہے جس کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہے (معارج بالاخانہ) اسے اللہ کی طرف سے جس تک ملائکہ اور روح عروج کرکے جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔

پہلی دو آیتوں میں ایک ایسے دن کا ذکر ہے جو ہمارے زمینی شب و یوم کے شمار میں ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ سورہ معارج میں ایک دوسرے دن کا ذکر ہے جو ہمارے زمینی شب و یوم کے حساب سے پچاس ہزار برس کے برابر ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں ذکر کردہ دن کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اعتبار ہے اور تدبیر عالم میں بھی اسی دن کا اعتبار کیا گیا ہے جو ہمارے زمینی حساب میں یعنی تقویم ناسوتی کے اعتبار سے اس کا ایک دن ہمارے حساب سے ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ غالباً یہی تدبیر عالم والا دن تخلیق کائنات میں معتبر ہے یعنی اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں آسمان و زمین اور اس میں اسباب حیات کی تخلیق کے زمانہ کو چھ یوم سے بیان فرمایا ہے' وہ ۶ دن تدبیر عالم والا دن ہے۔ اسی طرح ۶ ہزار برس میں آسمان و زمین اور ان کے اسباب حیات کی تخلیق ہوئی ہے اور اگر سورۃ المعارج والے دن کا اعتبار کیا گیا ہے چھ دن ہمارے تین لاکھ برس کے برابر ہوں گے کیونکہ سورۃ المعارج میں ذکر کردہ ایک دن ہمارے پچاس ہزار برس کے برابر ہے۔ لیکن اس آیت میں آگے چل کر یہ آیت یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا وَ نَرٰہُ قَرِیْبًا سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم قیامت کی مدت پچاس ہزار برس کی ہوگی۔

قرآن کریم میں تین قسم کے ایام بیان ہوئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے دو مؤخرالذکر کے علاوہ کائنات یعنی خلا غیر متناہی میں متعدد مدارات پر متعدد سیارگان کی حرکت سے پیدا ہونے والے "ایام" ان سے بھی طویل تر ہوں۔ ایک دن کئی لاکھ برس کا یا کئی

کروڑ برس کا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے ۔ اس خلاء لامتناہی میں "زمانہ" کا تصور اس سے بالکل مختلف ہوگا جو تصور ہم انسانوں کو اپنے کرۂ ارضی پہ ہوتا ہے، لہٰذا زمانہ کا زمینی تصور مختلف "مدارات" پر مفقود ہوگا ۔ اور اگر وہاں کوئی ذی شعور مخلوق ہوگی تو اس کے ذہن میں زمانہ کا وہ تصور نہ ہوگا جو ہم اہل زمین کو ہے ۔ بلکہ ان کے ان کے مدارات کی طوالت کے اعتبار سے زمانہ کا تصور اور تعین ہوگا ۔ خلاء لامتناہی میں مختلف مدارات (ORBITS) پر سیارگان کی گردش سے "یوم" کی طوالت کا تصور ذی شعور مخلوق کے ذہن میں ہوگا ۔ اور چونکہ "مدارات" طول کے اعتبار سے مختلف ہوں گے ۔ لہٰذا "زمانہ" کے متعلق ذی شعور مخلوق کا تصور بھی مختلف ہوگا ۔ کہیں زمانہ کی اکائی ایک ہزار برس کی ہوگی اور کہیں دس لاکھ یا دس کروڑ یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ لامتناہی خلاء (SPACE) میں وسیع سے وسیع تر "مدارات" (ORBITS) کا امکان ہے ۔

انسان فطرۃً اور طبعاً جلد باز ہے ۔ اس کے خمیر میں جلدبازی اور عجلت و سرعت کا عنصر داخل ہے ۔ قرآن کریم کی اس آیت میں انسان کے خمیر میں سرعت و عجلت میں داخل ہونے کا واضح ذکر ہے ۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (سورۃ الانبیاء) انسان جلدباز پیدا کیا گیا ہے ۔ یعنی اس کے قوام و خمیر میں عجلت و سرعت رکھی گئی ہے ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (سورۃ الاسراء) اور انسان بڑا جلد باز ہے ۔ دوسری آیت میں بھی انسان کے جلد باز ہونے کا ذکر ہے جو اس کے خمیر کے عین مطابق ہے چوں کہ انسان کے خمیر و قوام میں عجلت و جلدبازی اور سرعت اور تیز حرکت رکھی گئی ہے ۔ لہٰذا وہ تیزی سے کام کرنے کا فطری داعیہ رکھتا ہے اور اسی فطری مزاج کی وجہ سے پاؤں پہ چلنے کے بعد تیز رفتار سواریوں پہ سوار ہو کر مسافت طے کرنے لگا ۔ گدھا، اونٹ، گھوڑا، خچر وغیرہ کو سدھا کر ان پر سواری کرنے لگا اور تیز رفتاری سے مسافت طے کرنے لگا ۔ پھر

انسان نے پہیہ کی ایجاد کی اور گدھا گاڑی، اونٹ گاڑی، گھوڑا گاڑی، یکہ، ٹمٹم، بگھی، فٹن وغیرہ جیسی تیز رفتار گاڑیاں بنا کر اُن پر سوار ہو کر مسافت طے کرنے لگا۔ پھر اسے جب زیادہ عقل آئی تو انجن ایجاد کر کے زمین پر لوہے کی پٹری بچھا کر ٹرین پر سوار ہو کر گھنٹوں میں کہیں سے کہیں جانے لگا۔ اس کی عجلت پسند طبیعت اور تیز سے تیز تر سواری کی فطری خواہش نے ٹرین کی ایجاد کے بعد موٹر کار ایجاد کی اور اس کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرتا چلا گیا اور گھنٹوں اور منٹوں میں اِدھر سے اُدھر اور دور سے دور تر مقامات میں جانے لگا۔ لیکن اس کی عجلت پسند طبیعت کہیں جا کر نہیں رُکی۔ موٹر کار کو مزید تیز رفتار بناتا رہا۔ اور ہوائی جہاز کی ایجاد کے دھن میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ء۔۱۸ء سے کچھ قبل یہ ہوائی جہاز کے ذریعہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم پر پہونچنے لگا۔ اور جنگ عظیم اول کے بعد ہوائی جہاز کی صنعت کو مسلسل ترقی دیتا گیا اور قسم قسم کے ہوائی جہاز بنا کر پوری دُنیا کو مختصر ترین کر بیٹھا اور ہفتوں اور مہینوں کے سفر کو گھنٹوں میں طے کرنے لگا۔ ایٹم کی ایجاد کی بدولت خلاء لامتناہی میں ۱۷ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑنے والا سیارہ ایجاد کر کے ایک گھنٹہ ۲۴ منٹ میں پورے کرہ ارضی کو طے کرنے لگا۔ سمندر میں سفر کو بھی اسی طرح تیز رفتار کشتیوں پھر دخانی جہازوں اور پھر مشینی جہازوں کے ذریعہ آسان کرتا گیا۔ بادبانی کشتیوں اور پتوار کے ذریعہ اس کی سست رفتار کو مشین کے ذریعہ تیز تر کرتا گیا۔ الغرض اس کی اس فطری عجلت پسندی کی بدولت یہ سمندر کے تہہ میں غوطہ لگانے لگا۔ فضاء لامتناہی میں ہوائی جہاز کے ذریعہ برق رفتاری کا اس نے مظاہرہ کیا چونکہ اس کی خمیر میں عجلت وسرعت کا عنصر داخل ہے۔ لہٰذا وہ دن رات اسی فکر میں لگا رہتا ہے۔ فون، ریڈیو، TV، ویڈیو، لاسلکی، پھر فیاکس (FAX) نے نہ صرف آواز اور تصویروں کو لاکھوں میل کی مسافت تک پہونچا دیا۔ بلکہ اب کمپیوٹروں میں انسانی تحریر کو اپنی اصل صورت وشکل میں ایک ملک سے دوسرے ملک تک بلکہ

ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہونچا دیا۔ اس کی عجلت پسند فطرت اس کو تحقیق و جستجو پر اس لئے آمادہ کرتی رہتی ہے تاکہ تیز سے تیز تر آلات اور مشینیں ایجاد کر کے جلد از جلد تمام کام انجام دے سکے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے حیران کن تیز رفتاری سے کام انجام دینے کا ریکارڈ قائم کیا۔ ایک سکنڈ کو لاکھوں اکائیوں میں تقسیم کر کے کروڑوں اربوں اشیاء کو محفوظ کرنے کا کام انجام دیا۔ اور اس طرح نہ معلوم کس قدر تیز رفتاری سے معلومات فراہم کرنے پھر اسے اپنی مرضی سے پیش کرنا اور لاکھوں بلکہ کروڑوں اور اربوں اشیاء کا ایک مجموعہ تیار کرنا اور اس سے اپنی مرضی کے مطابق اس کی عجلت پسند فطرت صرف اسی معاملہ میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ یہ چاہتا ہے کہ کم از کم مدت میں فصلیں تیار ہوں۔ کھیتوں میں اناج اور باغات میں پھل بھی کم از کم مدت میں پک کر اور تیار ہو کر اس کے تصرف میں آئیں چنانچہ اس معاملہ میں بھی وہ کامیاب ہو رہا ہے۔

یہ عجلت پسند انسان یہ بھی چاہتا ہے کہ افراد و جماعتوں کے اعمال کی جزاء وسزاء بھی جلد از جلد ہو۔ قوموں کے اجتماعی یا افراد کے انفرادی اعمال کی جزا بھی بُرے اعمال کا بُرا بدلہ یعنی سزا بھی ہر قسم کے مجرموں کو جلد ملنی چاہئیے اور اسی طرح اچھے اعمال کی جزا سے بھی یہ جلد بہرہ مند ہونا چاہتا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں کفار کی جلد بازی کا ذکر ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں اور اُمہات آیات کو ذکر نہیں کرتا' کافروں کا یہ کہنا تھا کہ اگر یہ نبی سچے ہیں' ان کا دین برحق ہے، اور ہماری صنم پرستی اور ہمارے آباء و اجداد کا دین غلط ہے تو یہ ہم پر عذاب کیوں نہیں مسلط کرتے ہیں۔ یہ فطرۃً عجلت پسند انسان زندگی کے تمام شعبوں میں عجلت و سرعت کا خواہاں ہے جو ہوشتاب ہو۔ کرہ ارضی کا مزاج چونکہ عاجلانہ ہے اور اس کا "مدار" بھی مختصر ہے' اس کے یوم کی مدت بھی مختصر ہے لہذا اس پر آباد انسان کی زندگی بھی

[illegible]

دلوں میں یہ سوال بار بار آتا ہے کہ پوری دُنیا میں شر ہی شر ہے، قتل و غارت گری، چوری، ڈکیتی، رہزنی، آبرو ریزی، بدکاری، فواحش و منکرات کا طوفان بپا ہے۔ افترا، جھوٹ، کذب، فریب دہی کا عالم میں بازار گرم ہے۔ اسے جلد از جلد کیوں نہیں مٹایا جاتا ہے۔ "کمیونزم" جیسا شر، اتنے عرصہ تک کیوں قائم رکھا گیا۔ نہ صرف انفرادی ملکیت کی نفی کی گئی بلکہ آسمانی بادشاہت کا انکار کیا گیا۔ ماوراء، طبیعات کی تکذیب و تردید کی جا رہی ہے۔ وجود باری تعالیٰ کا نہ صرف انکار بلکہ اس عقیدہ کا تمسخر و استہزا ہو رہا ہے کہ دین کو ایک فرسودہ و بے ہودہ اور انسانیت کی گدازی کے لئے بارِ گراں بلکہ طوق و سلاسل قرار دینے والا اقتصادی نظام اگرچہ یہ ایک معاشی و اقتصادی نظام تھا مگر اس کو قائم کرنے کے لئے تمام ادیان کا انکار کیا گیا۔ ان کی تعلیمات اور عقائد کو بیہودہ، فرسودہ اور خرافات قرار دیا گیا بلکہ نوع انسانی کے لئے تباہ کن کہا گیا۔ گو کہ کمیونزم کی داغ بیل مارکس نے CAPITAL نامی کتاب تالیف کرکے ڈالی تھی مگر اس کے متبع لینن اور اسٹالن وغیرہ نے اس کو نومبر ۱۹۱۷ء میں عملاً نافذ کیا۔ جنگ عظیم اول ۱۹۱۴-۱۸ء کے زمانہ میں روس میں زار کی بادشاہت کو ہٹا کر کمیونزم کے نظام معاشی کا نفاذ کیا گیا۔ کمیونزم کو اختصار کے ساتھ اگر بیان کیا جائے تو اس کی بنیاد انفرادی ملکیت کی نفی پر رکھی گئی اور یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ ملک کے تمام وسائل پیداوار زرعی کارخانہ اور دوسرے سامانِ زندگی پیدا کرنے والے تمام عوامل و اسباب بعینہٖ قوم کی ملکیت ہونی چاہئیے اور ہر فرد کا اس پر حق ہے مگر عملاً یہ ممکن نہیں ہے۔ لہذا تمام انفرادی ملکیت کو حکومت کی ملکیت قرار دے کر اور حکومت کے ذمہ دار افراد پورے ملک کے تمام وسائل پیداوار سے حاصل شدہ پیداوار کو افراد کے درمیان تقسیم کریں اور ہر فرد کی تین لازمی ضرورتیں، غذا، کپڑا، مکان کا حکومت بندوبست کرے۔ یہ ایک بڑا دلکش اور اقتصادی نظریہ تھا۔ ہر فرد کی تمام بنیادی ضرورتوں کی کفیل حکومت ہوگی

اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔ مگر اس پر عمل کرنے کے لئے جو لائحہ عمل بنانا پڑا۔ وہ بڑا پیچیدہ پریشان کن اور صبر آزما تھا۔ تاریخ عالم جب سے معلوم ہے اس میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی نفی کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس طرح وجود باری کا انسان کے ذہن سے نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا اور چونکہ ہر دین میں انسانیت کو اپنے اعمال کا جوابدہ بتایا گیا ہے اور اس کو مختار تسلیم کیا گیا ہے۔ لہذا ہر دین کے تمام افکار و خیالات اور عقیدہ کو فرسودہ، بیہودہ اور نوع انسانی کی فطرت کے خلاف قرار دینے کا عمل کمیونسٹوں کے قائدین کے لئے بڑا مشکل تھا۔ مگر انھوں نے بادشاہت کو تخت سے زمین پر اور حاکم بدھن اللہ تعالیٰ کو عرش سے فرش پر آتار نے کا دعویٰ کیا اور ماسکو کے ایک چوک میں اس قسم کا سائن بورڈ لگا کر دین کا انکار کیا گیا۔

کمیونزم رفتہ رفتہ ایک اقتصادی و معاشی نظام کی حیثیت سے ہی نہیں پیش کیا بلکہ ایک جامع ضابطہ حیات کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا۔ نہ صرف دولت کی تقسیم کا کام کیا گیا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں کمیونزم کے فکر و نظریہ کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ یہودیت، عیسائیت وغیرہ میں سوا چند عقائد کے زندگی کے تمام شعبوں کے لئے احکام نہیں ہیں لہذا کمیونزم کی اصل ضرب اسلام پر اور مسلمانوں پر پڑی، چونکہ مسلمان ایک ایسے دین سے وابستہ ہیں جو مکمل ضابطہ حیات ہے اور زندگی کا کوئی عمل اس سے خالی نہیں۔ لہذا قدم قدم پر کمیونزم کا تصادم اسلام اور مسلمانوں سے ہی اور مسلمان ہی اس کے ہدف بنے یہی اس نظام حیات کے مظالم و جور و ستم کا شکار ہوئے۔ کمیونسٹوں نے ہر دنیا خصوصاً اسلام کے خلاف ایک زہریلا لٹریچر تیار کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ مکتبوں سے لے کر کالج اور یونیورسٹی میں دین کے خلاف تدریسی مواد داخل نصاب کیا گیا۔ کمیونزم کے نظریہ کو تعلیم کا جزو قرار دیا گیا۔ اس طرح پوری نسل کو دین سے بیزار کرنے کا انتظام کیا گیا۔

سطور بالا میں اختصار کے ساتھ کمیونزم کا تعارف کرایا گیا۔ لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے غیر طبعی، مبنی بر انکار دین اللہ کے نظام کو اتنی مہلت کیوں دی گئی۔ نومبر ۱۹۱۷ء اور نومبر ۱۹۹۱ء کی درمیانی مدت کوئی ۷۴ سال کی ہوتی ہے۔ اس قدر طویل مدت تک ایسے ظالمانہ، غیر فطری نظریہ کو کیوں باقی رکھا گیا۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اس کرہ ارضی پر آباد ہم انسان جلدباز ہیں ہماری فطرت و طبیعت میں عجلت و سرعت رکھی گئی ہے۔ لہذا اس کے مطابق اعمال بد کی سزا جلد چاہتے ہیں۔ افراد ہوں یا جماعتیں، فرقے ہوں یا قومیں ہر ایک کے اجتماعی، جرائم کی ہم جلد سزا چاہتے ہیں۔ اسی طرح انفرادی نیکی اور اجتماعی کار خیر کے اجر و ثواب سے ہم جلد بہرہ مند ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نظام کے تحت یعنی تقویم ملکوتی کے تحت عالم میں بہت سے کام انجام پذیر ہوئے ہیں۔

کمیونزم کی روس میں ۷۴ سال کی زندگی کو میں نے حساب کی سہولت کی خاطر ۷۵ سال قرار دیا ہے۔ یہ مدت توقیت ملکوتی کے حساب سے صرف ایک گھنٹہ ۴۸ منٹ ہے۔ ہمارا ایک ہزار برس (تقویم ناسوتی) برابر ہے تقویم ملکوتی کے ایک دن کے برابر = گھنٹے / دن

(کمیونزم کی مدت روس میں) $\frac{75 \times 1 \times 24}{1000}$ سال = $\frac{9}{5}$ گھنٹہ

= $1\frac{4}{5} \times 60$ = ایک گھنٹہ ۴۸ منٹ تقویم ناسوتی

یعنی ہمارے زمینی حساب سے ایک ہزار سال برابر ہے تقویم ملکوتی کے ایک دن کے

($\frac{1 \times 24}{1000} \times \frac{75}{1}$ سال = $\frac{9}{5}$ گھنٹہ = $1\frac{4}{5}$)

$\frac{9}{5}$ گھنٹہ = $1\frac{4}{5}$ = یعنی ایک گھنٹہ ۴۸ منٹ

اب عالم میں نیا نظام قائم کرنے کا اعلان کیا جارہا ہے۔ جدید نظام

عالم کیا ہے ؟ ہمیں معلوم نہیں اور اکثر عالمی ماہرین سیاست کو بھی معلوم نہیں ہے ؛ جیسے کم علم لوگ صرف اس قدر جان سکے ہیں کہ عالم اسلام کو مغربی سامراج خصوصاً امر بالادستی کے تحت کمزور سے کمزور تر کرنے کا نام جدید عالمی نظام ہے۔ جس کے تحت بلاد عرب کو یہودی و اسرائیلی حکومت کے ذریعہ کنٹرول کرتا ہے اور سارے عالم اسلا کو امریکی بالادستی کے ذریعہ کمزور سے کمزور تر رکھنے کا بین الاقوامی امریکی نظام ہے۔ ا کی مرضی کے خلاف کوئی حکومت کوئی حرکت نہ کر سکے، خلیج فارس میں امریکی بحری بیڑ اس جدید نظام عالم کا ایک حصہ ہے۔

وسط ایشیائی ترک مسلمانوں کے ۶ نوزائیدہ ممالک کا وجود امریکی سامرا کی نظر میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے اور پاکستان کا معمولی سا ایٹمی منصوبہ جو پُر امن مقاصد کے لئے ہے امریکی سامراج کی نظر میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے کہ کہیں یہ کمز ملک ایٹمی انرجی کی بدولت طاقتور نہ بن جائے اور اسلامی ممالک کہیں پاکستان کے ایٹمی منصوبہ کے بدولت ایٹمی طاقت نہ بن جائیں۔ دنیا میں چین، امریکہ، فرانس، بر اور کناڈا کے علاوہ متعدد ایشیائی اور افریقی ممالک کے پاس ایٹمی انرجی کی ٹیکنالوجی مو ہے مگر امریکہ کسی دوسرے ملک کی ایٹمی منصوبہ کے خلاف کام نہیں کرتا ہے صرف پاکستان کے ننھے سے ایٹمی منصوبہ کے خلاف کام کرتا ہے۔ کیونکہ جنوبی ایشیاء میں امر ایٹمی پالیسی یہ ہے کہ پاکستان کے پاس ایٹمی انرجی کی ٹیکنالوجی نہ ہو۔ کیا ہیروشیما اور دوسرے جاپانی جزیرہ کو ایٹم بم سے کسی ایشیائی ملک نے تباہ کیا تھا ؟ یا وہ صرف امریکہ اور برطانیہ کے متحدہ فیصلہ نے ایٹم بم کے ذریعہ دونوں جاپانی جزیروں کو تبا کیا تھا ؟ آج امریکہ جنوبی ایشیا کا بڑا خیر خواہ بن کر سامنے آیا ہے۔ امریکی حکمرانوں کو معلوم ہے کہ تمام عالم اور مسلمان ممالک امریکی سامراج اور اسلام دشمنی سے واقف ہیں لیکن قوت کے نشہ نے اسکو انجام سے بے خبر رکھا ہے اور قوت کے نشہ میں مسلمانوں

یہ کی اسلام دشمنی کے علم کی کوئی پرواہ نہیں ہے، وہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو لڑانا اور
مرنا اس کے لئے آسان ہے۔ کیا عالم کا نظام امریکی حکمراں چلاتے ہیں۔ روس میں
زم کی مدتِ حکومت کس قدر تھی ؟ کیا کمیونزم کی ناکامی کا اعلان نومبر، دسمبر ۱۹۹۱ء
امریکہ نے کیا تھا ؟ یا خود روس کے کمیونسٹ حکمرانوں نے اس نظام کی ناکامی کا اعلان
کے اس کے دفتر بند کرا دئے تھے اور اس کے سائن بورڈ اُتار دئے تھے۔

اے جلدباز انسان ! اللہ تعالیٰ کی " تقویم ملکوتی " میں امریکی بالادستی
مدت بھی چند منٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار ، و
جِعُوا اِلیٰ رَبِّکُمُ الْقَهَّارِ الْجَبَّارِ ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

اے مسلمان ۔ آسمان اور زمینوں کی تدبیر کرنے والے' اللہ پر یقین
نے والا ' امریکی بالادستی کی تدبیر سے نہ گھبرا ' نہ پریشان ہو۔ تو اپنا کام کرتا
' اپنا مشن جو تجھے اللہ رب العزت کی طرف سے سونپا گیا کنتم خیر امة
رجت للناس ۔ الخ کو پیشِ نظر رکھ۔ آسمان و زمین کا مُدبّر جو تدبیر
نے والا ہے وہ تیرے لئے حوصلہ افزا ہے۔

(" تعمیرِ حیات " لکھنؤ سے ماخوذ)

ہندوستان میں اسرائیلی مسلمان

عہدِ وسطیٰ کے اسلامی لٹریچر خاص طور پر عربی اور فارسی کتابوں میں یہودیوں کا ذکر ملتا اور اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے عروج کے بعد مختلف مسلم ممالک میں اپنے کاروبار سلسلے میں آباد ہو گئے تھے۔ ہر ملک میں بیرونی تجارت اور سود پر روپیہ دینا ان کا مخصوص کاروبار مشغلہ تھا، علاوہ ازیں وہ مسلمان فرماں رواؤں کے دربار سے بھی منسلک ہو کر اہم عہدوں پر فائز تھے۔ یہودی اپنے مذہب کے بڑی سختی سے پابند رہتے تھے اور اپنے مذہبی قوانین پر جسکو شرعِ موسوی کہا جاتا تھا سختی سے عمل پیرا رہتے تھے۔ مسلمانوں سے خوشگوار روابط کے ساتھ ساتھ یورپین عیسائیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی یہودیوں کی غیر یہودی مذہب کے ماننے والوں سے اور دشمنی کی روایت بھی مشہور تھی۔ مثال کے طور پر ابوریحان البیرونی جس کو غیر مسلم تہذیب اور مذہبی روایات کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا۔ اس کی شہرۂ آفاق تالیف "الہند" اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ وہ مذہبی تعصبات سے پاک صاف تھا۔ اس تالیف میں اس نے ہندو تہذیب اور مذہبی فلسفہ کا بڑی معروضیت کے ساتھ مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی دوسری تالیف "نہایت الاماکن" میں قدیم جغرافیہ دانوں کی غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں نسلی تقسیم اور انسانی گروہوں کے مابین مذہبی ا

نسلی امتیازات کی بنا پر دشمنی تھی، لوگ علم کی خاطر دور دراز علاقوں کا سفر نہیں کرتے تھے کیونکہ موت کا خطرہ لاحق رہتا تھا، ایک مذہب کے ماننے والے اکثر دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے قتل کرنے کو ثواب کا کام تصور کرتے تھے وہ یہودیوں کی مثال دیتا ہے کہ اُن کے نزدیک اس کے یعنی البیرونی کے عہد میں بھی یہودیوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دھوکے سے غیر یہود کا قتل یا اس کا اذیت پہنچانا ضروری ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم اس تاریخی مواد کا تجزیہ پیش کر رہے ہیں۔ جو ہندوستان میں لکھے ہوئے فارسی لٹریچر میں ملتا ہے اور جس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ مسلم حکومت قائم ہونے کے بعد تجارت اور روپیہ کے کاروبار کے سلسلے میں یہودی وسط ایشیا اور عرب ملکوں سے ہندوستان آکر بس گئے تھے اگرچہ ان کو اپنے مذہب کی صداقت پر یقین کامل تھا اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے تصور کرتے تھے۔ لیکن بہت سے یہودی، مسلم صوفیا کی طرف راغب ہو جاتے تھے اور اُن کی روحانی بصیرت اور صلاحیت سے متاثر بھی ہو جاتے تھے۔ ان یہودیوں میں اکثر صوفیا کے اثر میں مشرف بہ اسلام بھی ہو گئے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں نومسلم یہودیوں کے ورثا کی خاصی تعداد ہو گئی تھی اور وہ بنی اسرائیل برادری کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔

منہاج سراج جو کہ طبقات ناصری کے مولف ہیں اور انہوں نے اپنی تالیف کو ۱۲۵۹ء میں شائع کیا تھا وہ غور اور خراسان میں یہودیوں کی تجارت کے سلسلے میں موجودگی کو ان علاقوں میں اسلام کے ابتدائی دور سے بتاتے ہیں۔ اُن کے مطابق عباسیوں کے عہد سے غور کے حکمراں یہودی تجار کے ساتھ بڑا مشفقانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اور ان کو مذہبی آزادی کے علاوہ کاروباری سہولتیں بہم پہنچاتے تھے، یقیناً غور اور خراسان میں چنگیز خاں کی فوجوں کی غارت گری کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ یہودی تجار بھی ہندوستان آنے لگے۔

دوسری اہم کتاب جو کہ تیرہویں صدی عیسوی میں ۱۲۴۰ء کے بعد شائع ہوئی اس
میں ایک یہودی لڑکے بارے میں درج ہے کہ وہ خراسان میں ایک اعلیٰ مسلم افسر شیخ محمد جوینی کا
تھا اور ان کی املاک کا انتظام کرتا تھا۔ شیخ ابو محمد جوینی کو اس سے ہمدردی تھی اور وہ
تھے کہ ان کا یہودی ملازم مسلمان ہو جائے۔ انہوں نے اس کی ترغیب کے لئے اس سے کہا کہ
اپنی جائیداد کا تہائی حصہ اس کو دے دیں گے اگر وہ اسلام قبول کر لے۔ لیکن یہودی کو اپنا
مذہب اس قدر عزیز تھا کہ وہ دنیاوی مال و دولت کے لیے اس کو قربان نہیں کر سکتا
یہ بھی لکھا گیا ہے کہ شیخ محمد جوینی اپنے معاصر شیخ ابوسعید ابوالخیر کے قائل نہیں تھے اور ان کے
طور طریقوں پر معترض رہتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ یہودی کا شیخ کی خانقاہ کے دروازے
سامنے سے گذر ہوا۔ اس وقت شیخ اپنا وعظ شروع کرنے والے تھے یکایک یہودی کے
دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ شیخ کا وعظ سنے وہ یہ بھی سوچنے لگا کہ ایک اجنبی ہونے کی وجہ
اس کو شناخت نہیں کیا جا سکے گا کہ وہ ایک غیر مسلم ہے لہذا اندر داخل ہو کر ایک ستون کی آ
میں جا بیٹھا۔ شیخ نے دوران وعظ اس کو پکارا اور کہا کہ وہ ان کے سامنے آ جائے۔ یہودی
ایک کیفیت طاری ہو گئی اور وہ شیخ کے سامنے آ گیا اس کے تمام جسم پر لرزہ طاری ت
اس حالت میں اس نے شیخ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد شیخ نے اس سے کہا
اپنے آقا ابو محمد جوینی کے پاس جائے اور اس سے شعائر اسلامی سیکھے اور اس کو یہ بھی بتا د
کہ ہر بات کے لئے ایک وقت معین ہے اور چونکہ اس نے اسلام وقت آنے پر قبول کیا ہے
لہذا اس کو ابو محمد جوینی کی تہائی جائیداد کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس واقعہ کے بعد ابو محمد جوینی
بھی شیخ کے معتقد ہو گئے۔

نومسلم یہودیوں میں شیخ ابوالبرکات (متوفی ۱۱۶۵ء) کا نام بڑی اہمیت کا حامل تھا
وہ زندگی کے آخری زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے وہ صاحب فکر آدمی تھے لہذا مسلمان بننے کے
بعد انہوں نے تصوف کو ایک فلسفہ کی شکل میں پیش کیا۔ لیکن صوفی [illegible] تاریخ میں

ے ان کا نام آتا ہے۔

ایک اور یہودی نومسلم جو کہ صوفی کی حیثیت سے مقبول ہوئے ان کا ذکر زیادہ دلچسپ ہے۔ شیخ گیسو دراز نے بتایا کہ خواجہ سالاری فرماتے تھے کہ میں ایک دن شیخ نظام الدین اولیا کے جماعت خانہ میں موجود تھا وہاں ایک گوشہ میں ایک مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ...ن خواجہ اقبال آئے اور ان سے پوچھنے لگے کہ آپ نے شیخ کو کیا بتایا ہے کہ وہ آپ سے ... کے بعد برابر رو رہے ہیں۔ اور کسی طرح ان کے آنسو نہیں رکتے مسافر نے بتایا کہ شیخ نے ان سے ... کے حالات پوچھے اور خاص طور پر معلوم کیا کہ انہوں نے خواجہ محمد بکا سے بھی نیاز حاصل کیا جو کہ ... سوداگر کے بیٹے تھے لیکن دنیا سے بے نیاز ہو کر صاحبِ طریقت ہو گئے تھے۔ مسافر نے شیخ کو بتایا کہ ... شیخ محمد بکا ایک یہودی صوفی کے اثر سے دنیا سے بے نیاز ہوئے تھے اور یہ بھی بتایا کہ جب یہودی ... اس کی بہن مسلمان ہو گئے تو یہودی نے فقر کی زندگی اختیار کر لی تھی وہ فقر اور ریاضت کی وجہ ... اپنے شہر میں بڑا مقبول ہو گیا تھا اور اہل شہر نے اس کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔ ... بکا بھی اس کے ساتھ خانقاہ میں رہنے لگے۔ ان کو ایک حجرہ مل گیا تھا۔ جب یہودی کا آخری ... ت آ پہنچا تو اس نے اپنی بہن کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ "میری بات سنو۔ میں مر رہا ہوں اور اپنے ... (یعنی یہودیت) پر ایمان کے ساتھ مر رہا ہوں۔ اس کی بہن نے یہ سنکر کہا بھائی ایسا ... ہو۔ اسی اثنا میں شیخ محمد بکا یہودی کے حجرے کے نزدیک پہنچے اور بہن اور بھائی کے درمیان ... کی آواز سنی، وہ متوجہ ہو کر سننے لگے، بہن کا یہ جملہ انہوں نے سنا" اے بدبخت ایسا جملہ مت کہو ... لیکن یہودی نے بہن کی بات نہیں مانی اور مر گیا، جب شیخ نظام الدین اولیاؒ نے یہ سنا تو رونے ... لگے کہ زندگی میں آخری اہم ہے اگر یہ بخیر تمام نہیں ہوتا تو زندگی بھر کا تقویٰ ریاضت اور ... بیکار ہو جاتا ہے اور آخرت خراب ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں پندرھویں صدی عیسوی کے عظیم ماہر صوفی شیخ بدیع الدین شاہ مدار ... یہودی تھے۔ ان کے سوانح نگار شاہ مدار کے خلیفہ قاضی محمود کنتوری کے رسالہ ایمان ...

محمود ی (مفقود ہے) کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ وہ انبیاؑ کی اولاد میں سے تھے، ان کے باپ یہودی تھے اور ان کا نام ابو اسحاق شامی تھا، ملک شام کے رہنے والے تھے وہ بڑے مذہبی تھے اور مذہب کے قوانین کے سختی سے پابند تھے جب ان کے بیٹے پیدا ہوئے تو ان کا نام بدیع الدین رکھا یہ زمانہ چودھویں صدی عیسوی کا نصف آخر تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت توریت اور دوسری مذہبی کتابوں سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے علوم کی تحصیل کی والدین کے انتقال کے بعد ان کو اسلام کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ وہ خاص طور پر سیرت نبی کریمؐ اور قرآن پاک سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ مکہ معظمہ گئے وہاں احادیث کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد فقہ اسلامی خصوصاً مذہب امام ابوحنیفہ اور مذہب امام شافعی سے واقفیت حاصل کی، مکہ سے مدینے گئے وہاں مسجد نبوی روضۂ مطہرہ کی زیارت سے فیضیاب ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد بغداد اور دوسرے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔ گجرات سے اجمیر آئے وہاں معین الدین کی درگاہ کی زیارت کے بعد کچھ عرصہ کالپی میں آکر قیام کیا۔ کالپی کے سلطان کے ناراض ہونے کے بعد جون پور آ گئے۔ کیونکہ شاہ مدار جمعہ کی نماز کے لیے مسجد نہیں جاتے تھے جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے جونپور کے قاضی القضاۃ اور عالم دین شہاب الدین دولت آبادی نے سلطان ابراہیم شرقی (متوفی ۱۴۴۰ء) سے کہا کہ بدیع الدین الملقب بہ شاہ مدار جیسے مشہور اور مقبول بزرگ جمعہ کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے مسجد نہ آئیں گے تو عوام اور خواص دونوں پر بُرا اثر پڑے گا، لہٰذا سلطان نے ان کو پیغام بھیجا کہ ان جیسے کے لیے ضروری ہے کہ جمعہ کی نماز باجماعت پڑھیں۔ شاہ مدار نے جواب بھجوا دیا کہ وہ مسافر ہیں لہٰذا جمعہ کی نماز ان پر فرض نہیں ہے اس پر سلطان نے کہا کہ مسافر کے رہنے کی بھی ایک مدت ہے، اس کے بعد شاہ مدار قنوج کے نزدیک ایک گاؤں مکن پور چلے گئے، وہاں خانقاہ بن گئی کہ وہاں جانے سے ان کی شہرت سے متاثر ہو کر لوگ دور دراز علاقوں سے ان کی زیارت آتے تھے، وہ ہفتہ میں صرف ایک بار لوگوں کے سامنے باہر آتے تھے اپنے چہرہ پر نقاب

رکھتے تھے، جب لوگوں کے اژدحام کے سامنے آتے تو نقاب اٹھاتے تھے اس پر سب لوگ ان کے چہرہ کی تابناکی دیکھ کر سربسجود ہو جاتے تھے درگاہ زیارت خاص و عام ہے۔

ہمارے ماخذوں سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت کے دور میں بنی اسرائیل نسل کے مسلمانوں کی تعداد کافی ہو گئی تھی اور ان کی علیحدہ برادری بنی اسرائیلان کے نام سے موسوم تھی، اس برادری سے متعلق عالم اور سائنسداں بھی تھے، مثال کے طور پر خواجہ اویس گوالیری بنی اسرائیلان برادری سے تعلق رکھتے تھے، عربی زبان اور علوم اسلامی کے فاضل ہونے کے علاوہ علم ہیئت، علم نجوم اور علم رمل کے بھی ماہر تصور کیے جاتے تھے لودی سلاطین کے عہد سے ہمایوں بادشاہ کے دربار سے ایک سائنس داں کی حیثیت سے متعلق رہے، چونکہ ہمایوں بادشاہ کو علم ہیئت اور نجوم سے دلچسپی تھی لہذا وہ خواجہ اویس کی بڑی قدر کرتا تھا۔

سترھویں صدی کے مشہور مجذوب صوفی سرمد بھی ایران کے ایک یہودی گھر میں پیدا ہوئے تھے ان کو اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کی روایات کا بھی وافر علم تھا، جوانی ہی میں اسلام قبول کرنے کے بعد تصوف کی طرف مائل ہوئے اور ہندوستان آ گئے اورنگ زیب کے عہد میں برہنہ رہنے کے الزام میں شہید ہوئے۔ مولانا ابوالکلام کا سرمد پر مقالہ قابل توجہ ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہمارے ہندوستانی ماخذوں سے جس بات کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نسل کے لوگ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اسلام کے سچے پیرو رہے چونکہ مسلمان ہونے سے پہلے وہ اپنی شریعت کی شوق سے پابندی کرتے تھے لہذا اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کے بعد وہ اسلامی شریعت پر بھی اسی شوق کے ساتھ عمل پیرا ہوئے، علم اور روحانیت میں ان کا تاریخی رول بڑی اہمیت کا حامل رہا۔

محمد جعفر
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد

دبستانِ گولکنڈہ کے نعت گو شعراء

شاعری قلب کے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا نام ہے۔ یہ کام خونِ جگر کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور نعت پاک مصطفےٰؐ کہنا دل کی عبادت ہے۔ یہ کام روح کی پاکیزگی اور حب رسول صلعم کی مہک کے بغیر مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ نعت کا موضوع جتنا اہم بالشان ہے۔ اس لئے نعت شریف کہتے وقت سردار دو عالم صلعم کی عظمت و تقدس اور مقام و مرتبہ کو خاص طور سے قلب و ذہن میں لے مدحتِ رسولؐ تمام تر احترام و احتیاط کے ساتھ ادا کرنا "پل صراط پر چلنا" ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس ذات و اعلیٰ صفات کا مداح خلاقِ عالم ہو ایسے عظیم المرتبہ محبوبِ رب العالمین صلعم کی توصیف و ثناء کا حق ادا کرنا بندے کے لیے محال ہے "عودِ ہندی" میں جمتاز علی خاں لکھتے ہیں۔

"بندے سے خدا کی تعریف ہو کیا مجال ہے۔ زبانِ مخلوق حمد خالق کر سکے وہم و خیال ہے۔ نعت کا رتبہ حمد سے کم نہیں جس ممدوح کا پروردگار مداح ہو اُس کی مداح کا لائق ہم نہیں ہے"

اِس صنف میں ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ عقیدت کے پھول بارگاہ مصطفےٰ صلعم میں اشعار کی شکل میں پیش کیے ہیں۔ مگر دکنی شاعری کے خمیر میں نعت ایک عنصر خاص رہا ہے۔ قدیم دکنی شعراء چاہے کسی صنفِ سخن میں اپنی تخلیق پیش کی ہو اُن کا وطیرہ رہا ہے کہ اپنی تخلیق کی ابتداء میں حمد باری تعالیٰ اور نعت شریف بھی کہی ہے۔ مثلاً مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں نظامی نے نعت پاک لکھی ہے

تا کہ "سب رس" میں وجہی نے نعت کا مضمون نثر میں ادا کیا ہے ۔ اس تمام تفصیل سے گریز کرتے ہوئے راقم الحروف نے اس مضمون میں صرف "دلستان گولکنڈہ" کے چند خاص شعراء کی لکھی ہوئی نعتوں کا تذکرہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بانی شہر فرخندہ بنیاد سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم کلیات میں چھ۶ نعتیں موجود ہیں۔ نعت شریف کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہو

"چاند سورج روشنی پایا تمہارے نور تھے
آب کوثر کوں شرف تعلی کے پانی پور تھے
دل پرم جینے تھے دیتا گل صبا بوے وصال
کیا رضا ہے ہنج کوں آون یا آون دور تھے
تج تین کی شاب تھے کہ طور جل سرمہ ہوا
کیوں کر باندھے بچار اول تمہارے گھور تھے
مکھ تجلی دیکھیا بیداری یا سپنے منے
نیر تپہ کا ہنج ہلا تیکر اُدھر سمدور تھے"

اب اور نعت کے چند اشعار دیکھئے۔

یا بندہ کوں حق نبی کا خطاب	حکم دے دیا نور جوں ماہتاب
نانوں لے کر کسی تھے نہ ڈر	توں رسی نمن دے دندیاں کو سو لتاب
صدقے ہے ترکان داس را امام	ہوا دو جگت سوال و جواب

احمد گجراتی کو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ مدعو کیا تھا۔ احمد گجراتی کی مثنوی "یوسف زلیخا" دلستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ہے اس مثنوی میں نعت کا مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

"محمد جو رسول اللہ ہے وہ ؛ رسولاں ابنیاں کا شاہ ہے وہ
وہ ہے راجا دھوں جگ لشکر اس کا چلے فرماں سارے جگ پر اس کا
جو اسکی چھاؤں تل ہے عرش کا ٹھاون سو دھرتی پڑے کس ڈھلت و چھاون
خدا بن اس نہ دوجا کوئی ساتھی خدا اور ان یکس کے یک ساتی
وجود اس کا سبب عالم کوں رحمت جگت سرجیا اس راکھ محبت
جیو احمد جیو سول اس کا بندہ ہے درود اس کا سدا اسکوں دھندا ہے"

وجہی نے بھی نعت کا مضمون اپنی مثنوی کی ابتداء میں ادا کیا ہے اور خوب ادا کیا ہے۔

احمد جنیدی نعت کا مضمون بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سردار دو عالم صلعم دو جہاں کے رہنما اور تاج دار پیغمبراں ہیں اور "شہ دین کی سروری سروراں" ہیں۔ اشعار دیکھئے۔

"الٰہی نپایا توں آخر زماں کہ ہے مصطفیٰ دو جہاں رہ نما
محمد نبی تاج پیغمبراں ؛ شہ دین کی سروری سروراں
کہ سچ ہے تو پیغمبر آخر زماں دیکھا ہم کوں معجزا جو ہے نہاں"

عہد عبداللہ قطب شاہ کا ملک الشعراء غواصی نعت شریف اس خلوص وا حترام کے ساتھ کہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے الفاظ نہیں ہیں بلکہ غواصی گویا ہے۔

"سچا توں محمد سچا مصطفےٰ سچا ہے توں احمد سچا مرتضےٰ
توں طٰہٰ توں یٰسین توں البطحیٰ توں امی توں مکی تو مرسل ماہی
توں اول توں آخر توں ہی ہے امیر توں ظاہر توں باطن نبی بے نظیر
تمیں ہاشمی ہور قریشی رسول کیچ توں کہے سو کرے رب قبول"

ایک اور نعت میں غواصی خود کو احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلعم کا غلام ہونے پر

فخر و احتشام محسوس کرتا ہے۔ اشعار دیکھئے۔

"بڑے بخت ہو ہیں غواصی غلام ہوں ایسے نبیؐ کا علیہ اسلام
سدا پاتی سکو ہیں اُسے یاد کر ہزاراں درود اس کی اولاد پر"

مثنوی "پنچھی باچھا" وجدی کی تصنیف ہے۔ جس میں پرندوں کی زبانی کہانی بیان ہوئی ہے۔ اور کہانی میں تصوف کے رموز بیان کئے گئے ہیں۔ وجدی کی نعت شریف کی خصوصیت یہ ہے کہ نعت کا مضمون ادا کرتے ہوئے اس نے پرندوں ہی کی منقار مستعار لی ہے ملاحظہ ہو۔

"اے مرے پیارے پنچھی جیو کے سجن بول بیٹھے لب سوں کچھ میٹھے بچن
اے شکر گفتار راوی بات کر بات ہر یک جملا میٹھی نابات کر
نعت سوں احمدؐ کی کھول اپنی زبان جو ہے وہ سیمرغ قاف لامکاں
وہ بلبل گلزار فردوس بریں طوطی شیریں زباں طوطی نشیں
وہ رسولؐ ہاشمی محبوب رب سرور ملک عجم فخر عرب
صاحب معراج تاج آصفیہ رہنمائے انبیا ہور اولیا
آفتاب شرع و شمع بزم دین نور عالم رحمت اللعالمین"

فائز دکنی دبستان گولکنڈہ "کا آخری شاعر ہے جو سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں گزرا ہے۔ لیکن۔ لیکن فائز دربار سے منسلک نہیں تھا۔

فائز نے نعت شریف میں یہ مضمون بیان کیا ہے کہ یوں تو کئی ہزار پیغمبر علیہ دنیا میں تشریف لے آئے لیکن ہر ایک کی یہی تمنا و خواہش تھی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش ہم اُمت محمدیؐ میں ہوتے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

باقی صـ ۴۳

ماضی کی شاندار ادبی محفلیں

حیدرآبادی تہذیب ایک طویل دکنی تہذیبی سلسلہ کا نتیجہ ہے۔ اس تہذیب میں ساکیتہ کا فنونِ لطیفہ، قطب شاہی رواداری، عوامی احساسات کا پاس و لحاظ، آصفی دور کا رکھ رکھاؤ اور حفظِ مراتب کا دخل رہا ہے۔ آج دہلی میں دہلویت نہیں ملتی لکھنوی زبان اور تہذیب "فسانۂ آزاد" میں مقید ہے لیکن حیدرآبادی تہذیب گذشتہ عظیم انقلابات کے باوجود آج بھی قائم ہے، اور اپنی خاص تہذیبی شناخت رکھتی ہے۔

ہر طریق حکومت میں کچھ محاسن اور کچھ عیب ضرور ہوتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام میں بھی کچھ محاسن ہے۔ ایک وضعداری تھی۔ خاطر تواضع، مدارات کی عادتیں ورثہ میں ملی تھیں۔ سرکاری دربار، محفل رقص و سرود، جشن سالگرہ یا ادبی تقاریب جیسے مشاعرہ، قوال، مجلس غم و ماتم عید و تہوار، ہر موقعہ پر نشست و برخواست کے خاص طریقے تھے اور ان طریقوں کی پابندی امیر و غریب، آقا اور غلام، سرمایہ دار اور درویش سب پر لازم تھی۔ شاہی دربار، محفل رقص و سرود و مجلس ماتم کے موقعہ پر شرکت کے لئے لباس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح مہمان کے استقبال و رخصت کے موقع پر صاحب خانہ ضروری مراسم کا خیال رکھتے تھے۔ تقاریب جشن میں صاحب نگر یا دیوڑھی کے صدر دروازہ پر خود بہ نفس نفیس موجود رہتا تھا۔ مہمان کا خلوص دل سے

کرتا خیریت دریافت کرتا اور محفل میں مہمان کے رتبہ اور حیثیت کے مطابق اُسے خاص نشست پر بیٹھنے کی درخواست کرتا۔ اگر صاحب خانہ عمر رسیدہ ہو یا بیمار ہو تو استقبال کی ذمہ داری خاندان کے دوسرے بزرگ رکن پر رہتی۔ ایسی تقاریب کے اختتام کے بعد جب مہمان رخصت چاہتا تو میزبان یعنی صاحب خانہ مہمان کے ساتھ صدر دروازہ تک آتا۔ اُسے پان، پھول اور عطر پیش کرتا اور پھر ملنے کا وعدہ لیتا۔ بعض وقت مہمان کو عطر کی چھوٹی شیشی پیش کی جاتی اور بعض وقت اپنے خلوص کے اظہار کے لئے صاحب خانہ دو، چار یا پانچ عطر کی شیشیاں مہمان کو پیش کرتا۔

نقل غم یا پرسہ کے موقع پر استقبال اور رخصت کے ان طریقوں کی پابندی لازم نہیں تھی۔ مہمان صاحب خانہ کے مکان پر چلا آتا۔ صاحب خانہ لب فرش تک آتا اور مہمان کو ساتھ لیکر دیوان خانہ میں آتا۔ مراسم پرسہ کے بعد مہمان رخصت ہوتا تو پان، پھول اور عطر کی بجائے صرف سکھ کلھ پیش کی جاتی تھی، اور صاحب خانہ صدر دروازہ کی بجائے صرف لب فرش تک آکر ان کو رخصت کرتا۔

اُس زمانہ میں ادبی اداروں اور ادبی مراکز کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ بڑے رئیس اور جاگیردار اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے اپنے ہم خیال احباب کو جمع کرلیا کرتے تھے۔ بڑے شاعر ان امیروں اور جاگیرداروں سے منسلک ہوجاتے تھے اور باضابطہ ماہانہ تنخواہ بھی حاصل کرتے تھے۔ داغ دہلوی، نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کے اُستاد بھی تھے اور مصاحب بھی۔ نواب میر محبوب علی خاں کے ساتھ شکار پارٹی میں شریک رہا کرتے تھے۔ اگر شکار گاہ میں مشاعرہ ہوتا تو وہ شرکت فرماتے یا دوران شکار سرکار، کوئی غزل مکمل کرتے تو وہ شکار گاہ میں اس غزل کی مناسب ترمیم کردیتے تھے۔ اسی طرح لکھنؤ کے مشہور نثر نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار، مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت کے دربار سے منسلک رہے۔ مہاراجہ کی اکثر تصانیف دبدبہ آصفی اور رسالہ محبوب الکلام سرشار کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ مہاراجہ نے شاد کے چھپنی خانے میں مطبع محبوبیہ قائم کیا تھا جس کے نگران پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔

ادبی سرگرمیوں میں کتابوں کی اشاعت، مشاعرہ، میلادالنبی اور جشن اشیمی پر خصوصی تقاریب کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ رئیس جاگیردار اپنے کلام کے مجموعے شائع کرتے لیکن کتب اجرا کے موجودہ طریقہ سے وہ واقف نہ تھے۔ بعض وقت یا رئیس اور جاگیردار اپنے چہیتے کا کلام اپنے خرچ پر شائع کرتے اور یہ ادبی تحقیقات، صاحب ذوق احباب کو بطور نذر دے دی جاتی۔ کتاب خرید کر پڑھنے کا طریقہ نہ جب تھا اور نہ آج ہے۔

محفل مشاعرہ کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ بڑی ڈیوڑھیوں کے دیوان خانوں میں مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ دیوان خانے میں تین حصوں یعنی حصوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ یعنی خاص اس کے آگے در دیوان خانہ اور اس کے آگے پیش دیوان خانہ۔ ان تین دیوان خانوں کی تقسیم اونچے ستونوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ دیوان خانوں کی چھت پر چاندنی کھینچی جاتی تھی جس پر خوبصورت مناظر، پھول اور پتے ابھارے جاتے تھے۔ اس کی چھت پر سفید، سرخ اور سبز رنگ کے آویزاں کئے جاتے تھے۔ فرش پر جا بجا فانوس کے جھاڑ رکھے جاتے تھے۔ دیواروں اور ستونوں پر گیریاں لگائے جاتے تھے۔ دیوان خانہ کی دیواروں میں مختلف شکل کے محراب اور چونے کے بنائے جاتے تھے۔ محرابوں میں بلوری راحیاں اور گلدستے رکھے جاتے تھے۔ اگر دیوار میں کہیں مل جائے تو خوبصورت طغرے نفیس فریم میں لگائے جاتے تھے۔ دیوان خانہ کے مقابل لامبا حوض ہوتا تھا جس میں فوارے بھی ہوتے تھے۔ حوض کے اطراف روشنی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ سچ ہے کہ سیرت و کردار کی ہر بیل دیوان خانوں میں ڈھلتی تھیں۔

دیوان خانوں میں سطرنجی تو بچھائی جاتی تھی لیکن سفید چاندنی کا فرش بچھا کے اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کہیں داغ یا شکن نظر نہ آئے۔ اچھا فرش مزاج کی نفاست کا اظہار تھا۔ دیوار سے گاؤ تکیہ اور شہ نشینی پر قالین کا فرش ہوتا تھا۔

شعرا کی فہرست بہ لحاظ تخلص (ابجد واری) مرتب ہوتی تھی۔ اگر فارسی گو تو انہیں پہلے کلام سنانے کی زحمت دی جاتی تھی۔ صدر مشاعرہ سے پہلے، اساتذہ کلام

ہلڑ بازی کا طریقہ جب رائج نہ تھا۔ اچھے شعر پر دل کھول کر اور مناسب طریقہ پر داد دی جاتی۔ معمولی اشعار پر خاموشی اختیار کی جاتی۔ اگر شعر معیار سے گر رہا ہو تو حاضرین مصرعہ اٹھاتے تھے جس سے شاعر سمجھ لیتا کہ وہ شعر مزید تصحیح کا طالب ہے اور اس شعر کو کرر نہ پڑھتا۔ تبدیلیٔ ذائقہ کے لیے ایک دو مزاح گو شعرا کو سن لیا جاتا معتمد مشاعرہ کی نشست لب فرش سے قریب ہوتی اور وہی مشاعرہ کا ناظم ہوا کرتا تھا دوران مشاعرہ سگریٹ نوشی کی جسارت کوئی نہ کرتا۔ البتہ اگر مشاعرہ طویل ہو جاتا تو درمیان میں کچھ دیر کے لیے وقفہ ہوتا اور اہل محفل کو مشروبات یعنی لیمو اور کیری کا شربت پیش کیا جاتا تھا۔ چائے بھی پیش کی جاتی تھی۔ آج کل کے مشروبات سے ان دنوں کوئی واقف نہ تھا۔

غرض یہ ان ادبی محفلوں کا ایک مختصر تذکرہ ہے جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک حیدرآباد میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔

" بنیاں جو سنے اس امت کا صفت　　بسر جا اپس کا قرب منزلت !
کہے کاشش ہوتے یو امت ہمیں　　یو سن کر بکڑتے تھے ہمت ہمیں
نہ کر ہم کو محروم تو یا نبیؐ　　بدو نیک تیرے امی امت سبھی
سگل انبیاں کا ہے سرتاج توں　　چلیا محرمیت سوں معراج کوں
ہوا دین روشن نبوت ستی　　مشایخ کوں سارا ولایت ستی "

انسانی صلاحیتیں اس قابل نہیں ہیں کہ وہ مدحتِ رسول صلعم بیان کر سکیں۔ مگر انسانِ مجبور عقیدت مندی کے ساتھ نعت شریف کہتا ہے اور اسی بہانے یہ بندۂ پُر عیب نعت پاک کا سہارا لیکر اپنی بخشش کا سامان کرتا ہے اور یہی سب کچھ " دبستان گولکنڈہ " کے شعرا نے بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ

انسانی حقوق پر

ہندوستان کا ایقان

ہندوستان کا انسانی حقوق سے متعلق اٹوٹ ایقان اس کا قدیم ورثہ ہے۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان نے ایک آزادانہ سماج، جمہوری سیاست، فرد کی عظمت قانون کی حکمرانی اور کثیر جماعتی نظام کے ذریعہ اس عہد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان واضح طور پر اپنے اس ایقان کا اظہار کر چکا ہے کہ جمہوریت انسانی حقوق کی حفاظت کی بہترین ضامن ہے اور اس کے ذریعہ ترقی کے لئے ایک موزوں سیاسی چوکھٹا فراہم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی طرح کے غریب ممالک میں غربت جیسی قدیم لعنت بیماریوں اور جہالت پر فتح پانے کے لئے بڑے پیمانے پر ایک سماجی اور معاشی انقلاب کی ضرورت ہے۔ لیکن ہندوستان کا یہ احساس ہے کہ ان بنیادی تبدیلیوں کا انحصار عوام کی رضا و رغبت کے ذریعہ ہونا چاہیئے جو کہ جمہوریت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

جمہوریت کی ترقی کے لئے مساوی اشتراک اور اس کے فواید کی مساوی تقسیم کو بھی مستحکم کرتی ہے جس کے نتیجہ میں پائیدار اور منصفانہ ترقی حاصل ہوتی ہے۔ نیز سماجی اور معاشی اختلافات کے پُر امن حل کے لئے صبر و تحمل کی فضاء پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ جمہوریت کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔

ہندوستان نے پارلیمانی نظام، مقامی، ریاستی اور مرکزی سطح پر منصفانہ انتخابات کو اپنانے کا فیصلہ کیا جس کے ذریعہ ایک ایسا طریقہ کار کی بنیاد ڈالی جس سے عوامی رائے کی بنیاد پر حکومتوں کا پُر امن انتخاب ہو سکا۔ اس طریقہ کار کو کئی مرتبہ آزمایا گیا جس سے اس کی افادیت ثابت ہوئی۔ ہندوستان کا آزادانہ عدالتی نظام عوامی حقوق کا پاسبان اور ان حقوق کی حفاظت کے لئے پوری تندہی سے کام کرتا ہے۔ آزاد اور متحرک صحافت، قومی عوامی رائے، با اثر غیر سرکاری تنظیمیں اور اس سے بڑھ کر قانون کی حکمرانی ہندوستان کے جمہوری نظام اور اس کے قانون کی مدافعت کرتے ہیں۔

دستور ہند جسے ۱۹۵۰ء کے دوران لاگو کیا گیا قوم کے انسانی حقوق اور آزادی کا نقیب ہے اور تمام شہریوں کو اس کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ دستوری مد پر عطا کئے گئے بنیادی حقوق کے استحکام کے لئے قوانین بھی موجود ہیں۔ ان حقوق کے پیش نظر کہ سماجی کوتاہیوں کے باعث تمام شہری بغیر کسی اعانت کے اپنے حقوق کا حفاظت نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے دستور ہند مثبت اور امتیازی اقدامات فراہم کرتا ہے۔ قانون ساز اداروں اور عوامی خدمات میں سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ طبقات کی نمائندگیوں کو یقینی بنانے کے لئے دستوری تحفظات فراہم کئے گئے ہیں۔

برسہا برس سے قوم نے اقلیتوں اور سماج کے کمزور طبقات میں بیداری پیدا کرنے، ان کی فلاح و بہبود اور انصاف کو یقینی بنانے کے لئے مخصوص کمیشن اور ادارے قائم کئے۔ مساوات اور تمام مذاہب کے افراد کی عزت نہ صرف دستور ہند کا حصہ ہیں بلکہ یہ ان اقدار کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

دستور تمام شہریوں کو اپنے اپنے مذہب کو قبول کرنے اور اس پر چلنے اور اس کی تبلیغ کا حق بھی عطا کرتا ہے۔ شہریوں کا کوئی بھی طبقہ اپنی ثقافت، زبان اور رسم الخط کو برقرار اور اسے فروغ دے سکتا ہے۔ مختلف اقوام کے رسم و رواج،

پرسنل لاس اور ان کے عقاید کی برقراری کی ضمانت دیتا ہے جبکہ دیگر ممالک کے دستور اس سے عاری ہیں۔

جمہوریت پُر امن احتجاج اور سیاسی اختلاف رائے کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ کسی حد تک یہ ایک عقلمندانہ علامت ہے اور ترقی کی راہ میں حائل اور غلط اُمور کا بروقت سدباب کرتے ہیں لیکن چند تفرقہ گر عناصر نسلی اور مذہبی اُمور میں اختلافات کے حل کیلئے بات چیت، بحث مباحث جیسے پُر امن طریقوں کے بجائے طاقت کے ذریعہ اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک کثیر المذاہب جمہوریت قانون کی بالادستی سے تقویت حاصل کرتی ہے۔

آمرانہ اور بے باکانہ عوامل کے خلاف موثر اور مدافعانہ اقدامات قانون کی بالادستی اور انسانی وقار کے ذریعہ ہونی چاہیئے لیکن دہشت پسند مقصد فرد اور حکومت دونوں کے خلاف سوچے سمجھے تشدد کے ذریعہ قانون کو تہس نہس کرنا ہوتا ہے۔

ایسی دہشت پسندی جو مذہبی اختلافات پیدا کرتی ہے۔ اس کی حد تک بہت خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوتی ہے جب وہ علاقائی عدم استحکام اور جمہوری حکومت کے سیکولر تانے بانوں کو تباہ کرنے کے لئے غیر ملکی تائید حاصل کرتی ہے۔

یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ چند مفاد پرست جماعتوں کی جانب سے آج کل انسانی حقوق اور حق خود اریت کے اُصولوں کا بڑے پیمانہ پر غلط استعمال کیا جارہا ہے تاکہ ہندوستان کی وحدت اس کے سیاسی و علاقائی استحکام کو متاثر کیا جاسکے۔ حق خوداریت کے تئیں ہندوستان کا عہد کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہندوستان نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف تاریخی جدوجہد کی ہے۔ یقیناً یہ نظریہ آزاد حکومتوں کے خلاف علحدگی اور انتشار کی حمایت نہیں کرتا۔ اقوام متحدہ اور

کی عالمی کانفرنس کے ویانا عہدنامہ نے واضح طور پر اسے قبول کیا۔

ہندوستان کے چند علاقوں میں زبردست دہشت پسندی دیکھی جا رہی ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بیرونی ممالک کی تائید سے علاقائی مفادات اور ہندوستان کے مشترکہ معاشرتی نظام کو تباہ کرنے کے لئے تشدد کو ہوا دی جا رہی ہے ہزاروں انسانی جانوں کے اتلاف کے عوض بڑی سفاکی کے ساتھ اس مقصد کو حاصل کیا جا رہا ہے۔ چار سال سے زاید عرصہ کے دوران سات ہزار انسانی جانوں کا اتلاف ہوا۔ دہشت پسندوں سے اس قدر عصری ہتھیار برآمد ہوا ہے جس سے باقاعدہ فوج کے چار ڈیویژنوں کو بہ آسانی مسلح کیا جا سکتا ہے۔

پُر امن شہریوں میں دہشت پسندوں کی جانب سے کئے جانے والے ظلم و ستم کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۳ لاکھ ہندوستانی شہری جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اپنے گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کے دیگر علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ہی وطن میں مہاجر بن گئے۔

قوم کو اس بات کا احساس ہے کہ قانون لاگو کرنے والے حکام کی جانب سے خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں دہشت گردی کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے۔ کچھ زیادتیاں ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان ان زیادتیوں کو پوشیدہ رکھنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ تاہم وہ انسانی حقوق سے اپنی اٹوٹ وابستگی کا اعلان کرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک قانونی نظام' ایک تدارکی فریم ورک اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا دینے کی قومی روایت بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند انسانی حقوق کی مزید حفاظت اور ضمانت کے لئے مسلسل کوشاں ہے جس کی تصدیق حال ہی میں قائم شدہ اعلیٰ اختیاری انسانی حقوق کمیشن سے ہوتی ہے۔

ہندوستان کا احساس ہے کہ انسانی حقوق کی تحریک کو نہ ہی سیاسی

بنایا جائے اور نہ ہی اسے کثیر الجہت جمہوری سماج کے لئے مسائل پیدا کرے۔ آلہ بنایا جائے۔ ہندوستان، خواتین اور بچوں کے حقوق کے تحفظ اور فروغ کو خاص طور پر اہمیت دیتا ہے۔ یہ شعبے خصوصی توجہ اور ترجیح کے مستحق ہیں۔

انسانی حقوق سے متعلق عالمی کانفرنس نے ترقی کے حق کو عالمی طور پر بنیادی انسانی حقوق کا جزو لا ینفک ہونے کا اعادہ کیا ہے۔ ہندوستان آجکل ترقی کی رفتار میں سرعت پیدا کرنے غربت کے خاتمے اور انسان کی بنیادی ضروریات کی موثر تکمیل کی غرض سے ایک عظیم سماجی اور اصلاحی پروگرام میں مصروف ہے۔ تاکہ اپنی معیشت کو عالمی معیشت سے مربوط کر سکے۔ ہندوستان اس پروگرام کی کامیاب عمل آوری کے لئے داخلی استحکام اور سماجی ہم آہنگی کا خواہاں ہے۔

ہندوستان آجکل بیرونی امداد اور شہ کی بنیاد پر بپا دہشت پسندی کا شکار بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے پروگرام کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ہندوستان انسانی حقوق کی حفاظت اور فروغ کا عزم مصمم کر چکا ہے۔ لہذا وہ کبھی بھی دہشت و تفرقہ گر قوتوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔

دہشت گردی کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد عالمی سطح پر قانون کی بالادستی اور بندوق کی حکمرانی کی مخالفت میں جاری تحریک کا ایک حصہ ہے۔

یہ جابرانہ طرز کے خلاف جمہوریت کی بقا کے لئے جدوجہد ہے۔ یہ منطقی دلائل کی فتح کے لئے ایک جدوجہد ہے۔ یہ مذہبی جنونیوں اور فرقہ وارانہ منافرت کے لئے ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ایک ایسے عالمی نظام کے اختراع کی جس میں انسانی تنوع اور تہذیبی رنگارنگی کو سخت، جامد اور یک رخی یکسانیت کے خلاف فروغ حاصل ہو سکے۔

ڈاکٹر امبیڈکر

پچھڑے طبقات کے مسیحا

بیسویں صدی کے عظیم سماجی مصلحین میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی بلند قامت شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ لاکھوں ہندوستانیوں کو جن کے ساتھ ذات پات اور اس کے نام پر امتیازی سلوک کیا جاتا تھا' ان کے وقار کی بحالی کے لئے امبیڈکر نے زبردست جدوجہد کی۔

ڈاکٹر امبیڈکر عظیم مفکر' مصنف اور قانون داں تھے۔ دستور ہند کی مسودہ کمیٹی کے صدر نشین کی حیثیت سے انھوں نے دستور کے معمار کا نمایاں رول انجام دیا اور ساری دُنیا میں اس دستور کو "انسانی حقوق کے لئے باب" سے تعبیر کیا گیا۔

پچھڑے طبقات کے لیڈر اور رہنما کی حیثیت سے ڈاکٹر امبیڈکر نے اہم ترین رول ادا کیا۔ انھوں نے تمام اقسام کے پچھڑے پن کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں تعلیم دی اور انھیں اتحاد کی طاقت سے روشناس کرایا۔ انھوں نے انہیں تعلیم کی ضرورت' ان میں اتحاد' طاقت' اور مشترکہ پلیٹ فارم اور ان کے حقوق کے حصول کے لئے پُر امن ایجی ٹیشن چلانے کے لئے تنظیم کی ضرورت پر زور دیا۔ تعلیم' تنظیم اور ایجی ٹیشن پچھڑے طبقات کے بنیادی حقوق کے حصول کے لئے ان کی تحریک کے کلیدی الفاظ تھے۔

ہیرو کی کہانی

وہ خود اچھوت کی طرح مہاراشٹرا کے ضلع رتناگیری میں امباواڈا گاؤں میں ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی ایک ہیرو کی کہانی ہے۔ انھوں نے بچپن سے ہی اندھے سماجی رسوم کا موثر مقابلہ کیا جو اُن میں اور دوسرے انسانوں میں امتیازی سلوک روا رکھتے تھے۔ ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے ڈاکٹر امبیڈکر نے امریکہ، لندن اور جرمنی کے تعلیم کے بیش بہا خزانوں سے اپنے علم کی پیاس بجھائی۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء سے اس وقت اپنا سرگرم عوامی کیریئر شروع کیا جب انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں اپنی قانونی پریکٹس شروع کی۔ امبیڈکر نے اپنی زندگی ہندوستان میں سماجی اصلاحات بالخصوص ذات پات اور چھوت چھات کے خاتمہ کے مقصد کے لئے وقف کردی تھی۔ ان کا منشا تھا کہ آزادی، مساوات اور بھائی چارہ کے اُصول کو علحدہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ تینوں چیزیں مل کر مثلث کی شکل اختیار کرتی ہیں اور اگر ایک کو دوسرے سے الگ کیا جائے تو اس سے جمہوریت کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔ آزادی کو مساوات سے الگ نہیں کیا جاسکتا مساوات کو آزادی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی آزادی اور مساوات کو بھائی چارہ سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ مساوات کے بغیر آزادی سے چند افراد کو اکثریت پر برتری حاصل ہوگی۔ آزادی کے بغیر مساوات سے انفرادی اقدامات فوت ہوجائیں۔ اور بغیر بھائی چارہ کے آزادی اور مساوات فطری امور نہیں ہوسکتے۔

جمہوریت کے کٹر حامی

ڈاکٹر امبیڈکر کے مطابق کسی سیاسی نظام کی کامیابی کا دارومدار سماجی ڈھانچہ پر منحصر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک جمہوری طرز کی حکومت کے لئے سماج کا جمہوری طرز کا ہونا لازمی ہے۔ ایک جمہوری سماج کے لئے غالباً یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں اتحاد ہو، مساوی مقصد ہو، عوامی مفادات کے تئیں وفاداری ہو اور ایک دوسرے کے تئیں

کا جذبہ ہو۔ لیکن اس میں دو چیزوں کا ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ پہلی چیز ذہن کا طرزِ عمل، اپنے ساتھیوں کے ساتھ عزت و احترام اور مساوات کا طرزِ عمل۔ دوسری چیز ایسی سماجی تنظیم جو سخت سماجی رکاوٹوں سے آزاد ہو۔ جمہوریت نظر انداز کرنے اور ایسی استثنائیت کی متحمل نہیں ہو سکتی جس کے نتیجہ میں فوائد حاصل کرنے والوں کے درمیان امتیاز پیدا ہو۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے وسیع تر نظریات و خیالات کا پتہ قومی زندگی میں دستوری سربراہ، پارلیمنٹیرین، مدبر، مفکر، اسکالر اور مصنف کی حیثیت سے ان کے رول پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہندو فرقہ کے شعور کو بیدار کرنے میں نمایاں رول انجام دیا اور انھیں اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی لا کر چھوت چھات کو ختم کرنے اور سماج میں انصاف، مساوات پیدا کرنے کے لئے بعض موزوں خطوط فراہم کئے۔

معاشی فروغ

۲۵ر نومبر ۱۹۴۹ء کو قوم کو دستور معنون کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا کہ یہ ایسی دستاویز ہے جو ملک کو صرف سیاسی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور جب تک معاشی برابری اور سماج کے کمزور طبقات کو اوپر اٹھانے کے لئے تمام تر کوششیں نہیں کی جائیں گی۔ ایک ایسا دن آ سکتا ہے جب ہماری امیدوں کے "دستاویز" کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اب یہ لاکھوں ہندوستانیوں پر منحصر ہے کہ ہماری امیدوں کے دستاویز کو کبھی بھی خطرہ لاحق نہ ہونے دینے کو یقینی بنائیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر سماجی ناانصافی کے خلاف غیر مختتم جنگ میں مسلسل مینارۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ آزاد ہندوستان کے بانیوں میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ قوم نے ۱۹۹۰-۹۱ء میں ان کی سو سالہ پیدائش کی تقریبات منائیں اور مارچ ۱۹۹۲ء میں حکومت نے ایک فاؤنڈیشن قائم کیا تا کہ مختلف خصوصی اسکیموں کو نافذ کیا جا سکے۔

باقی صفحہ پر

عبدالقوی دسنوی
۲- پرنسس کالونی، عیدگاہ ہلز بھوپال ۱

اردو والوں کی ذمہ داری

ہندوستان کو آزادی حاصل کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر رہا ہے اس کل سے سے ہم اردو والے باربار پڑھتے اور سنتے آئے ہیں کہ:

- اردو ہندوستان کے ہر مذہبی فرقے کی زبان ہے
- اردو ایک تہذیب ہے
- اردو قومی یک جہتی کی نشانی ہے۔
- اردو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار ہے۔
- اردو مشترک تہذیب کی یادگار ہے۔
- اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے
- اردو کی جڑیں ہندوستان کی مٹی میں پیوست ہیں
- اردو ایک زندہ زبان ہے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے میں اردو نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

اور آج بھی اکثر اخبارات اور رسائل میں مطالعہ کے دوران میں یہی جملے نگاہوں سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارے رہنمایانِ وطن بھی اپنی تقریروں میں ایسے جملوں کا استعمال

کر کے اپنی بات میں زور اور سامعین میں جوش و خروش اور مسرت کی لہر دوڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی بلند نگاہی وسعت قلبی کی داد لیتے تھکتے نہیں ہیں اور کبھی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ذمہ دار حضرات اُردو سے متعلق اس طرح کے سحر آفریں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تالیوں کی گونج میں اُردو کو کچھ دینے کا اعلان کر کے اہلِ اردو کو مرعوب بھی کرتے رہتے ہیں اور ممنون بھی بناتے رہتے ہیں۔

اس طرح کے اعلانات بھی سننے میں آتے رہے ہیں کہ اُردو کو اس کا حق فرور ملے گا اُردو اور ہندی دو بہنیں ہیں۔ اُردو کی زندگی سے ہندی کو طاقت ملے گی، اُردو کو بعض صوبوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا، اُردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنے کے مواقع پیدا کیے جائیں گے۔ اسکولوں میں اردو اساتذہ مقرر کیے جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ پچھلے سال یہ اعلان بھی ہوا کہ اُردو یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آرہا ہے لیکن کب ؟ یہ راز میں ہے۔ کس صوبے میں اس کی بنیاد ڈالی جائے گی یہ بھی ایک پہیلی بنی رہی، کسی جگہ یونیورسٹی کھولنے کے کیا شرائط ہوں گے یہ بھی کسی کو نہیں معلوم۔ کچھ دنوں تک بڑی گرما گرمی رہی، قیاس آرائیاں رہیں۔ خوش فہمیاں پھیلیں جو حضرات گرما گرمی سے ہاتھ تاپنا چاہتے تھے تاپتے رہے اور اپنی سربلندی اور اُردو کی بے بسی پر مسکراتے رہے۔ کچھ اس خیالی یونیورسٹی میں اپنی جگہ تلاش کرنے لگے، کچھ وعدے وعید ہوئے اور اس ہنگامے میں بے چاری اردو کمزور آواز میں کہتی رہی

سب مرے چاہنے والے ہیں میرا کوئی نہیں

ہماری مرکزی حکومت کا ایک اہم کام ترقی اردو بورڈ کی صورت میں سامنے آیا ہے جس کے قیام کے محسوس ہو رہا تھا کہ نہ جانے اُردو کے لیے کیا کیا ہونے جا رہا ہے۔ کچھ اچھے اور مفید کاموں کی ابتدا بھی ہوئی پھر کسی کی نظر کھا گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ادارہ اتنا مفید نہ بن سکا جتنا اسے بننا چاہیے تھا۔ ایسا کیوں ہوا جواب کون دے سکتا ہے؟

بعض صوبائی حکومتیں [illegible]

جن کے ذریعہ بلاشبہ اردو کے لیے کچھ کام ہوئے بہت سے ایسے مصنفین کی بھی کتابیں ان اکاد
نے شائع کیں جو کبھی نہیں چھپ سکتی تھیں۔ بہت سی بے مقصد کتابیں بھی چھپیں تو کچھ مفید کتابیں بھی
آئیں سیمینار اور مشاعرے ہوئے، کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی تعاون بھی دیے گئے۔ انعامات
تقسیم کئے گئے۔ رسائل بھی جاری ہوئے۔ خبر ناموں کی اشاعت کا بھی انتظام کیا گیا۔ بہت سے کتنے
میں اکادمیوں کی وجہ سے جان سی پڑ گئی۔ لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان اکادمیوں سے اردو
بہت زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لیے کہ یہ اکادمیاں بھی اپنے آپ کو نظر بد سے نہیں بچا سکیں۔

بلاشبہ ہماری حکومت نے اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے بلکہ حق تلفیاں ہی کرتی ہے۔
اردو کو ہندی کی سگی بہن کہا ضرور جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ سوتیلی بہن کا سلوک کیا جاتا ہے۔
اردو سے متعلق جو کچھ بیانات مختلف وقتوں میں ہمارے رہنماؤں اور وزیروں کی زبانوں سے
ہوتے رہے ہیں۔ اور اخبارات اور رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں وہ محض بچوں کو چمکار
الفاظ کے سوا اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتے ہیں۔

لیکن کیا وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اس طرح صرف حکومت کی اردو
ساتھ ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا بار بار اظہار کر کے اور ہائے وائے کا شور مچا کر اردو
متعلق اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔؟

میرا اپنا خیال ہے کہ حکومت کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہنے کے ساتھ،
ہم اہل اردو کو اپنی مادری زبان کی بقا اور ترقی کے لیے کیا کیا کرنا چاہیئے اس پر نہ صرف
سوچتے رہنا چاہیئے بلکہ انہیں عملی جامہ پہناتے رہنا چاہیئے۔ ہم جب تک اپنی کوتاہیوں، خو
اور بے راہ رویوں کا جائزہ نہیں لیں گے۔ اور ان سے بچنے کی کوشش نہیں کریں گے
حکومت چاہے بھی تو اردو کو بچا نہیں سکتی۔

مجھے اپنی تیس (۳۰) پینتیس (۳۵) سال، پچھلی زندگی کے تجربات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
کی اردو کے سلسلے میں سرد مہریوں نے ہمیں بھی بے مہر بنا دیا ہے۔ ہم عملی زندگی میں اردو۔

رشتہ مضبوط کرنے کے بجائے اس سے بے تعلق اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم ایمانداری کے ساتھ اپنے گھروں کا جائزہ لیں تو صاف محسوس ہوگا کہ اہلِ اردو اپنے گھروں میں اردو کو اس کے حق سے محروم کرتے جا رہے ہیں جسکا ہی یہ نتیجہ ہے کہ اردو اپنے گھروں سے رسوائی کے ساتھ بے گھر ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لیے آج عام طور سے اہلِ اردو کے گھروں میں نہیں ہے، تو اردو نہیں ہے اردو گھروں میں۔

۱) نام کی تختیاں اردو میں نہیں ملیں گی۔
۲) اردو اخبارات اور رسائل نہیں ملیں گے
۳) اردو کتابیں نہیں ملیں گی۔
۴) اردو میں خط لکھنے کا سلسلہ کم ہوتا جا رہا ہے
۵) شادی یا دوسری تقاریب کے دعوت نامے اردو میں نہیں چھپتے۔

دوسری زبانوں کے الفاظ اور جملے اب زیادہ گونجتے سنائی دیتے ہیں۔

یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں۔

۱) اردو اساتذہ عام طور سے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔
۲) اردو طلبہ میں لکھنے پڑھنے اور اردو کے لیے کچھ کرنے کا ذوق کم ہو رہا ہے
۳) اردو طلبہ کی تعداد کم ہو رہی ہے۔
۴) اساتذہ میں لکھنے پڑھنے اور اردو کے لیے کچھ کرنے کا شوق کم ہو رہا ہے
۵) اساتذہ عام طور سے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف رہتے ہیں۔
۶) محاذ آرائی کے نتیجے میں طلبہ نقصان اٹھاتے ہیں۔
۷) اساتذہ ایک دوسرے کے طلبہ کو بھی نقصان پہنچانے سے نہیں چوکتے
۸) اساتذہ سستی شہرت کے پیچھے دوڑتے نظر آتے ہیں۔

۹) بے صلاحیت اساتذہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کے نگران بن کر قیامت ڈھارہے ہیں اور تحقیق کے معیار کو پست کرتے چلے جارہے ہیں جس میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی شریک رہتے ہیں۔

۱۰) یہی پست معیار کے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے حضرات اساتذہ بن کر جب تعلیم گاہوں میں داخل ہوتے ہیں تو اردو کو طرح طرح سے نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔

عام طور سے اردو جاننے والے دکان دار دکانوں کے بورڈ اردو میں نہیں رکھتے، رسیدیں اردو میں نہیں چھپواتے اور اردو اخبارات نہیں منگاتے۔

اردو اخبارات کی طباعت، عام طور سے ناقص ہوتی ہے۔ خبریں بھی پوری نہیں ہوتی ہیں، صحافت کا معیار بھی بلند نہیں ہوتا، بہتر بنانے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی، ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ اخبارات کسی نہ کسی کے خلاف مسلسل لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر چاہتا ہے لکھ دیتے ہیں۔ کیچڑ اچھالتے ہیں، شخصیت کشی کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

ہمارے اکثر رسائل کے مدیر خطوط کے جواب نہیں دیتے، مضمون ملنے کی رسید نہ بھیجے۔ اشکریہ ادا کرنا تو بڑی بات ہے اور اب جب سے بعض رسائل قلم کاروں کو معاوضہ دینے لگے ہیں ان کے انداز اور بدل نہیں بگڑ گئے ہیں۔

خریداروں کو رسائل نہیں ملنے پر اطلاع دی جاتی ہے تو نہ خط کا جواب ملتا ہے نہ رسالہ۔ اب آپ بار بار خط لکھتے رہیں اور شکایت کرتے رہیں۔ مدیر حضرات کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہاں وہ بار بار یہ شکایت ضرور کرتے ملیں گے کہ خریدار کم ہوتے جارہے ہیں قاری کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اردو کے نثر نگاروں اور شاعروں کا حال بھی روز بروز غیر تشفی بخش ہوتا جارہا ہے ان میں ایک ایسا گروپ پیدا ہو گیا ہے جس کا کام لکھنا پڑھنا اور صحت مند ادب

پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ گروہ بندی کو فروغ دینا اور اُردو کے سلسلے میں سارے مفادات کو اپنے دامن میں سمیٹنا ہے۔ یہ حضرات

۱۔ مشاعروں میں جاتے ہیں تو پرانا کلام سنا کر داد لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔ سیمیناروں میں شرکت کرتے ہیں تو مقالہ نہیں لے جاتے پرچیاں ساتھ رکھتے ہیں، مقالہ پڑھتے نہیں، قصے سناتے ہیں اور تعریف و تحسین کے منتظر رہتے ہیں۔

۳۔ انعامات حاصل کرنے کے لیے ہنگامے کرتے ہیں، دوڑ دھوپ کرتے ہیں، سازشیں بنتے ہیں اور جانے کیا کیا رکیک حرکتیں کرتے ہیں۔

۴۔ عہدوں کو حاصل کرنے کے لیے بھی گر دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔

۵۔ نہ خود کچھ کرتے ہیں نہ دوسروں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔

۶۔ عہدوں اور کرسیوں کو چھوڑتے نہیں۔

عام طور سے اہلِ اردو کے سوچنے، سمجھنے کا انداز اس قدر افسوس ناک ہو تا جا رہا ہے کہ سوچ کر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ ماہنامہ "آجکل" کے مدیر جناب محبوب الرحمٰن فاروقی اپنے اداریہ ستمبر ۱۹۹۴ء میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے:

"۔۔۔آج صورتِ حال یہ ہے کہ زیادہ تر جگہوں پر اردو کے خادموں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اب خادم کا نام سن کر ہی ہنسی آنے لگتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو اُردو کا خادم گنواتے ہیں وہ اپنی ذاتی خدمت کر رہے ہیں، یا اردو زبان کی۔ اس دفتر میں بھی ایسے خادموں کے خطوط اکثر موصول ہوتے ہیں جن کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی ساری عمر اردو کی خدمت میں گنوا دی اور آپ کی یہ ہمت کہ آپ میری تخلیق کی اشاعت نہ کریں۔ کچھ لوگ اپنی خدمت کی دھونس دیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں۔ ۵۰ سال سے زبان و ادب کی درس و تدریس میں لگا ہوا

الملا۔ میں نے اپنی ساری عمر تنقید و تحقیق میں گزاری اور آپ کا دفتر مجھے اعزازی کاپی بھی نہیں بھیجتا۔ کچھ ایسے بھی خادم ہیں جو مجھ سے براہ راست فرماتے ہیں کہ میں اتنی بڑی یونیورسٹی کا صدر شعبہ ہوں کم از کم آپ کو تو مجھے اعزازی کاپی بھیجنی چاہیئے۔ اس طرح کی مانگ کرنے والوں میں اکثریت ان حضرات کی ہے جو اردو کی بدولت ایسے عہدوں پر فائز ہیں ۔۔۔"

اب ذرا " زبان و ادب " جلد ۲۰ نمبر ۳ کے اداریہ " روبرو " کا یہ حصہ بھی پڑھیں ۔ اس کے مدیر جناب مشتاق احمد نوری لکھتے ہیں:

" مختلف اداروں کی جو قراردادیں اور تجاویز گاہے گاہے اخبارات میں نظر آتی ہیں ان میں اردو کے مسائل سے زیادہ خود ان اداروں اور انجمنوں کے مسائل ہوتے ہیں اکثر و بیشتر تجویزوں کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ فلاں ادارے کا گرانٹ بڑھا دیا جائے۔ اس ادارے کے فلاں عہدے دار کی جگہ پر فلاں کا تقرر کیا جائے اس کمیٹی میں ان افراد کو شامل کیا جائے اور ان کو ہٹا دیا جائے بالعموم تجویزوں اور فیصلوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مسائل نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔ یہ بات کتنی تشویشناک ہے کہ اردو خواندگی کا تناسب روز بروز گھٹتا جا رہا ہے۔ اردو میڈیم روز گھٹتا جا رہا ہے۔ اُردو میڈیم سے چلنے والے اسکولوں کی معنویت ختم ہوتی جا رہی ہے اگر کسی اسکول میں زبان کے علاوہ دوسرے علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو طلبہ کے لیے وہ ان معنوں میں بیکار ہو جاتی ہے کہ اب سکنڈری بورڈ کے امتحانات میں اردو میں سوالات نہیں آتے۔"

آگے لکھتے ہیں :

"..... اگر سروے کیا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ مسلمانوں کا ELITE طبقہ شعوری اور لاشعوری طور پر اُردو سے نابلد ہوتا جارہا ہے۔ اس کے لیے اس طبقہ میں نہ تو شرمندگی کا احساس ہے اور نہ ہی اسے وہ اپنے لیے نقصان وہ تصور کرتا ہے۔"

"..... اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اس زبان کی جڑیں زمین کے اندر اتاری جائیں۔ گھر گھر میں اس کا چلن عام کیا جائے اور اس کے اصل مسائل سامنے لائے جائیں تاکہ اس کے حل کے لیے سرکار سے مطالبہ کیا جائے۔"

"شاعر" کے مدیر افتخار امام صالیہ شمارہ ۵ جلد ۶۵ میں یہ تحریر کرتے ہیں۔

"مطالعہ اب ہمارا مزاج نہیں رہا۔ اس لیے شاعری کے ساغر تو بڑھ گئے لیکن قاری کم سے کم ہوتے چلے گئے مگر جو قاری بچ رہے ہیں وہ اتنے باشعور ہو گئے ہیں کہ معیاری اور غیر معیاری ادب کو اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی غیر معمولی فن پارہ مل ہی نہیں رہا ہے۔ بلکہ یہ لوگ نقادوں سے کچھ زیادہ ہی الرجک ہو رہے ہیں... "

"جس زبان کا مستقبل مشکوک ہو اس کے قلم کار سچ بولنا چھوڑ دیں اپنے منہ میاں مٹھو بن جائیں (جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے) معیاری ادبی رسائل کا فقدان ہو جائے اور تخلیق کار مدیر بنتے چلے جائیں۔ دانش وروں کا مقام بہلاکو حاصل ہو جائے' اپنے جہل کو علم سمجھ لینے کا نعیہ عام ہو جائے۔ اپنی ادبی روایات کا احساس نہ رہے اور کسی نئی روایت کا شعور بھی ختم ہو جائے ایسی زبان اور اس کے قلم کاروں کے بارے میں فتوے دینا یا فیصلہ کرنا بہت آسان ہے۔"

جب ایسے نازک حالات میں خود اُردو والوں کا ایک بڑا طبقہ اردو کے سلسلے میں بے راہ روی اختیار کیے ہوئے ہے اور مفاد پرستی میں مبتلا ہے۔

اردو کی ترقی اور توسیع کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟

یہ اُردو والے ہیں جو تعلیم گاہوں میں استاد، ڈاکٹر اور پروفیسر بن کر اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

یہ اردو والے ہی ہیں جو کسی طرح اردو اکادمیوں میں ملازمت حاصل کرتے ہیں اور جس سے روزی حاصل کرتے ہیں اسے عضو معطل بنا دیتے ہیں۔

یہ اردو والے ہی ہیں جو بہت ساری انجمنوں کے معزز عہدوں پر پہنچ کر یا رکنیت حاصل کر کے اسے محض اپنی شہرت کا وسیلہ بناتے رہتے ہیں۔ یہ اردو کے لوگ ہی ہیں جو کبھی ایم۔ ایل۔ اے، کبھی ایم۔ پی اور کبھی وزیر کی محترم کرسیوں پر بیٹھ کر اُردو کے لیے مچھے دار باتیں تو کرتے ہیں لیکن اپنے دلوں میں اُردو کو جگہ نہیں دیتے۔ اسی سبب اردو ان کے گھروں میں پائی نہیں جاتی۔

سچی بات تو یہی ہے کہ غیروں کی سازشوں کے ساتھ ساتھ اُردو، اردو والوں کی بے عملی، خود غرضی، بے حسی اور ان کے مقاصد کی پستی کی وجہ سے سمٹتی، سکڑتی اور بے آواز بنتی جا رہی ہے اب تو خطرے کی گھنٹیاں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی ہے جیسے خطرے کی گھنٹی اہلِ اُردو سے کہہ رہی ہو۔ وہ دیکھ، زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔

سلسلہ ص ۵۱

ان اسکیموں میں اداروں، کتابوں کی طباعت، تعلیمی روابط کا فروغ، تحقیق کو فروغ دینا، ایوارڈز کی تشکیل اور اسی طرح کے دوسرے اُمور شامل ہیں۔

فاؤنڈیشن ڈاکٹر امبیڈکر چیئرس کے قیام کے لئے آٹھ یونیورسٹیوں کو فنڈ فراہم کر رہی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ناگارجنا یونیورسٹی اور آنکل یونیورسٹی پہلے ہی چیئرس قائم کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر ایوارڈ کے لئے ناموں پر غور کیا جا رہا ہے اور پہلے ایوارڈ کا جلد ہی اعلان کیا جائے گا۔

ڈاکٹر امبیڈکر پر حکومت ہند، حکومت مہاراشٹرا کے تعاون سے ایک

مکمل فیچر فلم [illegible]

نظم

سلطانہ مشرف الدین

"آخری تکلم"

جلاؤ شمع کہ ہر سمت گھپ اندھیرا ہے
بڑھاؤ لو کہ بہت وحشتوں نے گھیرا ہے
اندھیرا ایسا نگل جائے روشنی کا بدن
ہزار حسرتیں، مفقود آرزو کی کرن
فضائیں سرد، اجالے اداسیوں میں دفن
کھنڈر سی بستیاں خاموشی جیسے انکا کفن
مہیب چیخ اچانک فضا کو چیر گئی
یہ آخری تھا تکلم سمجھ نہ پایا کوئی
حیات ختم ہوئی موت سرخرو ہی رہی

دہل گیا تھا جہاں کائنات لرزاں تھی
ہزاروں سوئیاں بس جسم و جاں میں پنہاں تھیں
لہو رگوں میں مری منجمد سا ہونے لگا
میں ایک جامد و ساکت عظیم پتھر تھی

پہاڑیوں کی سیاہی میں گم تھیں سب راہیں
گذر چکے تھے قدم سنگلاخ رستوں سے
اکیلا کوئی پرندہ بھی پھڑ پھڑا اٹھا
بہت ہی دور کوئی رو رہا تھا وادی میں
ہوائیں ٹکریں کھاتی رہیں چٹانوں سے

شکست زیست نے کھائی کس اہتمام کے ساتھ
رلا حیات کو بس ایک دردناک انجام

افضل تسلیم
بانو نگر۔ حیدرآباد

غزلیں

ضربِ مضرابِ انا میں سلسلہ تھا ہی نہیں ٭ سازِ ہستی ورنہ اپنا بے صدا تھا ہی نہیں
اہلِ فن تھا، چپ سا تھا وہ بینوا تھا ہی نہیں ٭ سچ اگر پوچھو تو اُس کا حاشیہ تھا ہی نہیں
جس قدر اُس کی برائی کی گئی ہے جابجا ٭ اصل میں وہ آدمی اتنا بُرا تھا ہی نہیں
سچ کے کڑوے گھونٹ پی لینا مجھے اچھا لگا ٭ ہر قدم جھوٹی تسلیّ میں مزہ تھا ہی نہیں
میں تو میں ہوں ملنے نہ اُن سے بھی ہوا و آج تک ٭ دو قدم کا فاصلہ تو مرحلہ تھا ہی نہیں

کیوں نہ جانے اُس کے بھی ہاتھ اُٹھ گئے تسلیمؔ کو
جو کبھی وانستہ میرا ہمنوا تھا ہی نہیں

O

فکر زخمی ہے نگاہوں کی زباں زخمی ہے
درد کے شہر میں ہر لمحۂ جاں زخمی ہے

کیسے حالات کے صحرا سے نکل پاؤں گے
آنکھ دھندلی ہے تو ہر ایک سماں زخمی ہے

مصلحت ہاتھ ترے بڑھ گئے اب تو اتنے
فہم و ادراک کا ہر ایک نشاں زخمی ہے

حرص کی آگ میں جلتی ہے تمنا تسلیمؔ
دشتِ احساس میں جذبوں کا بیاں زخمی ہے

ڈسمبر ۱۹۹۴ء

...کی شاداب
...گوڑہ - حیدرآباد

غزلیں

ے رشتوں کا کیف و کم دیکھو ... ہو ... پھر ہوا آفریں ہے عدم دیکھو
لف کا دراز رستہ ہے ... ہو ... زندگی ہے تو پیچ و خم دیکھو
فوں کی شام تھی یہ حیات ... ہو ... صبح ہوتی ہے چشم نم دیکھو
عنے لگا حکایت دل ... ہو ... دفعتاً رک گیا قلم دیکھو
شاداب باوفا کہہ کر ... ہو ... کیسا کرم کر گئے ستم دیکھو

○

رئیں بیمار تو کرتے ہی رہے
پھر بھی کچھ آپ سے شرمندہ ہیں اربابِ جنوں

ے فضاؤں میں رہے اہل خرد
ہو زمانہ کوئی تابندہ ہیں اربابِ جنوں

بھی رہے خود کو لٹاتے بھی رہے
دولت عشق کے دارندہ ہیں اربابِ جنوں

ان فسادات سے برباد نہ ہوگا گلشن
دیکھو شاداب ابھی زندہ ہیں اربابِ جنوں

○

ڈسمبر ۹۴ء

۶۴

غزلیں

اسلم ڈبائیوی
C/o آپکا ہینڈلوم ایمپوریم
ڈبائی، بلند شہر (یوپی)

ہر خوشی کو ٹھکرا کر حادثوں سے کھیلی ہے وہ حسین لڑکی جو آج تک اکیلی ہے
جسمیں انکے جلوے ہیں جسمیں انکی یادیں ہیں دل کو کیا کہا جائے دل عجب حویلی ہے
اس گلی کے منظر کو ہم سے دوستو پوچھو ہر قدم گلِ تر ہے ہر قدم چمیلی ہے
حسن و عشق کی باتیں آج تک نہیں سلجھیں وہ بھی اک معمہ ہے یہ بھی اک پہیلی ہے
اس حسین لڑکی پر عصمتِ جہاں قرباں شہر بوالہوس میں جو آج تک نویلی ہے
کس طرح بچائیں ہم خود کو شامِ ہجراں سے ہم سیاہ بختوں کی اک یہی سہیلی ہے
دوستوں بلندی پر آج ہے وہی اسلم
ہر مصیبتِ عالم جس نے ہنس کے جھیلی ہے

[۲]

یہ کیا غضب ہے یہ کیا ہے تمہاری بستی میں وفا نہیں ہے سُنا ہے تمہاری بستی میں
یہاں امیر غریبوں کا خون پیتے ہیں الگ الگ یہ سُنا ہے تمہاری بستی میں
دھواں دھواں ہیں سبھی یہ مکاں کیوں دیکھو یہ کیسا شور اٹھا ہے تمہاری بستی میں
وہاں غریب سے شاید خدا بھی دور رہے بڑے بڑوں کا خدا ہے تمہاری بستی میں
فلک کے چاند ستارے بھی رو دیے جس پر وہ مرد قتل ہوا ہے تمہاری بستی میں
زمیں پر بھی ہے موجود جنت الفردوس یہ راز آ کے کھلا ہے تمہاری بستی میں
سروں سے جائیگا اسلم نہ عشق کا سودا
وہ رنگ ہم نے بھرا ہے تمہاری بستی میں

☆

Telephone : 229161
› 37/979/84 Postal Regd. No. H/HD593
ONTHLY SHADAAB HYD.
11-5-147, RED HILLS, HYD-A P.
1 No. 12 DECEMBER 1994

شاداب بک کلب

۱۱-۵-۱۴۷، ریڈ ہلز-حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴(اے پی)

- اُردو کتب ورسائل خرید کر پڑھنے اور ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس مد پر خرچ کرنے کی عادت ڈالنے کیلئے "شاداب بک کلب" قائم کیا گیا ہے۔
- شاداب بک کلب کی رکنیت فیس -/25 روپے ہے۔
- ہر رکن کو سالانہ -/500 روپے کی کتب ورسائل خریدنے ہونگے۔ یہ رقم وہ پیشگی جمع کروائیں گے یا ہر ماہ -/50 روپے پیشگی ادا کریں گے۔
- مکتبہ شاداب کی مطبوعہ کتب پر (25) فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جائے۔ دیگر کتب پر ۱۰ فیصد ڈسکاونٹ دیا جائے گا۔
- کتب کی فہرست مکتبہ پر موجود رہیگی اور منتخب کتب کی فہرست "شاداب" میں چھپتی رہے گی۔
- ہر رکن کو اپنی پسند سے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔
- مکتبہ شاداب میں غیر موجود کتب کی خواہش پر انھیں حاصل کرکے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- اگر کوئی رکن سال کے ابتدائی دس ماہ تک -/500 روپے کی کتب فراہم کرنے کی خواہش نہ کریں تو ادارہ اپنی پسند کی کتب روانہ کرے گا